

وہ عشق جو

ہم سے روٹھ گیا

نازیہ کنول نازی

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام



# وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا

نازیہ کنول نازی

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈائونلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: زندگی، بسمہ، حسیب یا مینجمنٹ وقار سے رابطہ کریں، شکریہ

# وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا

اب یاد دلائیں کیا تم کو  
یہ سال بھی آخر بیت گیا  
اور اپنا کبھی کچھ دوش نہیں  
یہ بازی بھی جگ جیت گیا؟  
وہ سرد ہوائیں اب بھی ہیں  
رنگین فضا میں اب بھی ہیں  
وہ بھیکے بھیکے پانی کی پرشور صدا میں اب بھی ہیں  
میں اب بھی وہاں جاتا ہوں اور دل اپنا سلگاتا ہوں

اب تم جو نہیں ہو ساتھ میرے

ہوتے ہیں خالی ہاتھ میرے

پر شور صدائیں پوچھتی ہیں، وہ سرد ہوائیں پوچھتی ہیں

کہاں وہ تیرا میت گیا

کیا پھر یہ زمانہ جیت گیا

بلیک گرم شال اچھی طرح اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹے وہ لاؤنج میں ”یا اللہ“

یار حمز، یار حمیم کی تسبیح کر رہی تھی جب حویلی کے مہیب سناٹے کو چیرتی

ریاض لالہ کی گرج دار آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”خبردار جو کل سے کسی نے اسے شہر جانے دیا۔ میں ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی

اور اسے گھر سے باہر نکالنے والوں کی بھی۔“

غصہ ریاض لالہ کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔

شافیہ نے آہستہ سے سر جھکا کر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس کے سر میں یکلخت

شدید درد کی لہریں ہلکورے لینے لگی تھیں۔ تب ہی اس نے یمنی کی آواز سنی

تھی جو ریاض لالہ کی اکلوتی چہیتی بیٹی تھی۔

”میں جاؤں گی کالج۔ کوئی اسٹوڈ اگر مجھے پریشان کرتا ہے تو اس کے لیے میں

اپنے کیرئیر کو تباہ نہیں کر سکتی۔“

”شٹ اپ...“

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ریاض لالہ کے بڑے بیٹے سبحان کا

ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور یمنی کے گالوں پر اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔

”تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ ہمارے گھر کی عورتیں مردوں سے اونچی آواز

میں بات نہیں کرتیں۔ پاپا نے جو کہہ دیا، سو کہہ دیا۔ مزید بحث کی گنجائش

نہیں ہے اب...“

”کیوں نہیں ہے بحث کی گنجائش۔ میں کوئی بے زبان جانور ہوں جو آپ لوگ

میری قسمت کا فیصلہ سنا دیں اور میں چپ چاپ خود اپنا ہی تماشہ دیکھتی رہوں

جس کا قصور ہے اسے سزا دیں۔ میں کسی طور اپنی تعلیم سے دستبردار نہیں ہو

سکتی۔“

اس کی رگوں میں بھی شاہوں کا خون تھا۔

ریاض لالہ کا غصہ آسمان کو چھو گیا۔

”فضول بک بک بند کرو یمنی! اور جاؤ اپنے کمرے میں۔“

اس کے لہجے کی خود سری انہیں کسی طور نہیں بھائی تھی۔ وہ ابھی کچھ کہتی مگر بھابی جان کی آنکھوں میں التجا دیکھ کر غصے سے سر جھٹکتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے کمرے میں جانے کے بعد ریاض لالہ نے بھابی جان سے کہا تھا۔

”اس کے لیے فوراً کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کرو شگفتہ۔ اسی مہینے فرض ادا ہو جائے تو بہتر ہے۔“

”جی...“

بھابی جان سر جھکا کر محض یہی کہہ سکی تھیں۔

اندر لاؤنج میں بیٹھی شافیہ کی آنکھوں سے ایک گرم آنسو پھیل کر گالوں سے لڑھکتا ہوا گریبان میں جذب ہو گیا۔

اس کا دل جیسے رک رک کر چل رہا تھا۔

”یا اللہ! یا رحمن! یا رحیم۔“

سنائے کو چیرتی اس کی کمزور آواز مزید بلند ہو گئی۔

اگلے ہی پل وہ لاؤنج سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں یمنی اس کے بیڈ پر بیٹھی گود میں تکیہ چھپائے رو رہی تھی۔  
”یمنی!“

دروازہ بند کر کے وہ جیسے ہی اس کے قریب آئی یمنی لپٹ کر رو پڑی۔

”شافیہ! میں اس حویلی کو آگ لگا دوں گی۔ اس پورے گاؤں کو تباہ کر ڈالوں گی میں۔ یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں۔ عورت کوئی بے جان کھلونا ہے ان کے ہاتھوں میں جس کے ساتھ یہ جب جیسا چاہیں سلوک کریں اور کوئی انہیں کچھ کہنے والا نہ ہو۔ جہنم میں جائیں ان کے گھٹیا اصول۔ لگے آگ ان کی اونچی شان کو۔ اگر عورت کی تمناؤں اور خوابوں کا خون کر کے برادری میں یہ اپنی ناک اونچی کرتے ہیں تو میں ٹھوکر مارتی ہوں ان کی جھوٹی شان و شوکت کو۔ میں خود کو ان کے جاہلانہ فیصلوں کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گی شافیہ۔ میں اپنے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہونے دوں گی۔“

وہ اس کے سینے سے لگی بلک رہی تھی۔

ثافیہ سکون سے اسے تسلی دیتی۔ بہت ملائمت سے اس کے سلکی بال سہلاتے ہوئے چپ بیٹھی رہی۔

☆...☆...☆

بارش خاصی تیز ہو رہی تھی۔

گرین ہاؤس میں اس وقت عجیب افراتفری کا سماں تھا۔ بجو، آپاجان، چھوٹی آپا سب اماں جی کے کمرے میں موجود تھیں جب کہ اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر بے قراری سے ٹہلتے اباجی کا اضطراب اپنے عروج پر تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔

وہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ چکے تھے۔ بڑا بیٹا اور بیٹی نہ صرف شادی شدہ تھے بلکہ بال بچوں والے بھی تھے۔ باقی چار بچے بھی خاصے بڑے ہو چکے تھے اور اب... پورے پندرہ سال کے بعد قدرت پھر انہیں اولاد کی نعمت سے نواز رہی تھی۔ ایک عجیب سی شرم کے حصار میں گھرے وہ اپنے کمرے سے قدم باہر نہیں نکال رہے تھے جب اچانک ہی

دایہ نے مسرت بھرے لہجے میں خوشخبری سنائی۔

”مبارک ہو بڑے میاں۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔ کیا گول مٹول پیاری سی بچی سے نوازا ہے آپ کو۔ ماشاء اللہ زچہ و بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔“

انہیں خوشی ہوئی تھی مگر شرمساری کے عجیب سے احساس میں گھرے وہ اب بھی خاموش ہی رہے تھے۔ گرین ہاؤس میں ان کے علاوہ چھ افراد تھے جن میں اماں جی، غزالہ لالہ، اعجاز لالہ، رضیہ بجو، ریاض لالہ، بھابی اور منزہ بجو شامل تھیں۔ ریاض لالہ کے دو بیٹے اس کے علاوہ تھے۔

پچھلے دو سال سے اماں جی کی طبیعت ناساز چلی آ رہی تھی۔ ان کے سر میں ہمہ وقت درد رہتا تھا۔ ایسے میں روشنی کی پیدائش ان کے لیے کسی بھاری ذمہ داری سے کسی طور کم نہیں تھی۔

یہ درست تھا کہ روشنی نے جب اس گھر میں آنکھ کھولی تھی تو سب ہی ایک دوسرے سے نگاہیں چراتے تھے مگر بہت جلد اس نے گھر کے تمام افراد



کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی جو دیکھنے والے کو اپنی جانب کھینچتی تھی۔

چہرے کے ساتھ اس کی گول جسامت بے حد بھلی لگتی تھی۔ یوں جلدی وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔ اماں جی اور اباجی کے ساتھ ساتھ فراز لالہ کی اس سے محبت مثالی تھی۔ گھر میں آنے کے بعد وہ اس سے ایک منٹ غافل رہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کی تمام چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنے کی ڈیوٹی بھی ان کی تھی۔ وہ انجیج تھے اور ان کے ساتھ ہی رضیہ بجو کی نسبت بھی خاندان میں ہی طے تھی۔

روشنی نے جب ہوش سنبھالا اسے اپنے ہر طرف خوشیوں کی بہاریں خوش آمدید کہتی محسوس ہوئیں تاہم ابھی وہ صرف چار سال کی تھی کہ ایک شب اچانک اماں جی کی وفات ہو گئی۔ اسے اماں جی کے سینے سے لگ کر الٹا سونے کی عادت تھی مگر اماں جی کی اچانک جدائی نے اس کے ننھے سے اعصاب پر خاصا گہرا اثر ڈالا اور وہ گم صم ہو کر رہ گئی۔

اماں جی کی وفات کے بعد اباجی اور فراز لالہ جنہیں وہ اپنی توتلی زبان میں بڑے پیار سے ”بڑے لالہ“ کہہ کر پکارتی تھی، نے سب سے زیادہ اس کے دکھ اور احساسِ محرومی کو سمجھتے ہوئے اس پر اور زیادہ توجہ اور پیار پنچھاور کر دیا۔ وہ اب اباجی کے پاس ان کے سینے سے لگ کر اٹنی سوتی تھی۔

ریاض لالہ ان دنوں کاروبار میں اباجی کا ہاتھ بٹاتے تھے جب کہ فراز اور اعجاز لالہ اکٹھے اسکول پڑھنے جایا کرتے تھے۔ وہ فراز لالہ کی جتنی چہیتی تھی، اعجاز لالہ کے ساتھ اتنے ہی اس کے جھگڑے چلتے رہتے تھے۔ اباجی کے بچوں میں وہ چوتھے نمبر پر تھے۔

سب سے بڑی آپاجان پھر ریاض لالہ ان کے بعد فراز لالہ پھر اعجاز لالہ ان سے دو سال چھوٹی رضیہ بجو اور منزہ بجو کے بعد اس کا نمبر آتا تھا۔

جن دنوں اس نے نیا نیا اسکول جوائن کیا تھا ان دنوں گویا زندگی کی ہر شے اس کے لیے خوب صورت تھی۔ اسے اپنی کتابوں، قلم، بیگ، یونی فارم جیسے ہر چیز سے عشق تھا۔ ابتدا میں کئی لڑکیاں اس کے ساتھ بیٹھتی تھیں جن سے اسے

دوستی کا دعویٰ بھی تھا مگر چھٹی جماعت میں آ کر نمیرہ سے اس کی دوستی پکی ہو گئی۔

سیدھے سادے مزاج کی حامل قدرے شوخ و چنچل سی نمیرہ نے بہت جلد اس کے دل میں اپنا خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ دونوں میں بہت لگاؤ تھا۔ روشنی کے چہرے کے خوب صورت نقوش اور بوائے کٹ بالوں کا اسٹائل اسے بہت پسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی دسویں سالگرہ پر اس نے پوری کلاس اور تمام بچرز کے ساتھ ساتھ اسے خصوصی طور پر انوائٹ کیا تھا۔

اپنا برتھ ڈے کیک کاٹنے کے بعد وہ اس کا ہاتھ تھام کر خوشی خوشی اسے اپنے گھر کے تمام افراد سے ملا رہی تھی۔

”مما! یہ روشنی ہے۔ میری بہت پیاری“ سب سے پیاری بیسٹ فرینڈ۔“ اس کے لہجے میں فخر تھا۔ نمیرہ کی ممانے اسے بہت پیار کر ڈالا۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔ بیٹا کہاں رہتی ہو...؟“

”جی حسین آگاہی میں۔“ نمیرہ کی ماما کے پہلے سوال کا جواب اس نے خاصے اعتماد کے ساتھ دیا تھا۔

”اچھا‘ پاپا کیا کرتے ہیں آپ کے؟“ دوسرا سوال ہوا اور اس بار وہ پزل ہوئے بغیر بولی تھی۔

”ہماری اپنی زمین ہے۔ ان ہی کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔“  
”اور ماما...“

”مما نہیں ہیں۔ میں چھوٹی سی تھی تب ہی ان کی ڈیٹھ ہو گئی تھی۔“

اس بار اس کا سر جھک گیا تھا۔ نمیرہ کی ممانے اسے پھر پیار کرتے ہوئے اپنے گلے سے لگا لیا۔ بعد میں ادھر ادھر کے چند اور سوالوں کے بعد وہ دیگر مہمانوں میں مصروف ہو گئیں تو نمیرہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اسے بڑے لالہ کے کمرے میں لے آئی۔

”زیب لالہ! یہ میری دوست ہے روشنی۔ میری سب سے بیسٹ فرینڈ۔“

جہاں زیب بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے جب اپنی لاڈلی بہن کی پکار پر کتاب سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا... جس کے پہلو میں شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی بڑی پیاری بچی

کھڑی تھی۔ ان کے لب ان دونوں کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرائے تھے۔

”ہاؤ سویٹ۔ بہت پیاری دوست ہے تمہاری۔ کیا نام ہے؟“

”ابھی تو بتایا تھا روشنی۔“

نمیرہ کے معصوم سے انداز پر وہ پھر مسکرائے تھے۔

”ماشاء اللہ نام بھی بہت پیارا ہے۔ کھانا وانا کھلا دیا ہے کہ نہیں...؟“

ان کا لہجہ اتنا مشفق اور دوستانہ تھا کہ روشنی دل ہی دل میں ان کی شخصیت پر فدا ہو کر رہ گئی۔

نمیرہ اب اسے اپنے دیگر قیمتی ممبرز سے ملوا رہی تھی۔

☆...☆...☆

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو اجالہ ابھی پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ معمول کے عین مطابق وضو کر کے نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو گئی تھی۔

باہر کشادہ صحن میں عشق پیچاں کی بیل کے پاس، ننھی منی چڑیوں کے غول اتر رہے تھے۔ چوں چوں کرتی چڑیوں کی چہچہاہٹ نے صبح کے پر نور ماحول کو مزید حسن بخش دیا تھا۔ تب ہی تھوڑی دیر میں پارہ مکمل کر کے عقیدت سے قرآن پاک کو بوسہ دینے کے بعد اس نے اوپر الماری میں رکھا اور باہر عشق پیچاں کی بیل کے قریب چلی آئی۔

”آ... آ... آ...“ چڑیوں کے لیے جو دانے اس نے اٹھا کر رکھ دیے تھے۔ وہی پھر سے زمین پر بکھیر دیے۔ اسی اثنا میں یمنی ان دھلے چہرے کے ساتھ سست روی سے چلتی ہوئی اس کے قریب آ بیٹھی۔ شافیہ نے دیکھا اس کی آنکھیں رات بھر جاگنے کے باعث خاصی سرخ ہو رہی تھیں۔

”صبح ہو گئی تمہاری؟“ ذرا سی گردن موڑ کر اس کے ستے ہوئے روتے سے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تھا۔ تاہم یمنی خاموش رہی۔

”کچھ تو بول یار! اٹھتے ہی چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے کیا...؟“ عادت کے مطابق شرارت سے مسکراتے ہوئے اس نے یمنی کو چھیڑنا چاہا تھا مگر وہ اب



بھی خاموشی سے چڑیوں کو دانہ چگتے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس کے لبوں کی مسکراہٹ بھی سمٹی تھی۔

”رات بارش بہت ہوئی ہے۔ اندر بھی اور باہر بھی۔“

”ہاں...“

”شاہ ذر کا کیا قصہ ہے؟“

تھوڑے توقف کے بعد پھر اس نے پوچھا تھا جب وہ ناگواری سے بولی۔

”پتہ نہیں یار۔ عجیب خبیث انسان ہے۔ روزانہ گاڑی لے کر راستے میں آکھڑا

ہوتا ہے۔ پرسوں سبحان لینے کے لیے گیا تو دیکھ لیا۔ آئی تھنک دونوں کے

بیچ تو تو، میں میں بھی ہوئی ہے مگر میرا کیا قصور ہے اس سارے قصے میں۔

میں تو نہیں کہتی اسے کہ میرے راستے میں آکر کھڑا ہو پھر مجھ پر پابندیاں

لگانا کہاں کا انصاف ہے شافی۔“

اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ شافیہ نے مکمل توجہ سے اس کی بات سنی پھر رسان

سے بولی۔

”ایسا تو ہوتا ہی ہے یار۔ کوئی بھی غیرت مند انسان اپنی عزت پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔“

”یہ عزت پر سمجھوتہ نہیں جہالت ہے، جب میں غلط نہیں تو سزا مجھے کیوں

ملے؟ پڑھ لکھ کر اپنی شخصیت کو سنوارنا کسی کے کام آنا میری دلی تمنا ہے۔

اب محض ایک انسان کی غلط حرکتوں کی وجہ سے میں سب کچھ چھوڑ کر گھر تو

نہیں بیٹھ سکتی ناں۔“ اس کا غصہ اب بھی قائم تھا۔

شافیہ صحن سے اٹھ کر سامنے ہی کچن میں گھس گئی۔

”تم ہمیشہ بھول جاتی ہو کہ تم ایک عورت ہو جانی۔“ چولہے پر چائے کے لیے

پانی چڑھاتے ہوئے اس نے پھر لبوں کو جنبش دی تھی۔

یعنی بھی چپ چاپ اٹھ کر اس کے پیچھے ہی کچن میں چلی آئی۔

”نہیں بھولتی مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ میں ایک لڑکی ہوں جو اپنی مرضی سے

جی نہیں سکتی، مر نہیں سکتی۔ غلط یا صحیح کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جس کی تخلیق

کا مقصد شاید یہی ہے کہ زندگی بھر مرد کی خدمت اور خوشنودی میں کوئی فرق

نہ آنے دے۔ چاہے اس کے لیے اس کی اپنی ہر سانس ہی سولی پر کیوں نہ



چڑھ جائے۔ نہیں بھولتا مجھے۔ کچھ بھی نہیں بھولتا مگر... ابھی معاملہ میری تعلیم کا ہے جس پر کوئی سمجھوتہ مجھے قبول نہیں۔ خواہ یہ لوگ مجھے گھر سے ہی کیوں نہ نکال دیں۔“

اس کی آنکھیں کرب سے جل رہی تھیں۔

شافیہ خان کے لبوں پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ بکھر کر معدوم ہو گئی۔

”صبر سے کام لو یمنی! عورت کے لیے اتنا جذباتی پن اچھا نہیں ہوتا۔“

وہ اب چائے پکوں میں انڈیل رہی تھی۔ یمنی نے تنفر سے رخ پھیر لیا۔

”تمہارا بس چلے تو تم دنیا کی تمام عورتوں کو سولی پر چڑھا کر ختم کر دو مگر میں شافیہ خان نہیں ہوں۔ مجھے اپنے حق کے لیے جنگ لڑنا آتی ہے۔“ خاصے خشک انداز میں کہتے ہی وہ چائے پیئے بغیر وہاں سے اٹھ کر کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

شافیہ خان کے دل میں جیسے پھر سے کسی درد نے چمکی کاٹ لی۔

☆...☆...☆

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تو ایک ہی بات اس کے ذہن میں اچھی طرح بٹھائی گئی تھی کہ جن لڑکیوں کی مائیں نہیں ہوتیں انہیں پھر زندگی میں ہر قدم بہت احتیاط سے پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ ماں کا سایہ سر پر نہ ہو تو یہ معاشرہ بیٹی کے سائے پر بھی گہری نظریں چپکا دیتا ہے۔ ایک معمولی سی بھول اس کے لیے عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ بہت سمجھ دار ہو گئی تھی۔

اب نمیرہ کے ساتھ وہ آٹھویں کلاس میں تھی۔

بڑھتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت اور بے لوث دوستی کا رشتہ اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ ہشتم کا امتحان چونکہ بورڈ کا تھا لہذا منزہ بجو نے ان دونوں کی کلاس میں بہتر پوزیشن

کے لیے انہیں ٹیوشن پڑھانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ یوں اب روشنی اور نمیرہ کا ساتھ اور بھی مضبوط ہو گیا۔



جہاں زیب حسن ان دنوں اپنے بی اے فائنل ایئر کے امتحانات کی تیاری کر رہے تھے۔ نمیرہ اور روشنی کی دوستی کی وجہ سے دونوں گھرانے بھی ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ نمیرہ کے ساتھ ساتھ اس کی باقی فیملی کو بھی گرین ہاؤس میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اباجی اور اس کے بھائی نمیرہ کو بھی اتنا ہی پیار کرتے تھے جتنا اس سے کرتے تھے۔

روشنی بہت چھوٹی تھی جب گرین ہاؤس میں ہونے والے ایک عجیب و غریب واقعے نے اسے اعصابی طور پر خاصا سہا دیا۔ اماں جی ان دنوں بہت علیل تھیں۔ جب اچانک اباجی کو پتہ چلا کہ رضیہ آپا ساتھ والے گھر کی فیملی کے کسی لڑکے میں انٹر سٹڈ ہیں۔ اس نے ہمیشہ اپنے اباجی کو اولاد پر مہربان دیکھا تھا۔

وہ اوپر سے جتنے سخت گیر دکھائی دیتے تھے، اندر سے اتنے ہی نرم تھے۔ اپنے تمام بچوں سے ان کی محبت مثالی تھی۔ روشنی نے کبھی انہیں اپنے بہن بھائیوں پر یا خود پر بے جا سختی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سب سے چھوٹی ہونے کے باعث وہ تو ویسے بھی ان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہیں کبھی اپنے بچوں کو غلط یا صحیح کا فرق سمجھانے کے لیے

مارپیٹ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ ایک طرح سے ان کی تربیت اور پرورش بے مثال تھی۔

سب بچے ان کے چہرے کا رنگ دیکھ کر ہی سمجھ جاتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ ان دنوں رضیہ آپا کے افیئر کو لے کر گھر میں کافی ٹینشن چل رہی تھی۔ رضیہ آپا کسی طور اپنی محبت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھیں۔

اس روز پہلی بار اس نے اپنے حلیم مزاج اباجی اور بھائیوں کو بڑے غصے میں دیکھا تھا۔ رضیہ آپا صحن میں سر جھکائے کھڑی تھیں اور اباجی گرج دار لہجے میں ان سے پوچھ رہے تھے۔

”بولو کیا چکر ہے وقار کا... کیوں وہ لڑکا تمہارے پیچھے پڑا ہے؟“

جواب میں آپا نے سر اٹھائے بغیر بڑے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”وہ مجھے پرپوز کرنا چاہتا ہے اباجی۔ محبت کرتا ہے وہ مجھ سے۔“

”اس کی یہ مجال... پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے مجھے؟“

اب کے وہ پھر گرجے تھے۔ تب ہی وہ بولیں۔



”اباجی! میں بھی اسے پسند کرتی ہوں اگر آپ نے میری شادی اس سے نہ کی تو پھر میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔“

ان کے لہجے میں بغاوت تھی۔ اباجی اپنی بیٹی کی اس درجہ جرأت پر ساکت رہ گئے تھے۔ ان ہی دنوں وہ پہلے ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئے تھے۔ شافیہ کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اپنے اباجی کو تکلیف پہنچانے والی اپنی اس بہن کا منہ نوچ لے۔ اپنی تکلیف اور اذیت کی پروا کیے بغیر اسی روز اباجی نے رضیہ آپا کا نکاح ان کے پسندیدہ لڑکے کے ساتھ پڑھا کر انہیں خالی ہاتھ ہمیشہ کے لیے اپنی دہلیز سے رخصت کر دیا۔

ان دنوں چونکہ اماں جی حیات تھیں لہذا کسی کو کچھ بھی کہنے کا موقع نہ ملا۔ اماں کی ممتا کی آڑ لے کر آپا جی اپنی محبت کا ہاتھ تھامے باقی کے دلوں پر چھری چلا گئی تھیں۔ اباجی نے اس واقعہ کا اتنا اثر لیا کہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئے۔

ان دنوں وہ اپنے اباجی کو ملول دیکھ کر کتنا کڑھتی تھی۔ کتنے مختلف تھے اس کے اباجی۔ کس قدر مشفق مگر... اس کی بہن نے پیار کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔

روشنی کے ننھے سے دماغ پر اس واقعے نے بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ ابھی ایسی کسی سچائی کو ذہنی طور پر سمجھنے اور قبول کرنے کے لائق نہیں تھی مگر اس کے باوجود اس نے خود سے

عہد باندھ لیا تھا کہ وہ آپا کی طرح کبھی زندگی میں اپنے پیارے اباجی کا دل نہیں دکھائے گی۔

☆...☆...☆

وہ گہری نیند میں سو رہی تھی جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دوپہر میں جانے کس پہر لائٹ چلی گئی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس نے موندی موندی آنکھوں سے اٹھ کر ٹائم دیکھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور اب رات کے ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ اسے اپنی عصر اور مغرب کی نماز قضا ہو جانے کا بے حد افسوس ہوا۔ سردی کی شدت میں یلکھت اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بستر سے نکل کر اپنے کمرے سے باہر آئی تو صحن میں یمنی کو تن تنہا بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ تاروں بھرے آسمان کو دیکھتی وہ خاصی ملول لگ رہی تھی۔

شافیہ واش روم کی طرف بڑھتی بڑھتی، پلٹ کر اس کے قریب چلی آئی۔

”یمنی! یہاں کیوں بیٹھی ہو جان۔ کتنی ٹھنڈ ہے، بیمار پڑ گئی تو...؟“

”تو کیا... مر تو نہیں جاؤں گی۔“ اس کا موڈ بے حد آف تھا۔ شافیہ اس کے

قریب ہی بیٹھ گئی۔

”بڑی بات۔ فضول باتیں نہیں کرتے۔ تم اب تک کل والی بات کو دل سے لگا

کر بیٹھی ہو؟“ اس کا لہجہ بے حد اپنائیت بھرا تھا مگر یمنی کا موڈ ٹھیک نہیں

ہوا۔

”میں نہیں لگاتی کسی بات کو دل سے، نہ ہی اتنا کمزور کوئی مجھے سمجھے۔ مجھ پر

فضول پابندیاں عائد کی گئیں تو میں چھوڑ کر چلی جاؤں گی یہ گھر... پھر

کرتے رہیں ان اینٹوں اور پتھروں سے بنے محل پر حکمرانی۔“

شافیہ ابھی اسے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ پھر بول اٹھی۔

”تمہیں پتہ ہے شافی! ساتھ والے گھر کی آپا نسرین کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔“

”واٹ...؟“ اس کی اچانک اطلاع پر وہ بے ساختہ اچھلی تھی۔

”ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال سے لاش آئی ہے ان کی۔“

”لیکن کیوں...؟“

اس کے اعصاب پر ایک دم سے بوجھ پڑا تھا۔ یمنی نے اپنی نگاہیں پھر سے

آسمان پر مرکوز کر دیں۔

”کیوں کا کیا سوال...؟ پانچ بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ چھٹی بار وقت سے پہلے ہی

الٹراساؤنڈ کروا کر پتہ کیا تو ڈاکٹر نے پھر بیٹی بتایا۔ بے چاری مرے مرے

قدموں سے گھر پہنچی تو ساس اور دیورانی نے معمولی بات کی آڑ لے کر فساد

کھڑا کر لیا۔ کمینہ شوہر بھی ان ہی کے ساتھ ہے۔ پہلے خوب پیٹ کر ہاتھ کی

رگ کاٹنے کی کوشش کی مگر بچوں نے رورو کر محلے والوں کو اکٹھا کر لیا

سو جان بچ گئی مظلوم عورت کی... مگر رات میں پھر کسی بات پر دوبارہ لڑائی

ہو گئی اور کم بختوں نے پیٹرول ڈال کر آگ میں زندہ جلا ڈالا اسے۔ تم اسے

دیکھ لیتی ناں شافیہ تو دھاڑیں مار مار کر روتیں۔“

اس کا لہجہ از حد اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شافیہ کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

”پھر... کیا ہوا؟“ اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ یمنی نے اپنی شال

سمیٹ لی۔



”پھر کیا ہونا تھا۔ وہ چیخی چلائی تو مصیبت میں پھنس جانے کے خوف سے اس کی ساس اور دیور کراچی کے اسپتال میں لے گئے۔ شوہر فرار ہو گیا۔ پولیس نے مرنے سے پہلے بیان لیا تو اس نے اپنی المناک موت کا انکشاف کیا۔ شوہر کو تو پھر بھی بچا لیا بے وقوف نے۔ فضول میں مرتے مرتے کہہ گئی کہ شوہر اسے آگ لگانے میں شریک نہیں تھا۔ تم اس کی بیچوں کو دیکھو شافی۔ روتے دیکھی نہیں جاتیں۔ سنا ہے مرنے سے پہلے بھائی کو فون کیا تھا اس نے اور بتایا تھا کہ سسرال میں اس کی جان کو خطرہ ہے مگر اس نے یہ سوچ کر

نوٹس نہیں لیا کہ ایسے جھگڑے تو روز کا معمول ہیں پھر وہ پرانی آگ میں کیوں کودے... کیا تمہیں لگتا ہے شافیہ کہ یہ سب تعلیم کی دوری کی وجہ سے ہے۔ اگر عورت ذات کو اچھی تعلیم اور بہتر نشوونما کے مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ نچلے پیمانے پر بھی خود پر ہونے والے گھٹیا مظالم کا نہ صرف بہادری سے مقابلہ کر سکتی ہے بلکہ اس کا مناسب سدباب بھی ہو سکتا ہے۔ کائنات کی بقا کا باعث ہو کر بھی عورت کو کیا مل رہا ہے... اذیتیں، نت نئے امتحان‘

قربانیاں... کیوں...؟“ اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی تھی۔ شافیہ دونوں ہاتھ باندھ کر گود میں رکھتے ہوئے چپ چاپ سر جھکا گئی۔ تب ہی وہ پھر بولی۔

”سب جانتے ہیں شافیہ کہ دیگر مذاہب میں عورت کا درجہ بہت پست ہے۔ میں نے سنا ہے بہت پہلے ہندو مذہب میں اگر کسی عورت کا خاوند مر جاتا تھا تو اس بد نصیب کو زبردستی بنا سنوار کر اسی خاوند کے ساتھ زندہ جلا کر ”ستی“ کر دیا جاتا تھا۔ شاید یہ ان کے کسی رسم و رواج یا مذہب کا کوئی حصہ ہو پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ جس عورت کا شوہر عمر کے کسی بھی حصے میں مر گیا تو وہ باقی کی ساری زندگی صرف سفید لباس میں ملبوس غم والی جیتی جاگتی تصویر بنی اسی مرجانے والے شوہر کے نام پر ایڑیاں رگڑتی گزار دیتی تھی۔ تم نے وہ چہرے نہیں دیکھے۔ ان آنکھوں میں دم توڑتے خوابوں اور کھرام مچاتی تمناؤں کا نظارہ بھی نہیں کیا تم نے مگر میں نے ریسرچ کی ہے۔ آشرم میں قید ان زندہ روحوں کی بے بسی اور اذیتوں کا تماشا بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے۔ اپنے اپنے مختلف خداؤں کی پوجا میں دن رات مصروف وہ سانسوں کا بار جھیلی زندہ روہیں اپنے جسم پر ہزار بار ماتم کناں ہیں۔

یہ سب باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اسلام سے لا تعلق ہونے کے باعث ان کی ہر بات سمجھ میں آتی ہے مگر... ہم تو اسلام سے لا تعلق نہیں شافی۔ ہمیں تو اللہ کی پاک ذات نے اسی سچے نبی ﷺ کی آخری محبوب امت سے پیدا فرمایا ہے جن کی تعلیمات نے پہلی بار عورت نامی اس مظلوم مخلوق کو فرائض کے ساتھ ساتھ حقوق بھی دیئے۔ عزت سے سراٹھا کر زندہ رہنے کا شعور دیا۔ جنہیں جہنم دے کر بی بی آمنہ دودھ پلا کر حلیمہ سعدیہ اور جن کے نام سے منسوب ہو کر بی بی خدیجہؓ اور بی بی عائشہؓ کے نام ہمیشہ کے لیے تاریخ میں سنہری

حروف میں درج ہو گئے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ اسی پیارے نبی ﷺ کی محبوب امت سے ہو کر ہم ان ہی کی تعلیمات کے خلاف چلیں۔ یہ جھوٹی شان اور غیرت کے نام پر اپنی بہن بیٹیوں کا سرعام قتل غلط مراسم کے ذرا سے شُبہ پر انہیں بے دردی سے مار کر بنا نماز جنازہ کروائے زمین میں دفن کر دینا، صرف اپنی انا اور ضد کے لیے۔ ان کی زندگیوں کے سودے جانوروں کی طرح طے کر دینا۔ یہ کیسی مسلمانیت، اور کیسی انسانیت ہے؟

اشرف المخلوقات کی صف میں صرف مرد نہیں آتے عورت کو بھی عقل و شعور دیا گیا ہے۔ یہ کیسی عزت و شان، یہ کیسی رسمیں ہیں جن کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیشہ عورت کی قربانی لی جاتی ہے۔ اگر مرد ایک وقت میں چار شادیاں کر سکتا ہے تو اپنی پسند اور مرضی سے ہمسفر چننے کے ساتھ ساتھ آزادی کی زندگی بسر کرنے کا حق ہمارے اللہ اور رسولؐ اور مذہب نے عورت کو بھی دیا ہے۔ وہ دنیا میں صرف جوتیاں کھا کر مرنے کے لیے نہیں آئیں۔“ وہ اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

شافیہ محض سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

”تم نے کبھی سوچا ہے شافیہ ہمارے ملک میں روزانہ کتنی ایسی بد نصیب بہنیں اور بیٹیاں ہوں گی جو اکثریت میں بے قصور اور اقلیت میں معمولی خطاؤں کی بھینٹ چڑھا کر بے رحم موت کا لقمہ بنتے ہوئے رات کی تاریکی میں چپ چاپ مٹی کے ڈھیر کے سپرد کر دی جاتی ہوں گی... ذرا سوچو شافیہ وہ کس کے سامنے انصاف کے لیے دامن پھیلائیں؟ یہاں تو اس معاشرے میں کون ان کی کمزور صدائیں سننے والا ہے؟ آخر کب تک ہماری مشرقی عورت باپ،



بھائی کی جھوٹی شان اور غیرت کا شملہ اونچا رکھنے کے لیے اپنے خوابوں اور ارمانوں کو سولی چڑھاتی رہے گی۔۔۔“ وہ بیسٹ ڈبیٹر تھی۔

شافیہ دل ہی دل میں اس کے خیالات سے متاثر ہونے کے باوجود ایک مرتبہ پھر سرد آہ بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ سب ستمناہی باتیں ہیں یمنی۔ قصے کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے رنگ بہت بھیانک ہیں۔ یہاں پر عورت اپنے حکمران مرد کے اشاروں پر چلنے

کی پابند ہے۔ پابند نہ ہو تو ایک بھیڑیے کی قید سے نکل کر ہزار بھیڑیوں کی بھیڑ میں گھر کر رہ جاتی ہے۔ تم نہیں سمجھو گی یار۔ بہت مجبوریاں ہوتی ہیں عورت کی زندگی میں۔“

”ہا۔۔۔ تم بھی بہت مجبور تھیں، ہے نا۔“

اب وہ کلس کر اس کی ذات پر ایک اٹیک کر رہی تھی۔

شافیہ دکھ سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”ہاں۔ میں مجبور تھی مگر۔۔۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ الحمد للہ میں اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن ہوں۔“

اس کے ٹھہرے لہجے کے جواب میں وہ پھر طنز سے مسکرائی تھی۔  
”شکل دیکھو آئینے میں اپنی اور پھر ایمان داری سے بتانا۔ کتنی خوش اور مطمئن ہو اپنی زندگی سے۔“

اس کا زہر میں ڈوبا انداز تیر بن کر شافیہ کے دل میں چبھا تھا۔

چپ چاپ اٹھ کر وہ اس کے طنز کا کوئی بھی جواب دیے بغیر وضو کرنے واش روم میں گھس گئی تھی۔

☆...☆...☆

”گرین پیلس“ میں بھابی جان نے ان دنوں ایک ننھی سی گڑیا کو جنم دیا تھا۔ اس گھر سے رضیہ بجو کی رخصتی کے بعد ماحول خاصا بدل چکا تھا۔ اماں جی کی طبیعت بھی زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ ان ہی دنوں کسی جاننے والے کے توسط سے یہ پتہ چلا کہ رضیہ بجو اپنے گھر میں خوش نہیں ہیں اور یہ بھی کہ شوہر اور سسرال والوں نے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔

اماں جی کو جیسے ہی اس بات کا پتہ چلا وہ مچل اٹھیں۔ بیٹی کی خطا بڑی تھی مگر ان کی مامتا سے بڑی نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ گھر کے سب مرد بہت خفا تھے۔ رضیہ بجو سے اور کسی صورت اسے معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے مگر انہوں نے جانے کیسے رورو کر واسطے دے دے کر اباجی کے پتھر دل کو موم کر ڈالا اور یوں وہ رضیہ بجو کو نہایت ابتر حال میں سہارا دے کر اپنے گھر واپس لے آئے۔

”اس کے بعد جلدی اماں جی کی وفات ہو گئی اور دوسری طرف رضیہ بجو نے بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹے کے جنم کی خبر سن کر وقار بھائی دوڑے آئے اور جیسے بھی ہوا انہیں منا کر دوبارہ اپنے ساتھ لے گئے۔

روشنی کو اماں جی کی رحلت کے بعد اباجی نے سنبھال لیا۔ وہ اس کے تمام فرائض ایک ماں کی طرح ہی نبھا رہے تھے۔ دوسری شخصیت جنہیں روشنی نے خود سے قریب پایا وہ فراز لالہ تھے۔ جنہیں وہ بڑے پیار سے اپنی توتلی زبان میں ”بڑے لالہ“ کہہ کر پکارتی تھی۔

منزہ بجو اعجاز لالہ اور ریاض لالہ کے ساتھ اس کی کوئی خاص اٹیچ منٹ نہیں تھی۔ اعجاز لالہ اس سے پورے پندرہ سال بڑے ہونے کے باوجود اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

وہ فطرتاً سخت مزاج اور غصیلے تھے لہذا جہاں موقع ملتا اسے پیٹ ڈالتے یا سزا دیتے۔ ایسے میں اگر بڑے لالہ اچانک آجاتے تو اس کی عمید ہو جاتی اور چھوٹے لالہ کی شامت آجاتی۔ وہ ذرا بڑی ہوئی تو ان کے ڈرانے دھمکانے پر اباجی اور بڑے لالہ سے ان کی شکایت کرنے لگی۔ یوں اب وہ اسے کم ہی تنگ کرتے۔

چھٹی سے آٹھویں کلاس تک منزہ بجو نے ان دونوں کو ٹیوشن پڑھائی۔ نمبرہ بھی اپنے بھائی جہاں زیب تو کبھی ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر آجاتی اور یوں دونوں مل کر پڑھائی بھی کرتیں اور کھیل کود بھی۔ تاہم منزہ بجو کی شادی کے بعد مڈل کلاس میں جہاں زیب حسن نے انہیں ٹیوشن پڑھانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔

اب روشنی چھٹی کے بعد نمبرہ کے ساتھ ٹیوشن پڑھنے اس کے گھر جاتی۔



جہاں زیب حسن ان دنوں اپنے بی اے فائنل ایئر کے امتحانات سے فارغ ہو گئے تھے۔ انہیں باربی ڈول سی دل کشی رکھنے والی روشنی کا شرارتیں کرنا اور کسی بھی موضوع پر بلا تکان پٹر پٹر بولنا بے حد اچھا لگتا تھا۔ وہ بے حد دوستانہ مزاج کی حامل لڑکی تھی جو ان سے چھوٹی علی زیب کے ساتھ بھی خوب شرارتیں کرتی۔

جہاں زیب اوپر سے جتنے رعب دار، ضدی اور غصے والے تھے، اندر سے ان کا دل اتنا ہی نرم تھا۔ نمیرہ اور روشنی کو ٹیوشن دیتے ہوئے اکثر کبھی وہ انہیں ڈانٹ دیتے تو نمیرہ اثر نہ لیتی مگر روشنی سہم کر معصومیت سے ان کی طرف دیکھنے لگتی جس پر وہ اسے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

شروع سے ہی وہ ان کے معاملے میں بہت حساس تھی۔

ٹیوشن کے دوران گھر کی کوئی ایسی بات نہیں ہوتی تھی جو وہ ان سے شیئر نہ کرتی ہو۔ وہ جب میٹھ کرواتے تو وہ بڑے مزے سے ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتی یا پھر کندھے سے چپک جاتی۔ وہ باہر سے آتے تو بے تاب سے ان کی طرف بڑھتی اور انہیں نمیرہ اور علی زیب کی شکایت کرتی۔

اکثر ان کے چہرے پر گرمی سے پسینہ آیا ہوتا تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ پسینہ صاف کر کے پھونکیں مارتی رہتی۔ اس کے دل میں ان کے لیے کتنا پیار اور عقیدت تھی وہ نہیں جان سکتے تھے۔ اکثر ٹیوشن کے بعد بڑے لالہ یا چھوٹے لالہ کسی مصروفیت یا مجبوری کی وجہ سے اسے پک کرنے نہ آتے تو جہاں زیب حسن خود اسے گھر چھوڑنے نکل پڑتے اور تب بائیک پر ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ ان کی کمر کے گرد ڈال لیتی۔

راستے میں بھی وہ ان سے اپنے اسکول اور فرینڈز کی ہزاروں باتیں کرتی۔ اسے جہاں زیب حسن اور اپنے بڑے لالہ کی شخصیات سے ایک جیسی انسیت تھی۔ دونوں سے ہی اسے بے پناہ پیار تھا۔

گھر میں چھوٹے لالہ کے ساتھ ساتھ اس کے دونوں بھتیجے بھی اس کا نام میں دم کیے رکھتے تھے۔ کبھی آپا جان گرین پیلس کا چکر لگاتیں تو ان کے دونوں نو عمر بیٹے بھی اسے تنگ کرنے میں ہرگز پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ایسے میں اباجی کی گود، بڑے لالہ کا ساتھ یا پھر جہاں زیب حسن کا گھر اس کی واحد پناہ گاہیں تھیں۔

ہر لمحہ مسرتوں میں ڈوبا وہ وقت کب تیزی سے آگے بڑھ گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

جہاں زیب آج کل بڑے رعب کے ساتھ اسے اردو کی باریکیاں سمجھا رہے تھے اور یہ اتنا مشکل تھا اس کے لیے کہ گھنٹوں وہ ان کا دماغ کھاتی رہتی۔ تب ہی اس کی ہیلپ کے لیے انہوں نے خود اپنے پیسوں سے اسے اردو لغت خرید کر دے دی تھی۔

روشنی جب رات میں اباجی سے لپٹ کر سونے کے لیے لیٹتی تو اس کی ہر بات میں جہاں زیب حسن ہوتے تھے اور اباجی کے ساتھ ساتھ قریب ہی لیٹے بڑے لالہ بھی اس کے منہ سے جہاں زیب حسن کی اتنی تعریفیں سن کر اس کی شخصیت کے اور بھی گرویدہ ہو گئے تھے۔

جہاں زیب حسن اب ان کے مڈل کے امتحانات میں شاندار رزلٹ کے بعد اپنی جاب کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا چاہ رہے تھے اور روشنی اس اطلاع پر اداس ہو کر رہ گئی تھی۔ ببل کی مانند چہکتی اس لڑکی کی اپنی ذات سے اس

درجہ انسیت نے، انہیں اپنے روشن مستقبل کے لیے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆...☆...☆

چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں لہذا اس نے گھر واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ یمنی اس کی واپسی پر بہت اداس تھی۔ وہ شام میں اپنے سامان کی پیکنگ کر رہی تھی۔ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”شافیہ! تم جا رہی ہو...؟“

”ہاں...“ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے اس نے پیچھے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا جو بے حد ملول تھی۔

”شافیہ! آئی ایم سوری۔ میں نے کل جذبات میں آ کر تمہارے ساتھ بہت بد تمیزی کی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ دھیرے سے کہہ کر اس نے پھر رخ پھیر لیا تھا تب ہی وہ پھر بولی۔



”شافیہ! تمہیں پتہ ہے پاپا میری شادی طے کر رہے ہیں...؟“

”ہاں۔ مجھ سے بات کی تھی انہوں نے۔“

شافیہ خان کے جواب نے یمنی کو خاصا حیران کیا تھا۔

”واٹ... اگر تم سے بات کی تھی تو تم نے انہیں سمجھایا کیوں نہیں؟ تم اچھی طرح جانتی ہو میں پڑھنا چاہتی ہوں پھر شاہ زر کی مجھ میں دلچسپی سے بھی تم بے خبر نہیں ہو اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ پاپا اور سب گھروالے تمہاری بات کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے باوجود تم میری کوئی ہیلپ نہیں کر سکتیں کیسی بے حس پھوپھو ہو تم۔ خود تو خوشی خوشی قربان ہو گئیں۔ اب یہ چاہتی ہو کہ کسی اور کو بھی کوئی خوشی نہ ملے۔ اگر کوئی تمہیں چھوڑ کر چلا گیا یا تم نے کسی کو چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور کر دیا تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ کیوں اتنی دشمن ہو گئی ہو تم محبت کی...؟“

تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی کل والی بدتمیزی کی معافی مانگ رہی تھی مگر اب فقط چند لمحوں کے بعد ہی اس نے پھر زبان سے خنجر کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔

شافیہ خان کے دل میں پھر سے کسی درد نے چٹکی بھری تھی۔

وہ بولی تو اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔

”ہر وقت فضول بکواس مت کرتی رہا کرو یمنی! مت کپیئر کیا کرو خود کو

میرے ساتھ۔ میرا معاملہ الگ تھا۔ کتنی بار بتاؤں کہ میرے لیے میرے ابا جی اور بھائیوں کی محبت زیادہ قیمتی تھی کیوں سمجھ میں نہیں آتا تمہیں؟ اور تمہارا ساتھ کیوں دوں میں... کیا والدین اسی لیے بچوں کو جنم دیتے ہیں؟ انہیں پڑھاتے لکھاتے ہیں کہ بڑے ہو کر وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتے پھریں... خود صحیح اور غلط کا فیصلہ کرتے پھریں...؟ نہیں عورت کو اللہ نے صرف مرد کی خوشنودی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے دامن پر کسی معمولی سی بھول کا داغ بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا سمجھی تم“

وہ بہت کم غصے میں آتی تھی مگر جب آتی تو سامنے والا دبک کر رہ جاتا تھا۔ یمنی بھی اس وقت خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر اسی روز سب سے مل کر شام سے پہلے وہ سبحان کے ساتھ اپنی مطلوبہ ٹرین میں آ بیٹھی۔

”اپنا خیال رکھئے گا پھوپھو اور فون کرتی رہا کریں۔“

ٹرین چلنے سے قبل وہ اسے آخری نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔ شافیہ نے مسکرا کر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹھنڈی ہوا کے سرد تھپیڑوں نے جسم میں کپکپی دوڑا دی تھی۔

وہ اپنی سیٹ کی پشت سے سر اٹھا کر پلکیں موند گئی۔ تھوڑی دیر میں جب ٹرین چل پڑی تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک لڑکی کسی ادھیڑ عمر خاتون کے ساتھ بیٹھی، اپنی کالی چادر میں مکمل خود کو چھپائے ہوئے تھی۔ شافیہ نے سرسری سی ایک نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹرین اب تیزی پکڑ رہی تھی۔ ایسے میں پیچھے رہ جانے والے بظاہر بھاگتے منظروں نے اس کی مکمل توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

اس کے ذہن میں ابھی تک یمنی کی باتیں گونج رہی تھیں اور اسے لگ رہا تھا جیسے آج کی رات بھی وہ نیند کی گولیوں کے بغیر سو نہیں پائے گی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ تب ہی کسی نے اسے دھیمے سے پکارا تھا۔

”سنئے۔ کیا آپ کے پاس پانی مل سکتا ہے؟“

شافیہ چونکی تھی اور پھر نگاہ پھیر کر اپنے سامنے بیٹھی ہوئی اس لڑکی کی طرف دیکھا تھا جو اپنا مکمل چہرہ چادر میں چھپائے اس سے پانی مانگ رہی تھی۔ اس کی ریکوسٹ پر آہستہ

سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر سامنے بیٹھی لڑکی کو تھما دی تھی۔ لڑکی نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے پاس موجود گلاس میں تھوڑا سا پانی نکال لیا اور بوتل بند کر کے واپس اسے تھما دی۔

اگلے دو منٹ میں پانی پینے کے لیے جب اس نے چہرے سے ذرا سی چادر کھسکائی۔ شافیہ کھڑکی کی طرف توجہ کرتے کرتے ایک دم چونک اٹھی۔

اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کا چہرہ بہت برے طریقے سے جلا ہوا تھا۔ وہ ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ جانے کتنے پل یوں ہی بے خبری میں بیت گئے جب ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہوئے اس نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی اس پر کشش سی لڑکی کو خود مخاطب کیا۔



”ایکسیوزمی۔“

”جی...“ اس بار لڑکی نے اس کی طرف چونک کر دیکھا تھا جب وہ بولی۔

”آ... آپ کا چہرہ بہت بری طرح سے جلا ہوا ہے۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔“ لڑکی اس کی اطلاع پر بڑے پھیکے سے انداز میں

مسکرائی تھی۔ شافیہ کا اضطراب بڑھ گیا۔

”کیوں... میرا مطلب ہے کیسے؟“

لڑکی اس کے سوال پر پھر بڑے افسردہ سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”بھائی نے جلا دیا تھا۔ اب تو یہ پرانی بات ہو گئی ہے۔“

کیسا عجیب سا بے نیاز انداز تھا اس کا۔ شافیہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

کتنی خوب صورت آنکھیں تھیں اس کی۔ ایک طرف گال بھی سیب سے مشابہ

تھا۔ صبیح پیشانی پر چمکتے بال صاف بتا رہے تھے کہ وہ یقیناً قدرت کی خوب

صورت تخلیق تھی۔

”کیوں؟“ کتنی مشکل سے وہ یہ سوال پوچھ پائی تھی۔ لڑکی کی آنکھیں یلکھت

پانیوں سے بھر آئی تھیں۔

آہستہ سے پھر چادر میں چھپاتے ہوئے اس نے اپنا رخ کھڑکی کی جانب پھیر لیا

تھا جہاں سے آتے ٹھنڈی ہوا کے شریر جھونکے اس کی چادر کو سر پر ٹکنے

نہیں دے رہے تھے۔

شام اب اچھی خاصی ڈھل چکی تھی۔ تب ہی وہ مغموم لہجے میں بولی تھی۔

”کیا بتاؤں بڑی لمبی کہانی ہے۔“

”آپ مجھ پر مکمل بھروسہ کر سکتی ہیں۔“

ہمدرد دل کی مالک ہونے کے باعث شافیہ کے لیے اپنی توجہ اس کی ذات

سے ہٹا لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف وہ پھر جیسے کانٹوں پر گھسیٹ دی

گئی تھی۔

”بھروسے کی کیا بات ہے۔ ہم تو کچھ دیر کے ہمسفر ہیں۔ اپنے اپنے پلیٹ فارم

پر اترتے ہی اپنی داستانیں بھی سمیٹ کر ساتھ لے جائیں گے۔ اصل میں میرا

تعلق گھوٹکی کے ایک غیر معروف گاؤں سے ہے۔ ہمارے گاؤں میں عورتوں

کے لیے چند مخصوص اصول و قواعد ہیں جن میں پہلے نمبر پر اسے تعلیم سے

دور رکھنا ہے۔ پورے گاؤں کے کسی گھر کی لڑکی کی جرأت نہیں کہ وہ پڑھنے

لکھنے کا خیال بھی ذہن میں آنے دے۔ اسی لیے آج تک وہاں لڑکیوں کے لیے کوئی اسکول قائم نہیں ہونے دیا گیا۔ دوسرے نمبر پر یہ اصول ہے کہ اگر کسی لڑکی کی نسبت کسی لڑکے سے طے ہو گئی ہے پھر اس کے بعد شادی ہونے سے پہلے ہی اگر یہ نسبت ٹوٹ جاتی ہے تو اس لڑکی کو زندگی بھر کسی دوسرے لڑکے سے منسوب نہیں ہونے دیا جائے گا اور نہ ہی کوئی اور لڑکا اسے اپنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ کسی اور کے خواب دیکھ کر جو ٹھٹی ہو جاتی ہے ناں عورت۔“ دھیمے سے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے وہ جیسے اپنے معاشرے کے ناخداؤں کی ذہنیت پر ہنسی تھی۔

شافیہ حیرت سے گنگ اسے بولتے ہوئے سنتی رہی۔

”میرے ابا زمیندار ہیں۔ دو بھائی بڑے ہیں مجھ سے۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد لیے تھے اللہ سے اور دو چھوٹے ہیں۔ ابھی پڑھ رہے ہیں۔ میں نے قرآن پاک پڑھا ہے۔ یہ چہرہ پانچ سال پہلے جلایا تھا چھوٹے بھائی نے اور قصور یہ تھا کہ قرآن پاک پڑھانے والی آپا جی کے بھانجے کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ آرمی میں کیپٹن تھا۔ کہیں ہفتے دس دنوں کے بعد گاؤں چکر لگاتا تھا۔ آپا جی کو

اس سے بہت محبت تھی۔ ایک طرح سے ماں بن کر پالا تھا انہوں نے اسے۔ بہت پیارا تھا۔ آپا جی کے پاس اس کی باتوں کے علاوہ دوسری کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر میں جانتی تھی کہ کم حیثیت ہو کر بھی میرے گھر والے اسے کبھی میرا رشتہ نہیں دیں گے۔ اسی لیے میں نے اسے منع کر دیا مگر... وہ بہت ضدی تھا۔ اس کا کہنا تھا وہ ہواؤں سے لڑ سکتا ہے۔ چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ مجھے پانے کے لیے اسے جان بھی دینی پڑی تو وہ دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے جیسے ہی ابا سے رشتے کی بات کی۔ انہوں نے منع کر دیا اور مجھ پر پابندیاں لگا دیں۔ اسے یہ سب قبول نہیں تھا لہذا میرے لاکھ سمجھانے منت کرنے کے باوجود اس نے ملنے کی ضد نہ چھوڑی اور پھر... ایک دن... سب کچھ ختم ہو گیا۔“

لڑکی کی آواز ایک دم سے بھرا گئی تھی۔

”پھر... کیا ہوا...؟“



کچھ لمحے اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے کے بعد شافیہ نے پوچھا تھا جب وہ کھڑکی سے باہر کے دوڑتے بھاگتے نظاروں پر نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے بولی۔

”پھر... پھر ایک روز چھوٹے بھائی نے اسے میرا راستہ روکتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ مجھ سے دو گھڑی بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کی پوسٹ تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ سیاحین کی پہاڑیوں پر جا رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے تک اس کا انتظار کروں مگر... اسے یہ سب مجھ سے کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں جانتی تھی اگر میں کہیں بھی رک کر اس سے بات کرتی ہوئی نظر آ گئی تو میرے بھائیوں کی غیرت کے احساس میں جوش آجائے گا۔ اسی لیے دل پر پتھر رکھے اسے دکھی کرتی رہی مگر پھر بھی اسے اور خود کو بچا نہیں سکی۔“

اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ شافیہ کی اپنی آنکھوں میں نمی چھلک آئی۔

”کیا کیا تمہارے بھائیوں نے اس کے ساتھ؟“

اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔

لڑکی نے اس بار توجہ کھڑکی سے ہٹا لی۔

”کرنا کیا تھا اسی وقت چھوٹے نے میرے بال پکڑ کر مجھے گھر میں لا پھینکا اور پھر بڑے بھائی کے ساتھ مل کر اس پر چڑھ دوڑے سب۔ ان دنوں اس کے چند دوست بھی تھے گاؤں میں۔ لہذا دونوں طرف سے خوب لاٹھیاں، کلہاڑیاں چلیں اور انجام یہ ہوا کہ سلمان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کا ایک دوست اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھا۔ میرے بھائی کے سر پر چوٹ آئی تھی مگر بچ گیا۔ سلمان کی المناک موت نے مجھے جیسے پاگل کر ڈالا تھا۔ میں وحشی ہو گئی تھی۔ ماں کا وجود تو گھر میں تھا نہیں لہذا میں نے سب کو سنا دیا کہ میں اب گھر میں نہیں رہوں گی۔ جب کبھی موقع ملا بھاگ جاؤں گی۔ میری اس دھمکی پر مشتعل ہو کر بھائی نے تیزاب سے چہرہ جلا دیا کہ نہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق رہوں گی نہ گھر سے بھاگوں گی۔“

اس کا تسلسل پھر ٹوٹ گیا تھا۔ شافیہ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

”دیکھو ناں اب میں بالکل آزاد ہوں۔ دو بھائی ملک سے باہر چلے گئے۔ ایک کی موت ہو گئی اور ایک اپنی سسرال کا ہو کر ہی رہ گیا۔ اب کسی کو پروا نہیں ہے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں؟ بوڑھے باپ کا خیال نہ ہو تو ایک ساتھ

نیند کی کئی گولیاں پھانک کر اس اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا پالوں مگر...  
ہم لڑکیوں کو تو شاید قدرت موت بھی مرضی سے نہیں دیتی۔“

کتنا درد تھا اس کے لہجے میں... شافیہ کے اندر جیسے پھر سے کئی دے ہوئے  
زخموں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی اب اس سے کہہ  
رہی تھی۔

”میں اگلے چند روز میں اپنے گاؤں میں بچیوں کے لیے اسکول کا انتظام کر  
رہی ہوں۔ تعلیم سے دوری نے ہمیں مذہب سے بہت دور کر دیا ہے۔ خصوصاً  
لڑکیوں کو زیور تعلیم سے محروم رکھ کر ان کے ساتھ بہت زیادتی کی جا رہی  
ہے۔ لڑکی پڑھ لکھ جائے تو کبھی خود کو جابلانہ فیصلوں کی بھینٹ چڑھنے نہیں  
دے سکتی۔“

وہ اور بھی جانے کیا کہہ رہی تھی مگر شافیہ خان کی سماعتیں جیسے برف ہو کر  
رہ گئی تھیں۔

☆...☆...☆

وہ اب بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔  
ہر بات میں پٹر پٹر بولنا اور کچھ بھی الم گلم کھاتے رہنا اس کی عادت بن چکی  
تھی۔ اب تک کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جو اس نے نمیرہ کے ساتھ جہاں زیب  
سے شیئر نہ کیا ہو۔ جہاں زیب شاہ آج کل پی آئی اے میں سلیکشن کے سلسلے  
میں شہر سے باہر تھے۔

ان لوگوں کے نویں کے سالانہ امتحان قریب تھے جب وہ گھر واپس آئے  
تھے۔ اپنی عادت اور مزاج کے عین مطابق وہ اب بھی پٹر پٹر ان سے ہر بات  
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شیئر کرتی تھی مگر اب بالکل اچانک جانے کیا ہوا  
تھا کہ وہ ان کی آنکھوں میں زیادہ دیر تک دیکھنے سے کترانے لگی تھی۔ بہت  
سے عجیب رنگ ہوتے تھے آج کل ان کی آنکھوں میں۔ یہ بات اس نے  
نمیرہ سے بھی کہی تھی جس پر وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

”اچھا تو تم نے محسوس کر ہی لیا۔“

چونکہ نمیرہ کو اس کی حرکتوں سے کچھ کچھ شک ہو گیا تھا لہذا وہ بھی اسے  
چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی۔ روشنی نے اس احساس کے بعد کہ جہاں زیب



حسن کے احساسات میں تبدیلی آرہی ہے۔ ان کے گھر جانا ہی چھوڑ دیا۔ بیالوجی، کیمسٹری اور ریاضی کی مشکل پڑھائی کی وجہ سے ٹیوشن اس کی مجبوری تھی۔ لہذا ضد کر کے اس نے قریبی ٹیوشن سینٹر جانا شروع کر دیا۔ جس کی جہاں زیب حسن نے بھرپور مخالفت کی تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ وہ خود جب بھی ویک اینڈ پر گھر آیا کریں گے انہیں پڑھا دیا کریں گے مگر روشنی اب ان سے جھجکنے لگی تھی لہذا اس نے زبردستی نمیرہ اور اس کے گھر کے باقی افراد کو اپنا ہم نوا بنا کر ٹیوشن سینٹر جوائن کر لیا۔

میٹرک کے سالانہ امتحان میں بھی وہ ان کی ہیلپ کرنے سے قاصر رہے تھے کیونکہ ان دنوں ان کی شروع کی پروازیں تھیں۔ تاہم ہفتے کے آخر پر جب وہ گھر آتے تو روشنی کی ان سے دعا سلام ہو جاتی۔

ان دنوں وہ اور نمیرہ فرسٹ ایئر میں تھیں جب اس کی پندرہویں سالگرہ آئی۔ پانچویں کلاس سے لے کر اب تک نمیرہ اسے سب سے پہلے وش کرتی تھی۔ اس روز شام میں اس کی کال آئی تو چند منٹ ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد اس نے روشنی کو بتا دیا کہ جہاں زیب لالہ اس سے اس کے موبائل پر

بات کرنا چاہتے ہیں۔ روشنی سمجھ تو گئی تھی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ تاہم اس نے نمیرہ کو بتا دیا تھا کہ وہ زیب لالہ سے بات کر لے گی۔

اباجی عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد رات کا کھانا کھاتے اور پھر چائے پی کر سونے کے لیے لیٹتے۔ لہذا روشنی جب تک انہیں چائے بنا کر نہ دے دیتی سونے کے لیے اپنے بستر پر نہیں آتی تھی۔

اس رات بھی اباجی کو کھانا دینے کے بعد وہ انہیں بتا کر کچن میں چلی آئی۔ غیر شعوری طور پر اسے جہاں زیب حسن کی کال کا انتظار تھا اور کچھ ہی انتظار کے بعد کال آ گئی۔

اس لمحے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔  
”ہیلو السلام علیکم۔“

جیسے ہی اس نے کال پک کی وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

”وعلیکم السلام۔“

دھیمے لہجے میں ہی سہی مگر اس نے خاصے اعتماد سے ان کے سلام کا جواب دیا تھا۔ تب ہی وہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولے تھے۔

”کیسی ہو...؟“

”ٹھیک ہوں الحمد للہ آپ کیسے ہیں؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم کون سا حال پوچھتی ہو آکر...“

آج ان کا لب و لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ روشنی چپ کی چپ رہ گئی۔ تب ہی وہ پھر سے بولے تھے۔

”روشنی ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی؟“

خطرے کی گھنٹی بالآخر بج اٹھی تھی۔ تاہم اس نے اب بھی اپنا اعتماد برقرار رکھا تھا۔

”نہیں۔ میں بھلا آپ کی بات کا برا مان سکتی ہوں۔“

وہ اس کے الفاظ پر دھیمے سے مسکراتے تھے پھر اپنے مخصوص لہجے میں دھیرے سے بولے۔

”اگر میں یہ کہوں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو تو...؟“

”تو کیا؟ میں تو سب کو اچھی لگتی ہوں۔“

اندر دھڑکنیں منتشر ہو گئی تھیں مگر لہجے میں کپکپاہٹ نہیں آئی تب ہی انہوں نے پھر پوچھا تھا۔

”اور اگر میں کہوں کہ تم مجھے بہت زیادہ اچھی لگتی ہو تو...“

”تو... تو کچھ نہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ کنفیوژ ہو رہی تھی جب وہ پھر سے بولے تھے۔

”اگر میں کہوں آئی لو یو سوچ تو...؟“

یہ آخری حد تھی جس کے بعد روشنی کو لگا اس کا دل دھڑکنے سے انکار کر دے گا۔ شاید تب ہی وہ چپ رہی تھی۔

”روشنی! آئی رہی لو یو...“

اس کی خاموشی پر ان کا دھیمہ لہجہ مزید گھمبیر ہوا تھا جب وہ بولی تھی۔

”ہاں... میں جانتی ہوں۔“

”واٹ... کب سے...؟“ انہیں خوشگوار حیرت کا احساس ہوا تھا۔



”نانتھ سے...“ کسی جرم کے اعتراف کی طرح اس نے حلق سے آواز نکالی تھی۔ جہاں زیب حسن کی خوشی کا اس لمحے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

”ریلی یو آر سویٹ گرل...“

ان کا بس نہ چلتا تھا کہ سیل فون سے نکل کر اسے چوم لیں۔ روشنی کا دل اب بھی دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

”رو شو! تمہارا برتھ ڈے قریب آ رہا ہے۔ کیا گفٹ لو گی؟“

اگلے ہی پل وہ پھر پوچھ رہے تھے۔ جواب میں روشنی نے سادگی سے کہہ دیا۔  
”آپ کا جو دل چاہے۔“ اور پھر اس کے بعد زندگی میں خوشیوں کی جیسے بہار آ گئی تھی۔

☆...☆...☆

ہوائیں دل دکھائیں گی

سنو پاگل...

کھڑے رہنے سے کیا حاصل

ہوا تو بس یہی ہو گا۔ ہوائیں دل دکھائیں گی

نگاہیں بھیگ جائیں گی

سنا ہے جو بھی مرضی سے چلا جائے

کبھی واپس نہیں آتا

وہ نیند سے بیدار ہوئی تو اس کی آنکھیں بے حد بوجھل ہو رہی تھیں۔

رات بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد بالآخر اسے خواب آور گولیاں پھانک کر ہی نیند آئی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ اب اس کی گولیوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنے ہی دن ہو گئے تھے اس نے ڈھنگ سے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔

باہر برف باری ہو رہی تھی۔ لہذا وہ کالج جانے کا خیال ملتوی کرتے ہوئے گرم گرم بستر میں دبکی بیٹھی رہی جب اچانک سارہ اس کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر گھس آئی۔

”السلام علیکم میم! آگئیں تم کیسی ہو؟“

تند ہواؤں سے مزاج والی وہ لڑکی اسے بے حد عزیز تھی۔ تب ہی اسے دیکھتے ہی وہ مسکرا اٹھی تھی۔

”فائن تم سناؤ۔ تمہارا کیا حال ہے۔“

”تمہارے بغیر کیا حال ہوتا۔ یہ پندرہ دن انگلیوں پر گن گن کر گزارے ہیں۔ تم تو وہاں جا کر مجھے بھول ہی گئی تھیں۔“

دھم سے بیڈ پر اس کے سامنے دھرنا دیتے ہوئے اس نے گلہ کیا تو شافیہ پھر مسکرا اٹھی۔

”تمہیں کوئی بھول سکتا ہے؟“

”ہاں۔ تم ہوناں۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔“

اس کے پٹ سے جواب دینے پر اس نے فوراً وضاحت کی تھی جب وہ بولی۔

”چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تمہارا گاؤں کا دورہ کیسا رہا؟“

”اچھا رہا۔ کافی چینیج ملا اس بار دیکھنے کو۔“

”گڈ۔ باقی گھر والے کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں الحمد للہ یمنی کے ساتھ کچھ پر اہلم چل رہی ہے۔ کسی لڑکے کا چکر ہے۔ بھائی نے کالج جانے پر پابندی لگا دی ہے۔“

”کیا...؟“ سارہ چونکی تھی تب ہی وہ بولی۔

”ہاں کوئی لڑکا تنگ کرتا ہے اسے۔ میرے بھتیجے نے دیکھ لیا۔ لڑکے کے ساتھ چھوٹی موٹی جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ بھائی کہہ رہے تھے ایک ماہ کے اندر اندر شادی کر دیں گے۔ مجھ سے بات کی تھی انہوں نے۔ میرا بھی وہی خیال ہے جو ان کا ہے۔“

”ہاں۔ تم تو ہو ہی ایسی۔ بے حس، پتھر دل۔“ اس بار سارہ نے جل کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ شافیہ کے لبوں پر پھر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”شافیہ! ہو سکتا ہے زیب بھائی نے شادی کر لی ہو اور اب ان کے دو تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہوں۔“

چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پھر ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا تھا۔  
جواب میں شافیہ کی نگاہوں کا رخ بدل گیا۔

”تمہیں یاد تو آتے ہوں گے وہ اور اگر کبھی اتفاق سے زندگی کے کسی موڑ پر سامنے آگئے تو پتہ نہیں تمہارا ردِ عمل کیا ہو گا لیکن... یہ ضروری تو نہیں شافیہ کہ اگر تمہیں اپنا پیار نہیں ملا تو تم دوسروں کے معاملے میں بھی بے حس سے کام لو۔“

وہ اسے پھر سمجھانا چاہتی تھی مگر اس بار شافیہ چپ نہ رہ سکی۔

”فار گاڈ سیک۔ بچوں جیسی سوچ کے حصار میں نہ رہا کرو۔ یہ اسکولوں، کالجوں، پارکوں اور سڑکوں میں کھڑے عاشق کبھی بھی کسی عورت کو محبت کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ عورت کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنی عزت اور اپنے گھر والوں کے اعتماد کی حفاظت کرے۔“

”اچھا... چاہے اس کے لیے اسے ساری زندگی خود کو سولی پر لٹکا کر جینا پڑے۔“

”ہاں۔“

”لیکن... زیب لالہ تو سڑک چھاپ عاشق نہیں تھے پھر ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا تم نے...؟“ بہت دنوں کے بعد آج پھر وہ اس کے دل کے زخم کھرچ رہی تھی۔ شافیہ نے ضبط کی انتہا سے گزرتے ہوئے سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

”ہاں۔ وہ اچھے تھے۔ بے حد اچھے۔ ان جیسا کوئی بھی نہیں مگر... میرے سامنے دو محبتیں ایک ساتھ آکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک طرف وہ تھے اور دوسری طرف میرے ابا جی اور بھائیوں کی محبت تھی۔ میں ابا جی کے بغیر نہیں جی سکتی تھی سارہ۔“

وہ کسی کے سامنے بہت کم روتی تھی مگر اس لمحے سارہ حسن کے سامنے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ چند لمحے یوں ہی خاموشی کی نذر ہو گئے جب اس نے پوچھا۔

”تمہیں کیا لگتا تھا شافیہ۔ اگر تم ان کا ساتھ دیتیں تو کیا ابا جی اور بھائی تمہیں معاف نہیں کر سکتے تھے۔“



”نہیں۔ میں جانتی تھی۔ اگر میں نے محبت کی انگلی تھام لی تو اپنے ابا جی کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤں گی اور میں... میں ان سے ایک دن بھی دور نہیں رہ سکتی تھی۔“

وہ اب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

سارہ حسن کے اندر اسے روتے ہوئے دیکھ کر جیسے پھر سے ڈھیروں دھواں بھر گیا تھا۔

☆...☆...☆

جہاں زیب حسن ان دنوں نیا نیا فضاؤں میں اڑنا سیکھ رہے تھے لہذا کراچی جانے سے قبل روشنی کی سالگرہ پر اسے بہت خوب صورت گولڈ کے ٹاپس گفٹ کرتے ہوئے انہوں نے تنہائی میں بہت محبت اور نرم لہجے میں اس سے فرمائش کی تھی۔

”رو شو! میں جاب پر جا رہا ہوں۔ تم مجھے روز میسج کیا کرو گی ناں؟“

”نہیں۔“

دل و جان سے ان پر فدا ہونے کے باوجود اس نے فوراً انکار کیا تھا، جب انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”کیوں؟“

”میسج بہت مہنگے پڑتے ہیں ناں، آپ تو جانتے ہی ہیں میرا نمبر پوسٹ پیڈ ہے۔ بھائی نے دیکھ لیا تو محبت مہنگی پڑ جائے گی۔“

پل دو پل کو سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے وضاحت پیش کی پھر فوراً سر جھکا لیا۔

”اوکے۔ خط تو لکھ سکتی ہو ناں؟“

”نہیں۔“

”کیوں...؟“ وہ پھر حیران ہوئے تھے جب وہ بولی۔

”مجھے خط لکھنا نہیں آتا۔“ کتنی معصومیت سے عذر پیش کیا تھا۔ جہاں زیب دھیمے سے مسکرا دیے۔

”تو کیا ہوا۔ میں ہوں ناں۔ میں تمہیں خط لکھنا سکھا دوں گا آؤ۔“

فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام کر وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل کے قریب بڑھ آئے تھے۔  
روشنی چپ چاپ ٹیبل پر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”یہ دیکھو“ یہ کاغذ ہے۔ اس پر تم یہاں رائٹ سائیڈ سے آغاز کرو گی اور ابتدا میں لکھو گی۔ جانِ روش جہاں زیب۔ میں یہاں بخیریت ہوں۔ آپ وہاں کیسے ہیں؟“

وہ ایک کے بعد ایک لائن لکھتے جا رہے تھے اور روشنی بہت غور سے ان کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کو ذہن میں بٹھاتی جا رہی تھی۔ کالج میں پہنچ کر بھی اس کی دُور جہاں زیب کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ وہ اسے جیسے چلاتے وہ چلتی جاتی، جو سکھاتے سیکھتی جاتی۔ ان کے سامنے اس کی اپنی نہ کوئی رضا تھی نہ خواہش۔ ایک طرح سے وہ پوری کی پوری ان کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ گئی تھی۔

اتنے شاندار مرد کی خود سے محبت پر وہ فخر کرتی نہ تھکتی تھی۔

آنے والے دنوں میں جیسے انہوں نے سکھایا تھا۔ وہ خط لکھ لکھ کر انہیں پوسٹ کرتی رہی اور وہاں سے جہاں زیب حسن کاغذ کے بے جان پرزوں پر جانے کیا کیا لکھ کر اسے جواب میں ارسال کرتے رہے۔

ان دنوں وہ فرسٹ ایئر کے امتحانوں سے فارغ ہوئی تھی جب وہ کراچی سے واپس آئے تھے۔ ان کی واپسی تک روشنی کا ان کے گھر میں قیام بہت بڑھ گیا تھا۔ جب وہ کراچی میں تھے تو دن میں کئی بار کالج ٹائم میں بھی اسے مَس کال کرتے رہتے۔ روشنی کی کلاس ہو رہی ہوتی تھی اور وائبریشن کے باوجود ان کی مَس کال آنے پر جب موبائل بجتا تو وہ گھور کر برابر میں بیٹھی نمیرہ کی طرف دیکھتی مگر وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی بے نیازی سے کام لے کر اس کا دل جلاتی پھر جب تک وہ ٹیچر سے نگاہ بچا کر انہیں جوابی مَس کال نہ دیتی تو وہ باز نہ آتے۔

اس بار جب وہ کراچی سے واپس آئے تو ایک چھوٹی سی بات پر دونوں کا جھگڑا ہو گیا تھا جو بڑھتے بڑھتے اس نہج تک آ گیا کہ جہاں زیب حسن نے شدید غصے میں آ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا تازہ خط پھاڑ دیا۔ روشنی

کو ان کی یہ حرکت اتنی بری لگی کہ اسی وقت جذبات میں اندھی ہوتے ہوئے اس نے اپنے بیگ کی اندرونی حفاظتی زپ سے ان کے تمام خطوط نکالے اور جوابی کارروائی کے طور پر اسی وقت ان کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

جہاں زیب حسن کے لیے اس کا یہ قدم نہ صرف ناقابل برداشت تھا بلکہ بے حد شاک پہنچانے والا بھی تھا۔ لہذا انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور شدید برہم ہوتے ہوئے رکھ کر ایک تھپڑ اس کے دائیں گال پر جما دیا۔ تھپڑ کی شدت اتنی تھی کہ وہ لڑکھڑا کر قریب پڑے صوفے پر جا گری تھی۔ اس نے دیکھا جہاں زیب حسن کی آنکھوں میں کرب، سرخی اور نمی کا طوفان ہلکورے لے رہا تھا۔ روشنی کو بعد میں خود بھی اپنے اس اقدام پر ساری زندگی افسوس رہا۔

اگلے دو روز تک اس نے جہاں زیب حسن سے ان کے ایکسیوز کے باوجود بھی موڈ بنائے رکھا جس کے بعد بہت مشکل سے منتیں کر کے اسے منانا پڑا۔ اب وہ روز رات میں

اپنے موبائل سے اسے دو تین گھنٹے کی کال کرتے اور وہ چھت پر ہواخوری کے بہانے ٹھہرتے ہوئے ان کے خمار میں ڈوبے معصوم جذبات کی کہانی سنتی رہتی۔

اب اس نے جہاں زیب کو ”آپ“ کے بجائے ”تم“ کہنا بھی شروع کر دیا تھا جو ان ہی کی فرمائش تھی۔ حالاں کہ دونوں کے بیچ کم از کم دس گیارہ سال کا فرق تھا۔ گھر والوں کے سامنے تاہم اب بھی وہ انہیں زیب لالہ کہہ کر ہی پکارتی تھی۔

دو تین ماہ کی فراغت کے بعد ان کا کالج پھر کھل گیا تھا۔

اس سال جہاں زیب کی سالگرہ پر اس نے انہیں بہت محبت کے ساتھ ایک عدد ٹی شرٹ اور ٹائی سیٹ گفٹ کیا تھا جس کے جواب میں مارچ میں جب اس کی سالگرہ آئی تو اس بار اس نے خود سالگرہ کے گفٹ کے لیے ان سے جیولری بکس مانگ لیا۔

جہاں زیب اس بار تھوڑی سی مشکل کا شکار ہوئے تھے کیونکہ روشنی کو اپنے لیے جو جیولری بکس چاہیے تھا وہ اس نے کسی ڈرامے کی ہیروئن کے پاس



دیکھا تھا اور مالیت کے لحاظ سے وہ خاصا مہنگا بھی تھا مگر اس کی قیمت جہاں زیب حسن کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی کیونکہ روشنی کے لبوں سے نکلی ہر فرمائش کو پورا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اسی لیے شہر بھر کی دکانیں چھان ماریں مگر پھر بھی کامیاب نہ ہوئے تو اس نے متعلقہ ڈرامے کا پوچھ کر اسپیشلی ٹی وی سینٹر سے اس ڈرامے کی سی ڈی حاصل کی اور پھر خود ڈرامے میں روشنی کا پسندیدہ جیولری بکس دیکھ کر اپنے کسی دوست کو فون کیا اور اسے بیرون ملک سے وہ گفٹ منگوا کر دیا۔

روشنی ان دنوں پریوں کی طرح ہواؤں میں اڑتی تھی۔ اس ایک شخص کی محبت نے اسے دنیا بھلا دی تھی۔

جہاں زیب ابھی اندرون ملک پروازیں چلا رہے تھے اور اپنی فیملی کو گھما بھی چکے تھے۔ اب ان کی خواہش روشنی کو سیر کروانے کی تھی جو کسی شرعی رشتے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ لہذا انہوں نے اس سے شادی کی ضد شروع کر دی۔ پچھلے کئی ماہ سے دونوں ایک دوسرے کی رضا پر جی رہے تھے۔ روزانہ جہاں زیب روشنی کو صبح صبح فون کر کے اس سے پوچھتے کہ آج وہ کون سے کپڑے

پہنیں اور روشنی ان کی پسند پوچھ کر پھر اسی رنگ کا لباس زیب تن کرتی۔ وہ انہیں کبھی کہتی کہ کلیں شیو رہیں، کبھی اسے ان کے چہرے پر مونچھیں اچھی لگ رہی ہوتیں۔ لہذا اس معاملے میں بھی وہ مکمل اس کی پسند کا خیال رکھتے تھے جواب میں روشنی ان کی فرمائش پر بال بڑھا رہی تھی کیونکہ انہیں لمبے بال پسند تھے۔

محبت کی یہ دلفریب سی کہانی بڑھتے بڑھتے اب اس موڑ تک آ پہنچی تھی کہ جہاں دونوں کے لیے ہی ایک دوسرے سے دور رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اگر جہاں زیب اس کے سوئی چھنا برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اسے بھی یہ گوارہ نہیں تھا کہ انہیں گرم ہوا کا جھونکا بھی چھو کر جائے۔

اکثر کالج سے واپسی پر وہ نمیرہ کے ساتھ اسی کے گھر چلی جاتی۔ گرمیوں کے دن ہوتے تھے۔ جہاں زیب حسن باہر سے آتے تو پسینے سے بے حال ہوتے۔ نمیرہ انہیں کمرے میں آتے دیکھ کر ان کے آرڈر کرتے ہی پانی لینے چلی جاتی اور تب روشنی اپنے نرم آنچل سے ان کا چہرہ پونچھنے کی کوشش کرتی تو وہ نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتے۔

”ہاتھ سے چہرہ صاف کرو ناں سبجی۔ دوپٹہ چبھتا ہے۔“

رومانس تو جیسے ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔

روشنی قدرے کنفیوژ ہو کر ہاتھ سے ہی ان کے چہرے پر آیا پسینہ صاف کرتی تو وہ بہت موڈ میں آ کر آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیتے۔

کتنے خوب صورت خواب تھے جو ان دنوں ان دونوں کی آنکھوں میں پل رہے تھے۔ کیسی کیسی معصوم خواہشیں اور حسرتیں ان کے سینوں میں سر اٹھا رہی تھیں۔

جہاں زیب حسن جتنے ضدی، غصیل اور شجاع تھے۔ روشنی اتنی ہی صلح جو، نرم مزاج اور ڈرپوک تھی جب ان کی غیر موجودگی میں خود اپنا سیکنڈ ایئر کا ایڈمیشن فارم بھرنے کے لیے اس نے اپنی اور نمیرہ کی ذات دیکھی تو اسی وقت وہ جان گئی تھی کہ اس کے گھر والے اسے کبھی بھی جہاں زیب کی نہیں ہونے دیں گے کیونکہ اس کا تعلق اچھی ذات سے تھا جب

کہ جہاں زیب حسن اور نمیرہ لوگوں کی ذات کو اس کی فیملی میں رشتے کے لیے زیادہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان دنوں اس نے اپنے دل سے جنگ کرتے ہوئے یہ طے کیا تھا کہ وہ اب جہاں زیب حسن سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی کیونکہ آپا کی طرح اپنے گھر والوں کو مشکل میں ڈالنا اسے کسی طور گوارہ نہیں تھا مگر... وہ اپنے دل سے جیت نہیں سکی تھی۔

ہر بار قدم نمیرہ کے ساتھ اس کے گھر کی طرف اٹھاتے ہوئے وہ یہی ارادہ کرتی کہ اس کے بعد دوبارہ کبھی اس طرف نہیں آئے گی مگر... ہر بار یہ ارادہ ریت کی بھر بھری دیوار کی مانند ڈھے جاتا۔ جہاں زیب حسن اب شادی کے لیے ضد کر رہے تھے۔

اس روز رات میں جب ان کی کال آئی تو انہوں نے سلام دعا کے بعد اس سے پوچھ لیا۔

”روشنی! ایک بات پوچھوں سچ سچ جواب دو گی؟“

”بالکل دوں گی۔ جھوٹ تو میں کبھی بولتی ہی نہیں۔“

اس کا موڈ ہر وقت فریش رہتا تھا۔

جہاں زیب حسن نے ایک پل خاموشی کے بعد پوچھ لیا۔

”روشو! میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“

سوال غیر متوقع تھا مگر وہ کنفیوژ نہیں ہوئی۔

”لو یہ بھی کوئی سوال ہے۔ آپ سب کو اچھے لگتے ہو تو مجھے بھی اچھے ہی لگو گے نا۔“

”میں سب کی نہیں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔“

وہ اس کے جواب سے چڑ گئے تھے۔ روشنی نہس پڑی۔

”او کے بابا! مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو۔ اتنے اچھے کہ بتا نہیں سکتی۔ ایک طرح سے یوں سمجھ لو کہ میری زندگی میں ایک آئیڈیل مرد کا جو سراپا ہے آپ اس پر فٹ آتے ہو۔“

”تھینکس۔“

انہوں نے آہستہ سے ہنس کر سکون کی سانس لی تھی جب اس نے پوچھ لیا۔

”خیریت تو ہے۔ اتنے عرصے کے بعد اس سوال کا خیال کیوں آ گیا آپ

کو...؟“

”بس یوں ہی۔ کل ماما کو بھیج رہا ہوں تمہارے گھر پرپوزل کے لیے۔ سوچا پہلے

دُہن کی رائے معلوم کر لوں کہیں بھرم میں ہی نہ مارے جائیں ہم...“

ان کا لہجہ شوخ تھا مگر روشنی کے لبوں کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔

”نہیں سائیں! ابھی ایسا کوئی قدم مت اٹھانا۔ میں اپنے گھر والوں کو جانتی ہوں۔

یہ لوگ کسی صورت تمہارا پرپوزل قبول نہیں کریں گے۔“

”کیوں نہیں کریں گے۔ اعجاز میرا یار ہے۔ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اباجی اور

فراز بھی میری تعریفیں کرتے نہیں تھکتے پھر ہم دونوں کے گھرانوں میں

کتنا پیار اور شناسائی ہے۔ کچھ چھپا ہوا تھوڑی ہے کسی سے۔ اباجی کو اپنی لاڈلی

کے لیے مجھ سے بہتر داماد نہیں مل سکتا۔“ وہ اب بھی لاپرواہی کے موڈ میں

تھے مگر روشنی کے اندر پھیلی بے قراری کم نہیں ہو سکی تھی۔

”نہیں جہاں زیب حسن! میں اپنے گھر والوں کو زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ پلیز

ابھی ایسا کوئی قدم مت اٹھائیے گا جو ہماری راہیں جدا کر دے۔ میں آپ کو

کسی طور کھونا نہیں چاہتی پلیز۔“ وہ رو پڑی تھی جب وہ ہنستے ہوئے بولے۔



”تم تو پاگل ہو۔ میں ہوں ناں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ تم کوئی ٹینشن مت لو پلیز۔“ اور پھر اس کے بعد انہوں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔

اپنے خوب صورت مستقبل کی پلاننگ میں وہ کچھ یوں مصروف ہوئے کہ روشنی مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہ پاسکی۔ تاہم اگلے روز صبح ہی صبح اس نے نمیرہ کو سختی سے کہہ دیا کہ وہ اپنے بھائی کو سمجھا دے فی الحال ان کے گھر والے اس کا پریپوزل لے کر نہ آئیں۔

نمیرہ نے اس روز انہیں جانے کیا کہہ کر روک دیا تھا۔ تاہم رات میں کال کے دوران انہوں نے پھر یہی راگ اپنا شروع کر دیا تو وہ ان کی منت کرتے کرتے تھک کر ناراض ہو گئی اور ناراضی کے اظہار کے طور پر دو تین روز کے لیے مستقل اپنا سیل ہی آف کر کے رکھ دیا۔ جس کے بعد جہاں زیب کا جو حال ہوا سو ہوا۔ خود اس کی اپنی جان بھی لبوں پر آ گئی تھی۔

وہ شخص کہ جس کی محبت اب لہو بن کر اس کے اندر گردش کر رہی تھی جس کے خواب اس کی زندگی کا سرمایہ بن گئے تھے۔ اسی شخص سے محض تین دن لا تعلق رہنا بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ چوتھے دن جب خود اس کی اپنی

بس ہو گئی تو وہ نمیرہ کی طرف آئی تھی۔ جہاں زیب حسن تیز بخار میں پھنک رہے تھے اور ان کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

روشنی کا دل انہیں دیکھ کر جیسے کٹ گیا تھا۔

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اس شخص کو اپنی پلکوں میں چھپا کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لے اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

وہ بار گئی اور ہمیشہ کی طرح جہاں زیب حسن کی ضد جیت گئی تھی۔

اس روز صبح سے ہی اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ کالج میں بھی کسی کلاس میں اس کا دل نہیں لگا۔ چھٹی کے بعد وہ اپنے روٹ کی وین میں گھر واپس آئی تو ایک نئی آزمائش اس کی منتظر کھڑی تھی۔ گھر کے گیٹ کے قریب ہی اس کا بھتیجا اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ گیٹ کو لاک لگا دیکھ کر اچھی خاصی حیران ہوئی تھی۔

”سبحان! خیر تو ہے۔ یہاں لاک کیوں لگا ہے؟“ وین سے اتر کر اپنے بھتیجے کے قریب آتے ہی اس نے حیرانی سے پوچھا تھا جب وہ بولا۔

”بڑی پھوپھو کی طرف چلو۔ میں یہاں کھڑا تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

اس سے عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے وہ اس کا احترام ایسے ہی کرتا تھا۔  
روشنی کو اس کے جواب سے اچھی خاصی حیرانی ہوئی تھی۔

”واٹ... لیکن کیوں...؟“

اس کا دل تو کھٹک گیا تھا مگر پھر بھی پوچھ بیٹھی تھی تب ہی وہ بولا۔  
”تم چلو تو۔ راستے میں سب بتاتا ہوں۔“

اور پھر بائیک ڈرائیو کرتے ہوئے راستے میں اس نے روشنی کو بتایا کہ نمیرہ  
کے گھر والے اس کو پروپوز کرنے آئے تھے۔ اباجی کے صاف انکار کے بعد  
جب نمیرہ کی ممانے ان سے یہ کہا کہ روشنی بھی ان کے بیٹے کو پسند کرتی  
ہے تو وہ بات سمیٹ کر سب کو بڑی بیٹی کے گھر لے گئے تاکہ وہاں کوئی  
بہتر فیصلہ کر سکیں۔ روشنی کو اپنی جان ان چند گھڑیوں میں سولی پر لٹکی ہوئی  
محسوس ہو رہی تھی۔

☆...☆...☆

سنو دسمبر اسے پکار دو

اسے ملا دو اسے بلا دو

اب اس سے پہلے کہ سانس نکلے  
اب اس سے پہلے کہ سال گزرے

وہی لکیریں، وہی ستارے

میری لکیروں میں قید کر دو

یہ آخری شب کے آخری پل، کوئی بڑا اختتام کر دو

یہ زندگی بھی تمام کر دو

سنو دسمبر... اسے ملا دو

بارش بہت زوروں کی برس رہی تھی اور وہ کھڑکی میں کھڑی عجیب خالی خالی  
سی نگاہوں سے بھینگتے ہوئے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب سارہ گرم گرم  
چائے کے دو کپ لیے کمرے میں چلی آئی۔

”لو جانم! گرما گرم چائے کے دو کپ حاضر ہیں۔ ایک کپ آپ کے لیے اور

ایک ہمارے لیے۔“ اس کے قریب رکتے ہوئے اس نے کھلی ہوئی کھڑکی

کے دونوں پٹ بند کیے۔ تب تک شافیہ پلٹ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔

”تھینکس۔ تم کتنی اچھی ہو۔ بنا کہے ہی بندے کے دل کی بات جان لیتی ہو۔“

اسے واقعی اس وقت چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ سارہ نے دل کٹی سے مسکراتے ہوئے اپنے حصے کا کپ اٹھالیا۔

”دیکھو پھر تمہارے دل کی ہر بات تو میں بنا کہے ہی جان لیتی ہوں پھر بھی تم قدر نہیں کرتیں۔“

”خدا کا نام لو سارہ۔ صبح و شام قصیدے پڑھتی رہتی ہوں تمہارے۔ اب بھی قدر نہیں کرتی تو خدا ہی تمہارا حافظ ہے۔“

وہ مسکرائی تھی۔ سارہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

آج تو یہ بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ میرا بیٹا بے چارا راہ دیکھ رہا ہو گا میری۔“ اگلا سب لیتے ہوئے اس نے کھڑکی سے باہر مزید تیز ہوتی بارش کو دیکھا تھا۔

”ہاہ... کبھی یہ بارش مجھے بہت پسند ہوتی تھی۔ اب تو زہر لگتی ہے۔“

اپنے حصے کا کپ اٹھاتے ہوئے شافیہ نے لب کھولے تھے۔ سارہ نے اپنی توجہ پھر اس پر مرکوز کر دی۔

”صحیح کہتی ہو۔ ان موسموں کا حسن تو ہمارے اندر کی دنیا کے موسموں سے ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں شاعر کہ دل کا موسم اچھا ہو تو سارے موسم اچھے ہیں۔ کاش مجھے ایک بار مل جائے تیرا ہیرو پھر دیکھنا وہ کھری کھری سناؤں گی کہ اس کی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔“

اس بار اس کے الفاظ پر پھر ایک زخمی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔

”شافیہ پتہ ہے۔ پرسوں کیا ہوا؟“

اچانک کچھ یاد آنے پر اس نے بات کا رخ بدلا تھا۔ شافیہ توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”نہیں کیا ہوا؟“

”بہت بُرا ہوا۔ پرسوں میری موجودگی میں دو ڈیڈ باڈیز ہو سپٹل لائی گئی تھیں۔“

ایک نوجوان لڑکے کی تھی اور دوسری لڑکی کی۔ کسی گاؤں سے منسلک کہانی تھی۔ لڑکا تو یہیں شہر کا تھا۔ اپنا جنرل اسٹور تھا۔ گھر وہیں گاؤں میں ہو گا۔

پچھلے پانچ سال سے خفیہ محبت چل رہی تھی۔ لڑکی اتنی خوب صورت تھی شافیہ



کہ دیکھ کر اس کے حسن اور صحت پر رشک آ رہا تھا۔ ماں باپ نے وٹے سٹے میں ایک عمر رسیدہ شخص سے رشتہ کر دیا۔ جواب میں ہر طرح کی کوشش کے بعد مایوس ہو کر دل برداشتہ ہوتے ہوئے لڑکی نے زہر پی لیا اور لڑکے کو خبر ہوئی تو اس نے بھی اسی وقت اسپرے پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ ایک کھرام بپا تھا پرسوں وارڈ میں۔ کتنے افسوس کی بات ہے شافیہ۔ زمانہ اتنی ترقی کر گیا ہے۔ جانوروں تک کے

حقوق پر تنظیمیں بن رہی ہیں مگر... عورت کی زندگی اب بھی ویسی کی ویسی ہی ہے۔ بے زبان گائے جیسی۔“

”سب گھروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسپیشلی بڑے گھرانوں میں۔“

شافیہ نے اس کی روداد سن کر اپنی رائے دی۔ سارہ تلخی سے مسکرا دی۔

”خوش فہمی ہے تمہاری۔ بہر حال میں جا رہی ہوں اب۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔

خوش رہنا شروع کر دو۔ ماضی پر مٹی ڈالو اور مستقبل کا سوچو پلیز۔“

چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ہاتھ ہلاتی روم سے باہر نکل گئی۔

اگلے روز شافیہ ڈیوٹی پر حاضر تھی۔

اس کی تمام کلاسز کے اسٹوڈنٹس اسے بری طرح مس کر رہے تھے۔

وہاں کالج میں محبتوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جیسے اس کا منتظر تھا۔

پورے کالج میں وہ سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر دل عزیز استاد کی حیثیت

سے مقبول تھی۔ دوسرے نمبر پر سریزمان سیال تھے، جو ابھی کچھ ہی ماہ قبل

اپنی تعلیم مکمل کر کے وہاں لیکچرار مقرر ہوئے تھے۔ شافیہ کی ان سے اچھی

سلام دعا تھی۔ ایک چیز جو اسے بہت اڑیکٹ کرتی تھی۔ وہ ان کے سراپے

میں اس کے محبوب کا عکس تھا۔ ان کی ڈریسنگ، بولنے کا انداز، بالوں کا اسٹائل

سب حیرت انگیز طور پر اس شخص سے بہت میچ کرتا تھا جو اس کے اندر ہی

کھپیں بس گیا تھا۔

شاید یہ اس کا بے اختیاری میں اسے کبھی کبھار محو ہو کر دیکھنے کا سبب ہی تھا

کہ وہ اس کی طرف دل و جان سے مائل ہو گئے تھے۔ شافیہ کے فرشتوں کو بھی

علم نہیں تھا مگر وہ چپکے چپکے اپنے دل کو اس کی تمنا کی آہٹوں پر دھڑکنے لگا۔  
سکھا رہے تھے۔

اس روز کالج سے واپسی پر بہت عجیب ہوا۔

وہ ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہی تھی کہ اچانک کسی نے اسے پکار لیا۔

”ایسکیوز می۔“

وہ چونکی تھی اور فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

☆...☆...☆

جس وقت اس نے آپاجی کے گھر میں قدم رکھا۔ وہاں اس کی اور جہاں زیب کی پوری فیملی اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی چھوٹے لالہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور اس کا بازو تھام کر اسے آگے لے آئے۔

”روشنی! یہ جہاں زیب کے گھر والے تمہارا رشتہ لے کر آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم جہاں زیب کو پسند کرتی ہو۔ اس لیے یہ رشتہ ڈالا ہے انہوں نے۔ سچ بتاؤ کیا یہ سچ ہے؟ کیا واقعی تم یہ رشتہ کرنا چاہتی ہو...؟“  
وہ جس طوفان سے بچنا چاہتی تھی وہ بالآخر آ ہی گیا تھا۔  
اس لمحے سرسری سی ایک نظر اٹھا کر اس نے اپنے سامنے جہاں زیب کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ کیا نہیں تھا ان آنکھوں میں...؟  
وہ فوراً نگاہ پھیر گئی۔

اس لمحے شدت سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کہہ دے۔

”ہاں۔ سامنے بیٹھا یہ شخص میری زندگی ہے۔ میری تمناؤں‘ میرے خوابوں کا محور ہے۔ اس کے بغیر ایک لمحے کو جینا بھی گوارا نہیں مجھے۔ میں نہیں جانتی کسی ذات پات

کو... کسی شرم و حیا کو...“ مگر وہ کہہ نہیں سکی۔ اس کی مشرقیت اس پر غالب آ چکی تھی۔

جہاں زیب حسن کے بعد پھر آہستہ سے سر اٹھا کر اس نے اباجی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

روشنی نے دیکھا وہی برسوں پہلے والا منظر ہے۔ جس میں آپا جان کی محبت کا معاملہ اباجی کی عدالت میں پیش ہوا تھا اور انہوں نے بڑے فخر سے وقار بھائی کی فیملی کو کہا تھا کہ ان کی بیٹی کوئی غلط سوچ نہیں رکھتی مگر... جب آپا نے اپنی محبت کا ساتھ دے کر انہیں شکست سے ہمکنار کیا تو وہ کیسے ٹوٹ پھوٹ سے گئے تھے۔

پہلا اٹیک بھی ہوا تھا ان پر...

وہ ابھی تک اس درد اور سک کے حصار سے باہر نہیں آ سکی تھی۔ ابھی تک وہ اسی امتحان سے تو ڈرتی آئی تھی۔ آپا جی کی طرح اس کے سامنے بھی ایک طرف محبت اور شاندار مستقبل تھا تو دوسری طرف وہ رشتے تھے جو اس کی روح سے جڑے تھے، جن سے دور ہو کر جینا اسے ایک دن کے لیے بھی گوارا نہیں تھا۔

اباجی بڑے لالہ، چھوٹے لالہ سب پر باری باری ایک نگاہ ڈالنے کے بعد وہ جیسے ہار گئی تھی۔

فیصلے کی وہ گھڑی کتنی کٹھن تھی۔ اسے معلوم تھا۔ اگر آپا جی کی طرح وہ بھی اپنی محبت کے حق میں فیصلہ دیتی ہے تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اباجی خاموشی سے اس کا نکاح زیب حسن سے پڑھا کر اسے گھر سے رخصت کر دیں گے مگر... بدلے میں وہ زندگی بھر کے لیے ان کی صورت دیکھنے کو ترس جائے گی اور یہی تو اسے گوارا نہیں تھا۔

اب اس کی ماں بھی سامنے نہیں تھی جو اس کا ساتھ دیتی، اسے سمجھ سکتی۔ لہذا اس بار اس نے برسوں پہلے کے منظر کو بدل ڈالا۔

صرف ایک لمحہ لگا تھا اسے اپنی روح کے گلے پر چھری چلانے میں اور اس ایک لمحے میں اس نے اپنے خوابوں، ارمانوں، تمنائوں کو اپنے باپ اور بھائیوں کی عزت پر قربان کر دیا۔

”نہیں... میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ میں وہی کروں گی جو میرے اباجی کہیں گے۔“



صرف ایک لمحے میں اس نے خود اپنی محبت کا تاج محل زمین بوس کر دیا تھا۔ جہاں زیب حسن اس درجہ بے وفائی پر تڑپ اٹھے تھے۔

”روشنی! جو سچ ہے وہ کہو۔ ڈر کس بات کا ہے؟ میں ہوں ناں...“ سب کے سامنے اس کا بازو تھامتے ہوئے وہ مچلے تھے مگر اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا۔

”میں آپ کو نہیں جانتی۔ میرے لیے میرے ابا جی اور بھائی کی عزت ہی سب کچھ ہے۔“

”واٹ...؟“

انہیں دھچکا لگا تھا۔ بھری محفل میں دو کوڑی کی حیثیت بھی نہیں رہی تھی ان کی۔ چھوٹے لالہ روشنی کے جواب پر بڑے فخر سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھے تھے۔

”بس... سن لیا جواب۔ میں نے کہا تھا ناں۔ میری بہن ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ شرم آنی چاہیے تمہیں، میری معصوم بہن پر اتنا بڑا بہتان لگاتے ہوئے۔“

”نہیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے ڈر رہی ہے تم سب سے۔ روشنی اس سے کہو کہ تم جھوٹ بول رہی ہو پلیز...“

کتنا ذلیل کر دیتی ہے محبت انسان کو۔ اس کے اندر جیسے ڈھیروں آنسو جمع ہو گئے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی اور ادھر چھوٹے لالہ، بڑے لالہ اور اس کے نوجوان بھتیجے، بھانجے سب جہاں زیب حسن پر ٹوٹ پڑے تھے۔ کوئی انہیں تھپڑ رسید کر رہا تھا تو کوئی گھونسنے مگر... وہ اس تکلیف سے بے نیاز ساکت ہوئے بس روشنی کو ہی دیکھ رہے تھے، جس نے ان کے خوابوں کے سفر میں آخری سانس تک ان کا ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔

کیسے کیسے پیمان نہیں کیے تھے اس نے...

ان کی آنکھوں میں اس وقت جیسے دھول اڑ رہی تھی اور روشنی بالکل سامنے کھڑی انہیں اپنے بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے ہاتھوں پٹتے ہوئے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

”محبت کب سمجھتی ہے...؟“

محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی دشت وحشت ہے

جو خوابوں سے بھری آنکھوں کو جانے کب کہاں جھنجھوڑ ڈالے گا  
 محبت کب سمجھتی ہے کہ یہ جو سانپ سا اندر ہی اندر ہانپتا ہے سانس لیتا ہے  
 نجانے کب کہاں، یہ کون سی معصوم خواہش کو  
 یونہی جھنجھوڑ ڈالے گا

محبت کب سمجھتی ہے کہ جو شفاف رستے ہیں  
 در منزل پہ رکتے ہیں، تمھن کا تحفہ نہیں دیں گے  
 کہیں بھٹکا نہیں دیں گے  
 محبت کب سمجھتی ہے کہ ان شفاف رستوں سے  
 کوئی دکھ درد کی جانب اسے نہ موڑ ڈالے گا  
 محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی توڑ ڈالے گا!  
 موسم خاصا بر آلود ہو رہا تھا۔

دور آسمان پر اڑتی کونجوں کی ڈار اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب رواں دواں  
 تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی میں بھیگتی، وہ کالج سے نکل کر روڈ پر آئی ہی تھی

جب شاہ زر سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا، اور اب اس کی پکار پر پلٹ کر وہ خاصی  
 الجھن آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
 ”السلام علیکم!“ مقابل نے اسے خاصی سنجیدہ نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر  
 فوراً سلام جھاڑا تھا۔

”وعلیکم السلام“ فرمائیے۔۔۔“ اس کے لہجے میں اب بھی پہنچائی تھی۔  
 نوجوان کو اپنا مدعا بیان کرنا دشوار ہو گیا۔

”سر راہ روکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر مجھے آپ سے بہت ضروری  
 بات کرنی تھی۔“ رف سے حلیے میں ہلکی ہلکی شیو بڑھائے وہ جو کوئی بھی تھا،  
 خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”اوکے، اپنا نمبر دے دیجئے، میں گھر پہنچ کر آپ کو کال کر لوں گی۔“  
 سر راہ رک کر کسی اجنبی مرد سے بات کرنا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا  
 تھا۔

”اوکے، تھینک یو سو مچ۔۔۔“ مقابل کھڑا نوجوان اتنی سی عنایت پر ہی خوش  
 ہو گیا تھا۔ وہ گھر پہنچی تو تمھن سے اس کا برا حال تھا۔

آج سارہ اس سے پہلے گھر پہنچ گئی تھی اور اب یمنی کے ساتھ بیٹھ کر، لان میں جاتی ہوئی دھوپ کا لطف سمیٹتی، کینو چھیل چھیل کر کھا رہی تھی۔

یمنی کو پچھلی رات سحان اس کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ اس سے پہلے شام میں ریاض لالہ کی کال آئی تھی، اس کے سیل پر، جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ وہ یمنی کی جلد از جلد شادی کی تیاری کر رہے ہیں، تاہم جب تک بات پکی نہیں ہو جاتی وہ اسے اپنے پاس رکھے، کیونکہ ان کے خیال میں اس کے پاس وہ محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں اپنی پوری خدمات کا یقین دلایا تھا۔ جواب میں یمنی کا موڈ اب بھی اس سے بنا ہوا تھا۔

اس وقت بھی وہ ان کے پاس لان میں آکر بیٹھی تو یمنی نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

”آگئیں تم، آج کچھ لیٹ نہیں ہو گئیں؟“ سارہ نے ہی اس سے پوچھا تھا۔ وہ خود کو کرسی پر بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں گرا کر بیٹھ گئی۔

”ہاں یار، کچھ اضافی کام آپڑا تھا، پھر کالج سے باہر نکل ہی رہی تھی کہ کسی لڑکے نے پکار لیا، کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، میں نے نمبر لے لیا۔“

چلو، یہ اچھا کیا، تم بھی شافی، ایک دم پاگل ہو، ہو گا کوئی سڑک چھاپ عاشق، نمبر کیوں لیا اس کا...؟“ وہ اب ایک اور کینو چھیل رہی تھی۔

یمنی کی پیشانی پر پڑی سلوٹیں گہری ہو گئیں، تاہم وہ اب بھی خاموش ہی رہی تھی۔

”نہیں یار، ایسی بات نہیں ہے، کافی پریشان تھا بیچارہ، شام میں بات کروں گی تو پتہ چل جائے گا۔“

”تو پھر شام میں کیوں ابھی کر لو، شام پتہ نہیں کب آئے گی؟“ سارہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ شافیہ نے سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے سکون سے پلکیں موند لیں۔



”شافی تم یمنی کے ساتھ بہت زیادتی کر رہی ہو؟“ کچھ ہی لمحوں کے بعد پھر سارہ کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ جواب میں اس نے فوراً آنکھیں کھول لیں۔

”کیوں... میں نے کیا کیا ہے؟“ اسے واقعی حیرانی ہوئی تھی۔ جب وہ بولی۔

”بہت کچھ کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے بھائی اور بہنیں تمہاری ذات اور بات کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اگر تم یمنی کی وکالت کرو تو اس کی شادی شاہ زر کے ساتھ ہو سکتی ہے مگر تم ایسا نہیں چاہ رہیں۔ الٹا اپنے بھائی کا ساتھ دے رہی ہو۔ یہ تو زیادتی ہے یار جو اپنے دل پر چوٹ سہہ چکا ہو وہ کسی دوسرے کو کیسے تکلیف میں دیکھ سکتا ہے؟“ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کے آنے سے قبل یمنی سارہ سے ساری باتیں شیئر کر چکی ہوگی۔ تبھی گہری سانس بھرتے ہوئے بولی تھی۔

”یمنی میری نہیں ریاض لالہ کی بیٹی ہے سارہ اور وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں مجھ سے زیادہ بہتر جان سکتے ہیں۔ جہاں تک مدد کی بات ہے تو تم بھی جانتی ہو ہمارے ہاں غیر ذات میں بیٹی نہیں دی جاتی اور یہ اب کی نہیں

بہت پہلے کی روایت ہے پھر میں کیوں فضول میں اس بات کو ایشو بناؤں جو ممکن ہی نہیں ہے۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے تمہارے بھانجے نے غیر ذات کی لڑکی سے شادی نہیں کی...؟“

”وہ لڑکا ہے، کر سکتا ہے۔“

”ہاں ساری بندشیں تو بیچاری عورت ذات کے لیے ہیں ناں۔“ سارہ اس کے جواب پر جلی تھی، جب وہ بیزار کن لہجے میں بولی۔

”زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے سارہ! والدین کبھی اپنے بچوں کا برا نہیں چاہتے۔ ریاض لالہ بھی یمنی کے لیے کوئی بہترین لڑکا ہی ڈھونڈیں گے۔ تمہیں کیا پتہ، وہ کتنا پیار کرتے ہیں اس سے اور پھر میرا نہیں خیال کہ یہ شاہ زر میں زیادہ انٹرسٹڈ ہو۔ میرے علم میں اس کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں آئی ہے۔“

”یمنی صحیح کہتی ہے، تم واقعی بہت بے حس ہو، اسٹوپڈ۔ ساری بات دل کی ہوتی ہے اگر انسان کا دل ہی مرجائے تو چاہے لاکھ بہترین چیزیں عطا کر دی

جائیں، لبوں پر سچی مسکراہٹوں کے پھول نہیں کھلتے۔“ اپنی دانست میں اس نے بڑی گہری بات کی تھی۔ شافیہ چپ کی چپ رہ گئی۔ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی وہ، زندگی کی تمام تر خوبصورتی کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے اگر دل ہی مرجائے تو پھر کیسی زندگی، کہاں کی زندگی...؟“ اس کے لیے بھی تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

وہ شخص، جس کے ہوتے ہوئے اس کی سانسوں پر بھی پہرے بٹھادیے گئے تھے۔ اب وہ نہیں تھا تو وہ آزاد تھی، کیا کچھ حاصل نہیں تھا اسے۔ عزت، لیاقت، بھروسہ، وقار، اعتماد اور آزادی... مگر اب اس آزادی میں بھی اس کا دم گھٹتا تھا، یہ دنیا اب اس کے کام کی نہیں رہی تھی۔ کتنی بڑی قربانی دینا پڑی تھی اسے، یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے مگر وہاں اس کے اندر کا درد سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

محبت کے ہاتھوں شدید خواری کے بعد نہ صرف جہاں زیب بلکہ نمیرہ بھی اس سے سخت خفا ہو گئی۔ اور ادھر جیسے اس کی جان سولی پر لٹک گئی تھی۔ بھری محفل میں باپ

بھائیوں کی عزت کا شملہ اونچا رکھنے کے لیے وہ اس ”زندگی“ جیسے شخص کی محبت سے منکر تو ہو گئی تھی مگر یہ کیسا امتحان تھا کہ اس قربانی کے بعد وہ خود اپنے ہی گھر والوں کے لیے ”خصوصی توجہ“ کا مرکز بن کر رہ گئی تھی۔ وہ کب سوتی ہے، کب جاگتی ہے، کس سے بات کرتی ہے، کس سے ملتی ہے، اس کو بھرپور ٹیلی کیا جانے لگا تھا۔ نمیرہ کے گھر جانے سے اسے سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف جہاں زیب حسن اس کی کال پک نہیں کر رہا تھا۔

تھرڈ ایئر کے امتحانات بھی قریب آرہے تھے مگر اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ابا جی اور بڑے لالہ اپنی طرف سے مطمئن تھے۔ انہیں گمان ہی نہیں سو فیصد یقین بھی تھا کہ ان کی روشنی اس معاملے میں کسی طور سے ملوث نہیں، لہذا سارہ قصور جہاں زیب حسن کا ہی ہے۔ روشنی کی خاموشی اور جبر کی مسکراہٹ نے ان کے اس یقین کو مزید پختہ کیا تھا۔

بڑے لالہ کی منگنی تو ہو چکی تھی، ابا جی اس ٹینشن کو بھلانے کے لیے ان کی شادی کی تیاری کرنا چاہ رہے تھے، کیونکہ اب کراچی میں وہ اپنی مستقل جاب سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔

اس روز رات میں خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے روشنی کا رابطہ جہاں زیب حسن سے ہوا تھا جو اس کی طرف سے شدید ہرٹ ہو کر غم و غصے کا شکار تھے۔ کتنی مشکل سے کال پک کی تھی انہوں نے اس کی!

روشنی ان کی آواز سنتے ہی رو پڑی تھی۔ جب وہ رکھائی سے بولے۔

”اب کیوں رو رہی ہو۔ سارہ کیا دھرا تو تمہارا ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہئے، تمہاری وجہ سے تمہارے باپ بھائیوں کی عزت اور بڑھ گئی۔“

وہ ان کا دکھ اور غصہ سمجھ سکتی تھی، تبھی نم لہجے میں بولی۔

”میں آپ سے معذرت خواہ ہوں زیب! میں نے کہا تھا ناں، یہ سب ہو گا کتنا منع کیا تھا میں نے آپ کو، کتنا سمجھایا تھا مگر آپ نے میری ایک نہیں مانی۔ میں کس، کنوئیں میں پڑوں جا کر ایک طرف اگر آپ ہیں تو دوسری طرف میرے ابا جی ہیں زیب! میں آپ دونوں کے بغیر نہیں جی سکتی...“

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

جہاں زیب حسن کا غصہ کم پڑ گیا۔

”پھر اب کیا سوچا ہے تم نے؟ کیا تم میرے بغیر کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکو گی روشنی؟“

”نہیں۔“ اس نے مچل کر جواب دیا تھا۔

”میرے لیے آپ کو کھو کر جینا موت کے مترادف ہے زیب! مگر آپ ٹینشن مت لیں۔ میں جانتی ہوں میرے ابا جی اور بڑے لالہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، آج تک کبھی انہوں نے میری کوئی فرمائش نہیں ٹالی۔ مجھے یقین ہے میں اپنے ابا جی سے خود آپ کے بارے میں بات کروں گی تو انہیں میرا



رشتہ آپ سے جوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس تھوڑا سا ٹائم دیں مجھے، پلیز۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ اب یہ اونٹ کسی بات پر ہی کروٹ بیٹھے گا، میں اب چین سے بیٹھنے والا نہیں ہوں۔“ ضد اور غصہ تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

روشنی پھر بے بسی سے ان کی منت کرتی رہ گئی۔ اس روز ڈیڑھ گھنٹے کی طویل گفتگو کے بعد وہ ان کا موڈ بحال کرنے میں تو کامیاب ہو گئی تھی، تاہم لاکھ کوشش کے باوجود انہیں ان کے ارادوں سے باز نہ رکھ سکی۔

اس روز پھر اس کی طبیعت خاصی بگڑ گئی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی مگر اسے قرار نہیں تھا۔

پانی پی پی کر اس نے کمرے میں پڑا پورا جگ خالی کر دیا لیکن دل کی بے چینی اور اضطراب کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

دور آسمان پر جگمگاتے ستاروں میں بھی، اب اس کی دلچسپی پہلے سی نہیں رہی تھی۔ دنیا میں اب اس کے لیے جیسے باقی کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ بستر پر کروٹیں

بدل بدل کر تھک گئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر میں شدید تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ سانس بھی سینے میں اٹک اٹک کر آرہی تھی۔

وہ ابھی نیند کی گولیاں پھانکنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے سیل پر چھوٹے لالہ کی کال آگئی، جسے اس نے فوراً ہاتھ سیل کی طرف بڑھا کر پک کر لیا۔

”جی لالہ، السلام علیکم۔۔۔“

”وعلیکم السلام، ابھی تک جاگ رہی ہو۔۔۔؟“

”نہیں، وہ نیند نہیں آرہی تھی۔۔۔“ ان کے اچانک سوال پر گڑبڑا کر اس نے ٹائم دیکھا جہاں گھڑی ساڑھے تین کا الارم بج رہی تھی اور یہ تو اب اس کا روز کا معمول بن چکا تھا۔ جس سے کوئی اور ہوتا مگر چھوٹے لالہ ضرور آگاہ تھے۔

”آج پھر کوئی ٹینشن لی ہوگی ناں تم نے۔۔۔؟“ اگلے ہی پل وہ پھر اس سے پوچھ رہے تھے مگر اس وقت تک وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

”نہیں، کوئی ٹینشن نہیں لی، بس اباجی کی یاد آرہی تھی۔“

اس کے جواب پر چھوٹے لالہ بھی ایک پل کو خاموش رہ گئے تھے۔

”شافو! میں پاکستان واپس آرہا ہوں۔“ ایک پل کی خاموشی کے بعد انہوں نے کتنی بڑی خبر سنائی تھی۔ وہ خوش ہو گئی۔

”ریلی...؟“

”ہاں... کل تک پروگرام فائنل ہو جائے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے، ریاض لالہ، اور بجو وغیرہ کو اطلاع کر دی آپ نے کہ نہیں۔“

اعصابی دباؤ کچھ لمحوں کے لیے کم ہوا تھا۔ جب انہوں نے بتایا۔

”ہاں، باقی سب سے بات ہو گئی ہے، تم اب سو جاؤ، صبح نماز کے لیے بھی اٹھنا ہو گا۔“ عادت کے عین مطابق اسے تنبیہ کرتے وہ کال ڈس کنکٹ کر گئے تھے۔

شافیہ نے جی ”اچھا“ کہہ کر موبائل آف کیا، پھر ہاتھ بڑھا کر قریبی ٹیبل پر پڑی، نیند کی گولیوں کی بوتل اٹھائی اور اکٹھی دو گولیاں ایک ساتھ نگل کر، سر تکتے پر ٹکادیا۔

اگلے روز اس کی آنکھ خاصی تاخیر سے کھلی تھی، لہذا کالج جانے کا پروگرام ملتوی کرتے ہوئے وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔

رات میں دیر سے سونے کی وجہ سے سر اس وقت بھی بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ فون کر کے میڈم کو طبیعت کی خرابی کا بتا کر اس نے اپنی مکمل توجہ ٹی وی کی جانب مبذول کر لی تھی۔ جہاں خواتین کے حقوق اور آزادی پر مبنی کوئی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ جس میں پسند کی شادی کرنے کے جرم میں ایک بھائی نے اپنی بہن اور اس کے شوہر کو نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

وہ ابھی پروگرام دیکھ رہی تھی کہ سارہ چلی آئی۔

”شافی! تم آج کالج کیوں نہیں گئیں؟“

آج کل اس کی نائٹ ڈیوٹی چل رہی تھی، لہذا دن میں وہ گھر پر ہی ہوتی تھی۔

”یس یونہی یار، سر بہت بوجھل ہو رہا تھا، ٹائم پر آنکھ ہی نہیں کھلی۔“

”کیسے کھل سکتی ہے، رات میں جو اتنی اتنی گولیاں پھانک کر سوتی ہو، وہ اپنا اثر تو دکھائیں گی ناں۔“

وہ جلی تھی، شافیہ اس کے الفاظ پر کھل کر مسکرا دی۔

”روز تو گولیاں نہیں پھانکتی، رات طبیعت خراب ہو رہی تھی اس لیے مجبوراً لینا پڑیں۔“

”بس رہنے دو، بہت اچھی طرح جان گئی ہوں میں تمہیں، یہ ہنس نہس کر کسی اور کو مطمئن کرنا، میں کرتی ہوں بجو سے بات اور کہتی ہوں انہیں کہ جلد سے جلد تمہاری شادی کا بندوبست کریں۔“

وہ جانتی تھی کہ کل اس کی باتوں کی وجہ سے وہ ہرٹ ہوئی تھی لہذا اب ازالے کی کوشش کر رہی تھی۔ شافیہ اس کے الفاظ پر بے ساختہ ہنس پڑی۔

”ہاں یہ نیکی ضرور کرو، پتہ نہیں کب ملک کے حالات بگڑ جائیں۔“ ہنس نہس کر خود کو فریب دیتی کتنی اچھی لگتی تھی۔ وہ۔

”خدا ہمیشہ تمہیں یونہی ہنستا مسکراتا رکھے میری دوست۔“ من ہی من میں اسے دل کی گہرائیوں سے دعا دیتے ہوئے وہ خود بھی مسکرائی تھی۔

”حمیرا باجی کی طرف چلو گی آج، ان کی دو بیٹیوں کی شادی ہے، تمہیں اور مجھے خاص طور پر بلایا ہے۔“

”نہیں یار، تم ہی چلی جانا میری طرف سے بھی، پیسے دے دوں گی، جانے کا من نہیں ہے میرا۔۔۔“

”وہ تو کبھی بھی نہیں ہوتا، صرف ایک انسان کے روٹھ جانے سے تم نے زندگی کی ہر خوشی خود پر حرام کر لی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے یار، ہو سکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں ان سے بہتر کوئی اور مل جائے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہی سے کسی موڑ پر دوبارہ ٹکراؤ ہو جائے اب تو بہت باختیار ہو تم، کچھ بھی کر سکتی ہو، اور پھر قصور بھی تو تمہارا ہی تھا ناں شافی۔“ بہت روانی میں وہ کہہ گئی تھی۔ شافیہ خان کے اندر جیسے پھر سے کسی کرب نے چٹکی کاٹی تھی۔

”تم بھی یہی سمجھتی ہو سارہ کہ میرا قصور تھا۔۔۔؟“

کس درجہ دکھی ہو کر اس نے پوچھا تھا۔ سارہ حسن فوراً بات بدل گئی۔

”نہیں، میرے کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا اور پلیز یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہرٹ نہ ہو جایا کرو، تم ایک مضبوط اور بہادر لڑکی ہو، جو ہنستی مسکراتی ہی اچھی



لگتی ہے۔ میں اب چلتی ہوں، تم اپنا خیال رکھنا۔“ جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر کے وہ فوراً کمرے سے نکل گئی تھی۔

شافیہ ابھی اس کی بات کے حصار سے نکلی بھی نہیں تھی کہ دروازے پر ہونے والی بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ وہ سستی کا شکار ہو رہی تھی مگر اسکے باوجود کسلمندی سے اٹھتی باہر دروازے کی جانب بڑھ گئی کیونکہ وہ جانتی تھی اس نے خود ہی یمنی کو دروازہ کھولنے سے منع کیا تھا۔

☆...☆...☆

ان دنوں وہ تھرڈ ایئر کے سالانہ امتحانات میں مصروف تھی۔ جہاں زیب حسن کی روشنی سے صلح کے بعد نمیرہ نے بھی اس سے سلام دعا کا تعلق دوبارہ جوڑ لیا تھا، تاہم اب اس کی محبت میں وہ پہلے سی شدت نہیں رہی تھی۔ جہاں زیب کے دیگر گھر والے بھی اس سے سخت خفا تھے۔

علی زیب جسے وہ اور نمیرہ کبھی چھیڑنے سے باز ہی نہیں آتی تھیں اب یوں ہو گیا تھا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو، وہ جانتی تھی کہ ان سب کا رویہ بالکل بجا ہے۔ کتنی محبت دی تھی ان سب نے اسے، مگر جواب میں اس نے کیا کیا تھا؟

اسے شرمندگی تھی مگر اس وقت ایک اچھی مشرقی بیٹی کا کردار نبھاتے ہوئے وہ سب کرنا ضروری تھا جو اس نے کیا تھا۔ مغربی معاشرے کی طرح اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑ کر بے خوف لہجے میں وہ اپنے باپ سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے ہر حال میں اسی شخص کے ساتھ زندگی گزارنی ہے جسے وہ چاہتی ہے۔ اس کے لیے اس وقت محبت کا انکشاف مغربی بیٹی کی طرح باعث فخر نہیں بلکہ باعث شرمندگی تھا۔

تاہم وہ اب بھی شرمندہ تھی۔ اس روز بجو کے گھر جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اس کے گمان سے بہت دور تھا۔ وہ قصوروار نہ ہو کر بھی سب کی نگاہوں میں اپنا پہلے والا مقام کھو چکی تھی۔

ان دنوں اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کی ہر حرکت کو ٹیلی کیا جا رہا ہے، یہاں تک کہ کالج جانے کو بھی۔ خوشیوں سے دن گزر چکے تھے اور اب

عذاب راتوں کی سوغات لیے ہر لمحہ ایک نیا امتحان بھرا دن اسے اپنا استقبال کرتا مل رہا تھا۔

کتنے دن ہو گئے تھے اس کی جہاں زیب حسن سے بات نہیں ہوئی تھی، تاہم اس روز بہت دنوں کے بعد ان کا فون آیا تھا۔ روشنی کے اندر ان کی آواز جیسے حرارت بن کر کودی تھی۔

”کیسی ہو روشو...؟“ وہی ان کا پیار بھرا مگر غمگین انداز... روشنی کا دل چل کر رہ گیا۔

”ٹھیک ہوں‘ آپ کیسے ہیں...؟“

”پتہ نہیں یار‘ نہ جانے کیا ہو گیا ہے‘ اتنے دن ہو گئے تم سے ملے‘ تمہیں دیکھے‘ خود ہی اندازہ کر سکتی ہو کہ کیا حال ہو گا میرا۔“

”تو آپ ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے زیب‘ میرے ماسٹر کرنے تک تو صبر کر لیں۔“

”کیوں کر لوں میں ڈرتا ہوں کسی سے اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے تمہارے پاس کہ دو سال بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بھڑکے تھے۔ روشنی خاموش ہو گئی۔

”اوکے... کر لوں گا دو سال انتظار... پھر...؟“ اس کی خاموشی محسوس کر کے انہوں نے مصلحت سے کام لیا تھا، تبھی وہ بولی۔

”میں گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ آپ جانتے ہیں ناں اباجی مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں‘ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔“ اس کے لہجے میں اپنے اباجی کے لیے بہت مان اور غرور تھا۔

”یہ محبت میری جان لے گی شافو‘ دیکھ لینا‘ وہ کیا کہتے ہی شاعر کہ

ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی

تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

”بس فضول بولنا بہت آتا ہے تمہیں‘ دوبارہ ایسی بات منہ سے نکالی تو میں

کبھی نہیں بولوں گی۔“ تپ کر بولتے ہوئے وہ اپنی چند روز پہلے والی ٹون میں

واپس لوٹی تھی، جس میں آپ جناب کا تکلف نہیں چلتا تھا۔

اور پھر گفتگو کا رخ ان خوابوں کی طرف مڑ گیا، جو ان دونوں نے مستقبل کے حوالے سے اپنی اپنی آنکھوں میں بشار کھے تھے۔

☆...☆...☆

شام ڈھل رہی تھی اور پیڑوں پر پھدکتی چڑیوں نے تھک کر اب اپنے اپنے آشیانوں کو واپس لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ شدید سردی کے باعث اسے گرم گرم بستر سے نکلنے میں خاصی کوفت تو ہوئی تھی، تاہم دروازہ اسی نے کھولا تھا اور نگاہوں کے سامنے دروازہ کھولتے ہی جس لڑکے کا چہرہ اسے نظر آیا وہ اس کے لیے ہر گز اجنبی نہیں تھا۔

”تم یہاں...؟“ اس کی حیرانی یقینی تھی۔

”جی... آپ نے کال کرنے کے لیے کہا تھا مگر بھول گئیں، مجبوراً مجھے آپ سے روبرو ملنے آنا پڑا کیونکہ پچھلے دو دن سے آپ کالج بھی نہیں آ رہیں۔“ وہ لڑکا اسے حیران کرنے پر تلا تھا۔

شافیہ چادر اچھی طرح درست کرتی اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

”جی‘ اب بولیں‘ کون سی ضروری بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے؟“ اس کا دماغ واقعی الجھن کا شکار تھا۔ لڑکے نے اس کا ہم عمر ہونے کے باوجود نگاہیں جھکا لیں۔

”شافیہ جی‘ میرا نام شاہ زر ہے۔“

تعارف کے ابتدائی مرحلے میں ہی وہ جان گئی کہ لڑکا کون ہے اور اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ نیز یہ بھی کہ اس کے کالج اور گھر کا پتہ اسے کیسے چلا ہوگا۔ ”اوکے پھر...“ اس کے مضبوط لہجے نے اسے تھوڑا سا پزل کیا تھا، تاہم جلد ہی وہ اپنے پراعتماد انداز میں واپس لوٹتے ہوئے بولا۔

”پھر... یہ کہ جس کالج میں آپ پڑھاتی ہیں، وہیں میرے بڑے بھیا بھی پڑھاتے ہیں۔ آپ جانتی تو ہوں گی انہیں، یزمان نام ہے ان کا۔ انہی نے بتایا تھا کہ آپ بہت سوفٹ نیچر کی مالک ہیں، اس سے پہلے یمنی سے بھی آپ کے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہے اور میں... میں یمنی سے بہت پیار کرتا ہوں۔“



”ویل... مگر وہ تو آپ سے پیار و یار نہیں کرتی۔“ اس کا لہجہ اب بھی سرد تھا، تبھی وہ بولا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں، شروع میں ضرور میں ہی اس کے پیچھے خوار تھا مگر اب اسے بھی میرے احساسات کی قدر ہے، دیکھیں شافیہ جی، میں مانتا ہوں، انسان کی زندگی میں اس کے اصول و ضوابط اور رسم و رواج بہت اہمیت رکھتے ہیں مگر یہ چیزیں ہم سے وابستہ لوگوں کی زندگی بھر کی خوشی سے زیادہ اہم تو نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت ہماری نوجوان نسل نے محبت کی مٹی پلید کر رکھی ہے مگر... میری محبت کوئی تماشہ نہیں ہے۔ میں پریکٹیکل انسان ہوں اور ہر چیز کو درست طریقے سے حاصل کرنے پر ایمان رکھتا ہوں، اتنا تو آپ بھی جانتی ہی ہوں گی جو دل بہلانے یا ٹائم پاس کرنے کے لیے محبت کا جھانسہ دے کر شکار پھانتے ہیں وہ اس شکار کو اپنا نام نہیں دیتے۔ میری اور مینی کی محبت بہت الگ ہے۔“

اس کے دلائل مضبوط تھے، مگر وہ متاثر نہیں ہوئی۔

”تو...؟ میرا مطلب ہے ہر لڑکا اور لڑکی چاہے وہ کتنے بھی غلط ہوں، یہی کہتے پھرتے ہیں کہ ان کی محبت پاکیزہ ہے، سب سے الگ ہے، پھر میں کیوں مان لوں کہ آپ کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں؟“

اس کے الفاظ شاہ زر کو خاصے ناگوار گزرے تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور وہ ضبط کر گیا۔

”درست فرما رہی ہیں آپ مگر میں اپنا حوالہ اپنی پہچان رکھتا ہوں۔ الحمد للہ باعزت پیشہ ہے، آپ شہر میں کسی سے بھی ”لار شاہ زر آفندی“ کا پوچھ سکتی ہیں، میرے بھیا کا کردار اور شخصیت بھی آپ کے سامنے ہے۔ میرے پاپا معروف بزنس مین ہیں۔ آرمی میں بھی رہ چکے ہیں۔ میری ماما سوشل ورکر ہیں۔ آپ ہمارے گھر آکر جیسی چاہیں تحقیق کر سکتی ہیں اور پھر یہ بات تو آپ بھی جانتی ہوں گی کہ آج کل اچھے لڑکوں کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ خود اپنی ماما کو میں نے بڑی مشکل سے اس رشتے کے لیے راضی کیا ہے وہ بھی اپنی خوشی اور محبت کا واسطہ دے کر، کیا اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز ہو سکتی ہے؟“

اس بار وہ زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ شافیہ خود بھی چند لمحوں تک کچھ نہ بول سکی۔  
 ”نہیں“ میں آپ کے احساسات و خیالات کی تعریف کرتی ہوں، قدر کرتی ہوں  
 مگر سوری مجھے یہ سب بتانے سے زیادہ بہتر تھا کہ اپنے والدین کو یمنی کے  
 گھر بھیجتے۔“

”کرچکا ہوں یہ بھی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ برادری  
 سے باہر رشتہ نہیں کرتے اور یہ بھی کہ یمنی کے لیے خاندان میں رشتہ موجود  
 ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟ آپ یقین کریں، میں کسی  
 بھی قیمت پر اسے کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ اس بار اس کے لہجے میں بے  
 بسی در آئی تھی۔

ایک لمحے کو شافیہ کو لگا اس کے سامنے شاہ زر نہیں، جہاں زیب حسن بیٹھا ہے۔  
 ”تو... مم... میں کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی؟“

”بہت کچھ... میں نے سنا ہے گھر میں آپ کی بات کو بہت اہمیت دی جاتی  
 ہے اگر آپ اپنے بھائی سے بات کریں تو ضرور وہ آپ کی بات مان لیں  
 گے۔ مجھے یمنی نے بتایا تھا۔ وہ آپ کی کوئی بات رد نہیں کرتے، پلیز آپ

ہماری ہیلپ کریں، آپ نے بھی تو کسی سے پیار کیا تھا، آپ بھی تو گزری  
 ہوں گی اس کسک سے، پلیز۔“

اس کا آخری جملہ شافیہ کے دے ہوئے زخم جیسے پھر ادھیڑ گیا تھا۔ چند لمحوں  
 میں وہ بے خودی کی کیفیت سے باہر آئی تھی۔

”اُس اوکے، مگر سوری، میں اپنے بھائیوں سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں  
 کر سکتی۔“

”کیوں...؟“ اس کے سامنے بیٹھا وہ شخص اس کے صاف انکار پر مچلا تھا۔ تبھی  
 وہ بولی۔

”کیوں سے کیا مطلب، یمنی کی شادی جہاں ہو رہی ہے وہ بھی اچھا لڑکا ہے،  
 اچھا گھر ہے۔“

”مگر وہ وہاں خوش نہیں رہ سکے گی، مادی چیزیں دل سے کوئی واسطہ نہیں  
 رکھتیں۔ آپ زبردستی اس کی زندگی کا فیصلہ کر بھی دیں گے تو کیا ہوگا۔ وہ عمر  
 تو پوری کر لے گی مگر کبھی جی نہیں سکے گی اور یاد رکھیں، پسند کی شادی کی

اجازت ہمارے مذہب نے بھی ہمیں دی ہے۔ الحمد للہ ہم مسلمان ہیں اور نئے دور سے منسلک ہیں اب وہ صدیوں پہلے والے فرسودہ رواج نہیں رہے جو بنائے ہی عورت کے حقوق کے استحصال کے لیے گئے تھے۔ میں نہیں مانتا آپ کی کسی مجبوری کو اگر یمنی میری نہ ہو سکی تو کسی اور کی بھی کبھی نہیں ہو سکے گی۔“

بے حد جوشیلا لہجہ تھا اس کا شافیہ حیرت سے ٹکڑ ٹکڑ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آپ دھمکی دے رہے ہیں؟“

”نہیں، مطمع کر رہا ہوں۔“

کتنی ملتی تھی اس شخص کی عادتیں، جہاں زیب حسن کے ساتھ۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، یمنی اچانک ضبط کی تمام حدوں کو کراس کرتی ڈرائنگ روم میں آکر پھٹ پڑی۔ شاید نہیں یقیناً وہ شاہ زر کی آمد سے باخبر تھی اور باہر کھڑی ان دونوں کی گفتگو کو سن بھی رہی تھی۔

”بس شاہ زر بہت ہو گیا۔“ شافیہ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے زہر اگلنا شروع کر دیا تھا۔

”کس سے مدد کی درخواست کر رہے ہو تم...؟ اس عورت سے...؟ یہ... یہ عورت انسان نہیں پتھر ہے، بے حس، بے جان پتھر۔ نہیں اثر کرتی اس پر کوئی بھی بات، جب اپنی باری ہو تو کوئی بھی خود کو غلط نہیں لگتا مگر دوسروں کے معاملات میں وہی کام غلط لگتا ہے لوگوں کو، بدل جاتے ہیں لوگوں کے اصول، کیوں سر پھوڑ رہے ہو اس عورت کے ساتھ تم؟ یہ دیوی ہے دیوی، مرجائے گی، پر باپ بھائیوں کی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دے گی، کوئی جئے کوئی مرے اسے کیا، اس نے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں کیا، یہ ہمارے لیے کیا کرے گی؟ پتہ نہیں کہاں اس کا اپنا محبوب در بدر خوار ہوتا پھر رہا ہو گا۔“

ایک ایک لفظ سے زہر ٹپکتی وہ بے حد مشتعل ہو رہی تھی۔

اس وقت وہاں غیروں کے سامنے ذلیل ہونے پر تحیر شافیہ خان کی آنکھوں میں ہی نہیں اترتا تھا بلکہ چند قدموں کے فاصلے پر بیٹھا شاہ زر آفندی بھی دم بخود رہ گیا۔

”جاؤ شاہ زر، کر لو تم سے جو ہوتا ہے، مجھے ہونے دو اپنے باپ بھائیوں کی فضول سوچ پر قربان، عورت ہونے کی سزا تو بھگتنی ہی ہے، تم بھی تماشا



دیکھو میرا پلیر۔“ کتنا غبار تھا اس کے اندر۔“ شافیہ کو لگا اس کی شریانیں جیسے کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔ ایک مرتبہ پھر اس کی سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔

شاہ زر اور یمنی وہاں سے رخصت ہو چکے تھے مگر اسے خود کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ وہ رونا چاہ رہی تھی مگر آنکھوں میں آنسو جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ سب کچھ گنوا کر بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آسکا تھا۔

سارہ اپنی ڈیوٹی آف کر کے گھر واپس آئی تو اس کا بیٹا بھوکا ہی سوچکا تھا۔

شاہ زر کے جانے کے بعد یمنی اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلی جبکہ شافیہ کا حال برا تھا۔

سارہ اپنے اور اس کے لیے چائے کے مگ ٹرے میں سیٹ کر کے جو نہی اس کے کمرے میں داخل ہوئی ٹھٹک کر رک گئی۔

کمرے میں مکمل اندھیرا کیے وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی سر گھٹنوں میں دیے رو رہی تھی جب اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر دھر کر جلدی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”شافیہ... کیا ہوا جانو، تم ٹھیک تو ہو؟“ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ شافیہ اسے قریب پا کر لپٹتے ہوئے بچوں کی طرح رو پڑی۔ اس کی حالت اس وقت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ سارہ کو سب کچھ بھول کر اسی وقت اسے فوری ہو سپیٹل لانا پڑا۔

☆...☆...☆

اگلی صبح وہ بیدار ہوئی تو اس نے کچن میں ناشتہ بناتی اپنی بھابی کو جہاں زیب حسن کی کال کے متعلق بتا دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس معاملے میں اس کی کوئی مدد کر سکیں مگر ان کا کردار روایتی بھابیوں سے کسی طور الگ ثابت نہ ہوا۔

اسی روز جانے ایسا کیا کہا انہوں نے اپنے شوہر اور بڑے لالہ وچھوٹے لالہ سے کہ انہوں نے خود اسے موبائل خرید کر دینے کے باوجود خود ہی اس سے

چھین بھی لیا۔ جبکہ موبائل اس کے لیے باعث تفریح نہیں ضرورت تھا۔ کالج سے چھٹی کے بعد وہ موبائل فون کے ذریعے اپنے بھائیوں کو واپسی کا ٹائم بتاتی تھی، کبھی کالج میں کوئی مسئلہ ہو جاتا تو اس سے آگاہ کر دیتی۔

تاہم بھابی صاحبہ کی مہربانی سے یہ نعمت بھی اس سے چھین لی گئی۔ دو تین روز کی چھٹی کے بعد اس روز بڑے لالہ کے ساتھ وہ کالج آئی تو اندر نمیرہ کو شدت سے اپنا منتظر پایا۔

”آگئیں تم، کہاں مر گئی تھیں...؟“

لپکتے ہی اس نے پوچھا تھا، جب وہ بولی۔

”کہیں نہیں، آج بڑے لالہ ساتھ آئے تھے، انہیں اٹھنے میں دیر ہو گئی۔“

”کیوں... اب تمہارے گھر والوں کو اتنا بھی اعتبار نہیں رہا تم پر۔“

”نہیں یار ایسی بات نہیں ہے۔“

”بس رہنے دو تم، میں کیا جانتی نہیں کسی کو، بہر حال زیب لالہ تم سے ضروری

بات کرنا چاہتے ہیں، گھر پر فون کرنے سے تم نے منع کر دیا ہے اور سیل

مسلل آف مل رہا ہے تمہارا۔ وہ بہت پریشان ہیں روشنی، آج کل نہ ٹھیک

سے کھانا، نہ آدھی آدھی رات تک سوتے ہیں، امی اور ابو دونوں ان کو لے کر بہت پریشان ہیں۔ اور اس کی وجہ تم ہو۔“ نمیرہ بولنے پر آتی تو بریک لگانا بھول جاتی تھی۔

روشنی کا دل مضطرب ہو کر رہ گیا۔

”میں ان سے کیسے بات کر سکتی ہوں نمیرہ، میرا سیل بھابی نے چھین لیا ہے۔“

”کیوں... انہیں کیا تکلیف ہے؟“

”پتہ نہیں یار، مگر آج کل میں خود بہت ڈسٹرب ہوں، کسی چیز میں کوئی لطف

محسوس نہیں ہوتا، تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟“

”تھوڑی سی ہمت پیدا کرو خود میں اور سمجھاؤ اپنے گھر والوں کو، بیٹیوں کو

زندہ لاش بنا کر ان کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنی فضول ضد

کی بھینٹ چڑھانا، جاہلوں کا شیوہ ہے، پڑھی لکھی فیملیز کو یہ سوٹ نہیں کرتا۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر... میرا اللہ ہے ناں، وہ سب ٹھیک کر دے

گا۔“

اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ کر اس نے بات ہی ختم کر دی تھی تاہم چھٹی کے وقت جب وہ نمیرہ کے ساتھ بیرونی گیٹ کی طرف آنے لگی، نمیرہ کے سیل پر کال آگئی، جسے پک کر کے

اگلے ہی پل وہ روشنی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”روشنی“ میرے ساتھ چلو، باہر بھیا گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ چونکہ واپسی میں کالج وین سے جاتی تھی، تبھی نمیرہ کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”اوکے چلو۔“

اسے خود بھی جہاں زیب حسن سے مل کر اسے بہت سی باتیں سمجھانا تھیں۔

عزت کو انا اور ضد کا مسئلہ بنا کر اپنے بھائیوں یا محبت کو نقصان پہنچانا اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ لہذا نمیرہ کے ساتھ کالج گیٹ سے باہر آتے ہی اس کی پہلی نظر روڈ پر بالکل سامنے کھڑے اداس سے جہاں زیب حسن پر پڑی تھی۔

نڈھال سراپے کے ساتھ، گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑے وہ جیسے اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ روشنی کا دل انہیں دیکھ کر لمحوں میں قابو سے باہر ہوا تھا۔ فقط چند دنوں میں ان کی صحت کتنی گر گئی تھی۔

وہ ابھی ان کی جانب قدم بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ نے روڈ کے اس پار قدرے فاصلے پر کھڑی اپنے بڑے لالہ کی شاندار گاڑی دیکھ لی۔ ان کے ساتھ اس کا ایک بھانجا اور بھتیجا بھی تھا۔ اور بس... جہاں زیب حسن کی طرف بڑھتے اس کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ اپنے گھر والوں کی نگرانی کے حصار میں تھی، اس کے پیروں میں ”اعتماد“ کی بیڑیاں تھیں اور یہ بیڑیاں چاہ کر بھی کاٹ نہیں سکتی تھی۔

جہاں زیب حسن نے جو اسے اپنی طرف بڑھتے بڑھتے اچانک رکتے دیکھا تو خود آگے بڑھ آئے۔

”روشنی... میرے ساتھ چلو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ وہی ان کا حکمیہ بارعب لہجہ، وہ گڑبڑا کر ایک نگاہ ان پر ڈالتی، پھر روڈ کے اس پار کھڑی اپنے لالہ کی گاڑی کو دیکھنے لگی۔



”کوئی پر اہم ہے...؟“ اس کی نگاہوں کی تقلید میں، ذرا سی گردن موڑ کر انہوں نے پیچھے دیکھا، پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”چلو میرے ساتھ، میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔“ ان پر جیسے خون سوار تھا۔ روشنی بے بسی سے روپڑی۔

”زیب! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو، یہ ہمارے لیے اچھا نہیں ہے۔“

”نہ ہو، پہلے بھی کیا اچھا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔“

انہیں جیسے کسی کی پروا نہیں تھی، تاہم اس سے پہلے کہ وہ روشنی کو اپنی گاڑی تک لپاتے بڑے لالہ کی گاڑی حرکت میں آگئی اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں جہاں زیب حسن کا گریبان ان کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اپنی بہن کا بازو چھونے والے اس شخص کی جان لے لیتے۔ روشنی جانتی تھی کہ وہ بے حد گرم طبیعت رکھنے والے امن پسند شخص تھے مگر جہاں زیب حسن کی حرکت نے انہیں تپا دیا تھا۔

بڑے لالہ کے ساتھ اس کا بڑا بھانجا بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھی خاصی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ایک طرف جان سے پیارا بھائی تھا تو دوسری طرف جان

سے پیارا محبوب۔ وہ کتنے دل کیساتھ کبھی بھائی کو دیکھتی تو کبھی محبوب کو، نمیرہ الگ کھڑی چیخ رہی تھی مگر وہ بالکل خاموش تھی کچھ ہی دیر میں دوسرے لوگوں کی مداخلت سے معاملہ تو رفع دفع ہو گیا مگر روشنی کی زندگی مزید مشکل کا شکار ہو کر رہ گئی۔

اس کے گھر سے نکلنے، فون اٹھانے، یا نمیرہ سے کوئی بھی تعلق یا رابطہ رکھنے پر سخت پابندی لگ چکی تھی۔ تھرڈ ایئر کے فائل پیپرز شروع ہو چکے تھے، لہذا چھوٹے لالہ اسے خود گاڑی میں لیکر جاتے ادھر سے جہاں زیب حسن نمیرہ کو چھوڑنے آتے مگر واپس جانے کی بجائے وہیں کالج کے قریب گاڑی پارک کر کے کھڑے رہتے، ادھر روشنی کے گھر سے جو بھی اسے چھوڑنے جاتا، کالج کے باہر کھڑا رہتا۔ اندر وہ پیپر دے رہی ہوتی مگر ذہن میں ایک لفظ بھی نہ ہوتا سو خالی لکیریں بیٹھی کھینچتی رہتی۔

نمیرہ اس سے سخت ناراض ہو کر، قطع تعلق ہو گئی تھی۔ سلام دعا کا تعلق بھی جاتا رہا تھا۔ حالات کی سنگینی کو بھانپ کر اس روز اباجی نے جہاں زیب حسن کے

اباجی کو کال کھڑکادی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جہاں زیب ان کی بیٹی کی توجہ نہ ہونے کے باوجود زبردستی پیچھے پڑا ہے۔

اس روز روڈ ہنگامے کے بعد وہ اور بھی پریشان ہو گئے تھے۔ لہذا معاملے کو سلجھانے کے لیے انہوں نے حسن صاحب سے بات کی اور انہیں بتایا کہ اگر ان کا بیٹا اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خالی دھمکی تھی تاہم بات حسن صاحب کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے نہایت سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاں زیب کو کراچی مستقل طور پر سیٹل کرنے کا بندوبست کر دیا۔

دو تین روز سکون سے گزر گئے تھے جب اس روز گھر کے فون پر جہاں زیب حسن کی والدہ کی کال آئی۔ ان کی کال بھابی جان نے اٹینڈ کی مگر دوسری طرف روشنی نے دوسرے فون کا ریسپور پہلے اٹھالیا تھا۔

جہاں زیب کی والدہ کی آواز سن کر وہ ریسپور پکڑے بیٹھی رہی اور وہ روتے ہوئے اپنے جگر کے ٹکڑے کی محبت میں مجبور جانے کون کون سے واسطے ڈال رہی تھیں۔ بھابی کو بتا رہی تھیں کہ ان کے بیٹے کی طبیعت بہت خراب

ہے، اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ رو رو کر ساری رات گزر جاتی ہے، وہ ان کی منت کر رہی تھیں کہ ان کا پریپوزل قبول کر لیں، اس کے لیے وہ ان کی ہر شرط ماننے کو تیار تھیں تاہم بھابی نے نہ صرف انہیں دو ٹوک جواب دے دیا بلکہ یہ بات اباجی تک پہنچنے ہی نہیں دی۔

روشنی کا جو حال تھا وہ صرف خدا کی ذات اور اس کا اپنا دل ہی جانتا تھا، کتنا بے بس محسوس کر رہی تھی اس وقت وہ خود کو، جہاں زیب کے حال کا اسے اندازہ تھا مگر اس کے حال کی خبر رکھنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ماں کی مامتا کی کمی شدت سے محسوس کرتی، وہ اپنے ہی بھرم میں، اندر سے گھٹتی جا رہی تھی۔ اباجی کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔

بڑے لالہ کراچی اپنی جاب پر واپس چلے گئے تھے جبکہ جہاں زیب حسن کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں، کس حال میں ہیں؟ اور یہ بھی کہ وہ اس کی کوئی خبر رکھے ہوئے ہیں یا نہیں؟

محض گھر والوں اور برادری میں سرخرو ہونے کے لیے اس نے اپنی ہر سانس کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ پہاڑ راتوں میں بسر ہوتے وہ عذاب دن جو اس نے

اپنے خوابوں سے دستبردار ہو کر گزارے تھے، صرف وہی جانتی تھی، ان دنوں اسے اماں جی کو یاد کر کے بہت رونا آتا تھا کیونکہ ایک ماں ہی بناء کہے اپنی بیٹی کے دل کی بات کو سمجھ سکتی ہے۔ پورے چھ ماہ جہاں زیب حسن کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ تعلیم بھی اس نے ادھوری چھوڑ دی تھی۔ تقدیر اور حالات کے ہاتھوں سخت مایوسی کے باعث اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا مگر کیسی اذیت ناک بے بسی تھی کہ اس کے باوجود اسے سب کے سامنے خود کو بہت خوش اور بے نیاز پوز کرنا تھا۔

☆...☆...☆

اس کو ہوش آگیا تھا۔ سارہ اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھی، متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اسے اپنا سر بے حد بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم پھر بھی ہاتھ بڑھا کر اس نے سارہ کا ہاتھ تھاما تھا۔

”اب کیسی ہو شانی...؟“ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے، یہاں کیوں لائیں تم مجھے؟“

”ضروری تھا، اس لیے، کل رات سے بے ہوش ہو تم، بتاؤ کیا ہوا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں، بس اباجی کی یاد آرہی تھی...“ اس کی آنکھ پھر پھر آئی تھی۔

”جھوٹ، اباجی کے ساتھ کوئی اور بھی یاد آیا ہوگا۔“ اب وہ اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی، شافیہ خان کے لبوں پر پھسکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”سچ شافی! تم نے ان کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ میں ہوتی نا اگر اس وقت تمہارے ساتھ تو کبھی تمہیں ایسا نہ کرنے دیتی، اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔“

”تم بھی مجھے غلط سمجھتی ہو سارہ سب کچھ جاننے کے باوجود تم یہ سمجھتی ہو کہ میں نے جو کیا وہ غلط تھا؟“

”نہیں... میں تمہیں غلط نہیں سمجھتی، اس وقت تمہاری جگہ کوئی بھی اچھی لڑکی ہوتی تو شاید وہی کرتی جو تم نے کیا مگر... پھر بھی زیب لالہ کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل میں کسک سی پیدا ہوتی ہے اور ان کو کھو کر تمہارا جو حال



ہے، تمہیں کیا پتہ یہ مجھے کتنا بے کل رکھتا ہے۔“ سارہ حسن کے لہجے میں اداسی تھی، شافیہ خان نے چپکے سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”کتنا بڑا نقصان کیا تم نے اپنا، تمہیں بارش سے عشق تھا، اب وحشت ہوتی ہے، تم کھل کر کھانے پینے کی شوقین تھیں، اب تم نے ہر اس چیز کو خود پر حرام کر لیا ہے جو کبھی بہت مرغوب تھی تمہیں، اپنی کیر بھی نہیں کرتیں تم، یہ کتنی بڑی خود اذیتی ہے جانو، کوئی ایسے بھی سزا دیتا ہے اپنے آپ کو...؟“

”یہ سزا تو نہیں ہے، یہ تو جلد از جلد اللہ کے پاس پہنچنے کی کوشش ہے۔ پتہ ہے سارہ جب میں کوئی جنازہ دیکھتی ہوں تو میرے اندر سے ہوک اٹھتی ہے، مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ اللہ نے اس کی جگہ مجھے کیوں اپنے پاس نہیں بلالیا۔ ایک کے بعد ایک سارے لوگ چلے گئے میری زندگی سے، اب کیا کروں میں یہاں رہ کر۔“

کتنی دکھی تھی وہ اندر سے سارہ کٹ کر رہ گئی۔

”شافی، پلیز تم نے وعدہ کیا تھا، تم مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرو گی۔“

”کیا کروں یار، میرا دل زندگی میں نہیں لگ رہا۔“

”تم شادی کر لو پلیز، پھر دیکھنا، جب چھوٹے چھوٹے بچے تمہاری زندگی میں آئیں گے تو تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔“ اپنی طرف سے اس نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا تاہم اس سے پہلے کہ جواب میں شافیہ کچھ کہتی وہاں آپا جان، بجو، چھوٹے لالہ اور ان کی مسز سب چلے آئے، غالباً چھوٹے لالہ اور ان کی فیملی کل رات میں ہی پاکستان پہنچے تھے۔

شافیہ دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئی تھی۔ بڑے لالہ کے بعد اسے سارے بہن بھائیوں میں وہی سب سے زیادہ عزیز تھے۔

سارہ کا شوہر بھی سعودیہ سے پاکستان واپس آچکا تھا۔ لہذا وہ گرین پیلس چھوڑ کر بالکل سامنے ہی اپنے گھر میں شفٹ ہو گئی۔ گاؤں سے ریاض لالہ بھی اپنی پوری فیملی کے ساتھ گرین پیلس چلے آئے تھے۔ شافیہ کو برسوں کے بعد اپنا گھر بھرا اچھا لگ رہا تھا، ایسے میں اباجی کی کمی ہر پل محسوس ہوتی تھی۔

دو روز کے بعد سارہ نے اپنے سینئر ڈاکٹرز سے شافیہ کی رپورٹس وصول کیں تو گویا سر سے پاؤں تک زمین میں دھنس گئی۔ دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش

پا کرتی وہ چاند کی چاندنی سی لڑکی، گزرنے والے ہر دن کے ساتھ زندگی سے دور جا رہی تھی۔

معمولی سی بات کی ٹینشن لے کر وہ جیسے ہاتھوں میں آجاتی تھی، اب اسے سمجھ آ رہا تھا۔ اس کے دل کی ورید روز بروز سکڑتی جا رہی تھیں جس کی وجہ سے اسے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

اس نے شافیہ کی رپورٹس کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا مگر اس روز وہ خود بہت روتی تھی۔ محبت تو اسے پہلے ہی بہت تھی اس لڑکی سے مگر اب تو یہ محبت جیسے عشق میں ڈھل گئی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس کے دل سے ہر دکھ کو کھرچ کر پھینک دیتی۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اب ہر حال میں وہ کتنی ہی خفا کیوں نہ ہو، وہ اس کے گھر والوں سے جہاں زیب حسن کے متعلق بات کر کے رہے گی۔ انہیں مجبور کرے گی کہ اپنی بہن کی خوشیوں اور زندگی کے لیے وہ اس شخص کو ضرور ڈھونڈ کر لائیں۔

☆...☆...☆

جانے والے چلے جاتے ہیں چپ چاپ مگر

کوچہ یاد میں قدموں کے نشان بولتے ہیں

پورے چھ ماہ سکون سے گزر گئے تھے۔ جہاں زیب حسن کی طرف سے کوئی نیا ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ اپنی دوست عظمیٰ کی زبانی اسے گاہے بگاہے اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر ملتی رہتی تھی۔ نمیرہ نے پنجاب شفٹ ہونے کے بعد اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

پورے چھ ماہ لگے تھے اسے اپنا اعتماد اپنے گھر والوں کی نگاہ میں پھر سے حاصل کرنے کے لیے۔ ان دنوں گرین پیلس میں اس کے بڑے بھانجے کی شادی کی خوب تیاریاں ہو رہی تھیں جب وہ بھی اپنی تیاری کے لیے اپنی بھابی کے ساتھ مارکیٹ چلی آئی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پچھلے چھ ماہ سے غائب رہنے والا جہاں زیب حسن اب بھی اس کی ہر حرکت کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے ہے، جانے پچھلے کتنے دنوں سے وہ اسے چھپ کر ٹیلی کر رہا تھا۔ وہ مارکیٹ آتی تو وہ بھی

ضروری سے ضروری تمام کام چھوڑ کر چلا آتا۔ ان دنوں اس کا حال کسی مجنوں سے کم نہیں تھا، جسے ہر شکل، ہر چیز میں اپنی لیلیٰ نظر آتی تھی۔

ابھی چند روز قبل وہ دوبئی سے آیا تھا، ایک اچھے پائلٹ کی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں۔

ٹاپنگ سے فارغ ہو کر اپنی بھابی کے ساتھ وہ روڈ پر کھڑی ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی جب گھنے بادلوں کی طرح اچانک جہاں زیب حسن کی گاڑی کے ٹائر اس کے قدموں کے قریب چرچرائے اور اگلے ہی پل وہ گاڑی سے نکل کر اس کے مقابل کھڑا تھا۔

”روشنی“ مجھے تم سے بات کرنی ہے، میری بات سن لو پلیز۔“ محبت انسان کو کتنا حقیر کر دیتی ہے، اس لمحے جہاں زیب حسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ جان سکتی تھی، جبکہ ہکا بکا کھڑی بھابی جان کی نگاہیں بھی اب اسی پر مرکوز تھیں۔

”چلو روشنی، پلیز...“ اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔

روشنی پتھر کابت بنی، اس کے سامنے کھڑی تھی، جبکہ بھابی کے حواس اب قائم ہو چکے تھے۔

”گھر چلو وہاں بات کر لیتے ہیں، یوں روڈ پر کھڑے ہو کر بھی کبھی باتیں ہوئی ہیں۔“ روشنی کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کرتے ہوئے وہ سختی سے بولی تھیں مگر جہاں زیب نے پروا نہیں کی۔ وہ اب بھی روشنی کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

”روشنی چلو، مجھے تم سے ہی بات کرنی ہے، صرف ایک منٹ لوں گا پلیز...“ بچے کی طرح مچلتے ہوئے وہ ضد کر رہا تھا مگر... وہ اب بھی مجبور تھی۔

☆...☆...☆

شافیہ خان ہو سپٹل سے گھر آچکی تھی۔

سارہ نے کسی کو بھی اس کی رپورٹس کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر پھر بھی سب اس کا بے حد خیال رکھ رہے تھے۔ ریاض لالہ کی خواہش تھی کہ وہیں سب کی موجودگی میں، گرین پیلس میں ہی یمنی کی نسبت طے کر کے اس کے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔



شافیہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

اسے یمنی سے بے حد پیار تھا، وہ اس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ یمنی ہی تھی جس نے ہمیشہ اس کے آنسو پونچھے تھے۔ وہ جب بھی خود کو بے حد تنہا محسوس کرتی اسی کے کندھے پر سر رکھ کر رو لیتی۔ سردیوں کی لمبی ٹھٹھرتی راتوں میں وہ دل کی بہت سی باتیں جاگ کر اس کے ساتھ شہر کرتی۔

اسے اس وقت بھی اس کی ناراضی تکلیف دے رہی تھی مگر... وہ ایک مرتبہ پھر مجبور تھی اس میں اب بھی بھائیوں کے سامنے سراٹھانے کی ہمت تھی نہ ہی وہ شاہ زر کو یمنی کے قابل سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وقتی جنون کا شکار تھی۔

یمنی کو بھی اس پر زیادہ غصہ اسی لیے تھا کہ وہ اس سے بے انتہا اٹیچ ہونے کے باوجود اس کی کوئی مدد کیوں نہیں کر پارہی تھی۔

ریاض لالہ نے سارے بہن بھائیوں کی رائے اور پسند کے بعد بالآخر یمنی کی نسبت اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ طے کر دی تھی۔ نہ صرف اس کی نسبت طے کر دی، بلکہ شادی کے دن بھی رکھ دیئے تھے۔

شافیہ کی طبیعت اب خاصی سنبھل گئی تھی مگر اس کے باوجود اس نے کالج سے چھٹیاں لے لی تھیں۔ کیونکہ گھر میں ریاض لالہ اور اعجاز لالہ دونوں کی فیملیز اکٹھی ہوئی تھیں اور

ان کی خاطر مدارت کے لیے اس کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔

پھر یمنی کی شادی کی تیاریاں بھی کرنی تھیں۔ رضیہ بجو اور منزہ بجو بھی گاہے بگاہے چکر لگالیتی تھیں، مگر زیادہ ذمہ داری اس پر تھی۔

اس روز بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی۔ لہذا ناشتے کا کام نمٹا کر وہ لان میں آ بیٹھی۔ بھابی جان، چھوٹی بھابی اور بجو رضیہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں۔ جبکہ یمنی نے حسب معمول خود کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ سارہ کی دن کی

ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی، لہذا اب وہ اکثر سرشام ہی چکر لگاتی تھی۔ کچھ گھر میں سب لوگوں کی موجودگی کے باعث اس نے خود ہی ادھر آنا کم کر دیا تھا۔

اپنے ماضی کی یادوں میں کھوئی بیٹھی وہ جانے کیا سوچ رہی تھی، جب اس کا چھوٹا بھتیجا فرحان بڑے خوشگوار موڈ میں اس کے مقابل آ بیٹھا۔

”کیا ہو رہا ہے پھوپو جانی، آج اکیلے اکیلے دھوپ سینکی جا رہی ہے۔“ وہ اس سے بہت فری تھا اور یمنی کی طرح محبت بھی بہت کرتا تھا، تبھی وہ یادوں کے گرداب سے نکل کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”تم بھی سینک لو بیٹا جانی، میں نے اکیلے تھوڑی سورج کا کنکشن لیا ہوا ہے۔“ وہ عمر میں اس سے بڑا تھا مگر مذاق کے موڈ میں دونوں یونہی ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے۔ اب بھی وہ اس کے الفاظ پر ہنس پڑا تھا۔

”شافو، آج میں بہت خوش ہوں، اتنا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”کیوں بھئی، کوئی خزانہ وزانہ ہاتھ لگ گیا ہے کیا...؟“

”بس... کچھ ایسا ہی سمجھ لو...“ اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پہ

مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”پھر بھی، کچھ پتہ تو چلے۔“

”پتہ بھی چل جائے گا مائی ڈیر شافو، فی الحال تو اتنا جان لو کہ یمنی کی جس لڑکے کے ساتھ بات پکی ہوئی ہے وہ عائشہ کا بھائی ہے اور عائشہ میری محبت ہے، ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہیں۔ پہلے پایا نہیں مان رہے تھے مگر جب میں نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تو مان گئے، اب یمنی کے ساتھ ہی میرا بھی عائشہ سے نکاح ہوگا“ ہے نا سر پرائز...؟“ فرحان کے چہرے پر سچی خوشیوں کے رنگ تھے۔

وہ حیران سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے یہ حقیقت تکلیف دے رہی تھی کہ ذات پات کی جس سولی پر اس نے اپنی محبت کو چڑھا دیا تھا، اس کے خاندان کا کوئی مرد اس کا پابند نہیں تھا۔ قربانی صرف بیٹی کے لیے جائز تھی، بیٹے کے لیے ایسا کوئی قانون نہیں بنا تھا۔

اس کی آنکھیں پھر ٹوٹ کر رونے کی خواہش میں جیسے غم کے دھوئیں سے بھر گئی تھیں۔

فرحان اٹھ کر جاچکا تھا مگر وہ چپ چاپ سورج ڈھلنے تک وہیں لان میں بیٹھی جانے کیا کیا سوچتی رہی تھی۔

تصور ہی تصور میں اس نے یمنی کو بہت جذباتی دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا یمنی نیند کی کئی گولیاں ایک ساتھ پھانک کر ان سب کے رونے پر چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”مت روئے کوئی میرے لیے رکھ لی ہے میں نے آپ کے نام کی عزت کر دیا ہے قربان اپنے دل کو اب کوئی نہیں کہے گا آپ سے کہ آپ کی بیٹی نے پسند سے شادی کیوں کروائی؟ رکھیں سنبھال کر اپنی ذات پات کو پسند کی شادی نہ سہی پسند کی موت اپنانے کا حق تو ہے ناں مجھے یا اس کے لیے بھی میں ایک ایک کے پاؤں پکڑوں؟“

وہ بہت زیادہ تکلیف میں لگ رہی تھی۔ شافیہ فوراً چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

اس کی سانس ایک مرتبہ پھر بے ربط ہو گئی تھی۔

کتنے دن ہو گئے تھے اس نے یمنی کو ہنستے بولتے نہیں دیکھا تھا۔ دن بدن کمزور ہوتی وہ لڑکی زندگی سے دور جا رہی تھی۔

وہ لان سے اٹھ کر اندر یمنی کے کمرے کی طرف آئی تو اسے فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے پایا۔ بے حد پریشان حال میں وہ روتے ہوئے کسی سے کہہ رہی تھی۔

”اگر تم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، خدا کا واسطہ ہے تمہیں یہاں سے چلے جاؤ شاہ زر پاکستان سے چلے جاؤ پلیز...“

وہ دہلیز پر ہی رک گئی تھی۔

”نہیں شاہ زر، تم ایسا کچھ نہیں کرو گے، تم دیکھنا، تمہیں مجھ سے ہزار درجے اچھی کوئی لڑکی مل جائے گی، میں آج اپنا سیل توڑ رہی ہوں، آج سب کچھ ختم ہو رہا ہے میرے لیے، سب کچھ...“

اندر یمنی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور باہر شافیہ کو لگا جیسے کسی نے اس کی سانسیں جکڑ لی ہوں، کسی کے لیے سب کچھ ختم ہونے کی اذیت کیا ہوتی ہے بھلا اس سے بڑھ کر اور کون جان سکتا تھا۔



وہ اندر کمرے میں آئی تو یمنی اسے دیکھتے ہی زخمی شیرنی کی مانند دھاڑی تھی۔  
 ”تم کیوں آئی ہو یہاں...؟ جاؤ یہاں سے، میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“  
 ”یمنی، میری بات سنو...“

”نہیں، کسی سے کچھ نہیں چاہئے مجھے، سب ایک جیسے ہیں یہاں، بیٹیوں کی تجارت کرنے والے، اس سے بہتر تھا کافروں کی طرح پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے مجھے، جیل میں ہوتی ہو تم مجھ سے، تمہیں اپنا پیار نہیں ملا تو تم کسی اور کو کیوں کچھ ملنے دو گی...“

ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی تمام چیزوں کو ہاتھ مار کر گراتی، وہ غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھی جب وہ دھاڑی۔  
 ”بکواس بند کرو یمنی۔“

”کیوں کروں بکواس بند، تم نے دھوکہ دیا ہے مجھے، تم چاہتیں تو شاہ زر میرا ہو سکتا تھا مگر تم کیوں چاہو گی جس کا اپنا دل خالی ہو، اسے کسی اور کا آباد دل کب اچھا لگتا ہے مگر یاد رکھو میں اس بیوفائی کے لیے کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

غصے سے چلاتے ہوئے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ لگ رہی تھی۔ شافیہ کو اپنے دماغ میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔  
 ”بکواس بند کرو اپنی، جہاں زیب اور شاہ زر کا کوئی مقابلہ نہیں۔“

”ہو بھی کیسے سکتا ہے، میرے شاہ زر کے پاؤں کی دھول بھی نہیں تمہارا جہاں زیب، اسی لیے چھوڑ کر بھاگ گیا تمہیں، مگر میرا شاہ زر ایسا نہیں ہے دل و جان سے مرتا ہے مجھ پر۔“ اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

شافیہ کے اعصاب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

”شٹ اپ...“ چلا کر دھاڑتے ہوئے اس نے ایک زوردار تھپڑ قطعی غیر ارادی طور پر اسے جڑ دیا تھا۔

”کیا جانتی ہو تم میرے جہاں زیب کے بارے میں، کیا خبر ہے تمہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ آنسوؤں میں بھیگے لہجے کے ساتھ وہ جیسے ٹوٹ گئی تھی۔  
 یمنی احمد بھی گال پر ہاتھ رکھے تھیں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”جان دے دی تھی میرے جہاں زیب نے میری محبت میں‘ سنا تم نے‘ کہیں چھوڑ کر نہیں گئے وہ مجھے اور ان کی جان لینے والی میں خود ہوں‘ میں نے خود رخصت کیا تھا انہیں ہمیشہ کے لیے‘ خود اپنے ہاتھوں اپنا دل اجاڑا ہے میں نے‘ کر سکتی ہو تم ایسا‘ دے سکتی ہو ایسی قربانی؟ بولو‘ خود اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو دفن ہوتے دیکھ سکتی ہو تم...؟ ختم ہو گیا ہے میرے لیے سب کچھ...”

وہ راز جو اب تک اس نے خود سے بھی چھپا رکھا تھا‘ اسی راز کو بے خود ہو کر قطعی نہ چاہتے ہوئے وہ افشا کر گئی تھی۔ یمنی کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”مر گئے ہیں میرے جہاں زیب‘ چھین لیا ہے میری تقدیر نے انہیں مجھ سے‘ اب مت کوئی الزام لگائے ان پر‘ پلیز۔“

بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے کی خواہش میں‘ وہ بری طرح لرزتے ہوئے وہیں بیٹھتی چلی گئی تھی جبکہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آتے ہوئے سارہ حسن کا پورا وجود جیسے برف میں ڈھل گیا تھا۔

یہ کیسا خفیہ انکشاف کیا تھا شافیہ نے کہ اس کی اپنی سماعتوں میں جیسے سناٹے اتر آئے تھے۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگتی چلی گئیں۔

پرچم یاد میں اشکوں کے گوہر ٹانگ دیئے  
ہم سے کچھ اور ہنر ہونہ سکا‘ تیرے بعد  
کوئی لوٹ آئے دعاؤں سے یہ ممکن ہی نہیں  
بے اثر جیسے ہوا حرف دعا تیرے بعد

☆...☆...☆

”نہیں... بھابی جان نے کہہ دیا ناں‘ ہم گھر چل کر بات کریں گے‘ پلیز جائیں آپ...“ سب کے سامنے یا خفگی میں وہ اسے آپ ہی کہتی تھی۔  
جہاں زیب اس کے انکار پر مزید ضد میں آگیا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت تم سے بات کرنی ہے روشنی‘ چلو...“ ایک طرح سے مجبور ہو کر اس کا بازو کھینچتے ہوئے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھے تھے جب بھابی جان نے بلند آواز میں شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا اور یہی بتایا کہ

کوئی انجان شخص ان کی بہن کو سرعام اغوا کر رہا ہے جس پر لوگ درمیان میں پڑ گئے اور جہاں زیب حسن ایک مرتبہ پھر لوگوں میں گھر کر، ہزار کوشش کے باوجود اس سے کچھ نہ کہہ سکے۔

گھر میں اس وقت چھوٹے لالہ کے سوا سب ہی موجود تھے۔ لہذا بھابی نے گھر پہنچتے ہی آسمان سر پر اٹھالیا اور جہاں زیب کی جرأت کے بارے میں من و عن ساری کہانی کہہ سنائی۔ روشنی کی ٹانگیں اس وقت کسی انہونی کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

اباجی اور بڑے لالہ دونوں ہی چھ ماہ کے بعد جہاں زیب کی ایسی بے باک حرکت کو برداشت نہیں کر سکے تھے۔ لہذا بڑے لالہ نے اسی وقت ان کے سیل پر کال کھڑکا ڈالی۔

”گھٹیا ذلیل انسان“ تجھے جرأت کیسے ہوئی بھرے بازار میں میری بہن کا ہاتھ پکڑنے کی، بتا کہاں ہے تو ابھی تیری ساری بدمعاشی نکالتا ہوں میں۔“ ہمیشہ بے حد نرم رہنے والے اپنے بڑے لالہ کو اس روز اس نے شدید غصے میں

دیکھا تھا۔ جہاں زیب حسن نے دوسری طرف ان کے الفاظ پر بے خوفی سے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے، نکالنا بدمعاشی میں خود چل کر آتا ہوں تیرے پاس، تو کیا آئے گا؟“

اور پھر اگلے پندرہ منٹ میں واقعی ان کی شاندار گاڑی ان کے گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ وہ سب گھر والے صحن میں موجود تھے۔ جب جہاں زیب حسن گاڑی سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے گھر کے اندر چلے آئے۔

بڑے لالہ انہیں دیکھتے ہی کھول کر ان کی طرف لپکے تھے اور لمحوں میں ان کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ تاہم جہاں زیب حسن نے ایک ہی جھٹکے سے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔

شاندار وجاہت کے ساتھ ساتھ وہ بے پناہ طاقت میں بھی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔

”چلو روشنی، اگر ہماری قسمت میں ایسے ہی لکھا ہے تو ایسے ہی سہی۔“



کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر انہوں نے سامنے کھڑی شافیہ خان 'عرف روشنی کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے باہر گاڑی تک لے آئے۔

روشنی کا جیسے خود پر کوئی اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ تیز تیز چلتی گئی تھی۔

”بیٹھو...“ فرنٹ ڈور کھول کر اسے نرمی سے فرنٹ سیٹ پر برابر میں بٹھاتے ہوئے انہوں نے گاڑی لاک کر دی تھی۔

”مجھ سے شادی کرو گی ناں؟“

گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے پہلا سوال یہ کیا تھا۔

روشنی کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ جس پر وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔

”میں نے سارا انتظام کر لیا ہے، وہاں ہوٹل میں میرے دوست ہمارا انتظار

کر رہے ہیں، امی ابو کو میں نے بتا دیا ہے، ان کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں، تم

ٹینشن مت لینا، ایک بار نکاح ہو گیا تو پھر کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔“

انہیں کتنی جلدی تھی اسے خود سے منسوب کرنے کی۔ روشنی غائب دماغی سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں بڑے لالہ گرین پیلس سے باہر نکل آئے۔ ساتھ میں انہوں نے کال کر کے اپنے بھانجے اور بھتیجیوں کو بھی بلا لیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سب اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ بائیک لے کر جمع ہو گئے تھے۔

جہاں زیب حسن کسی صورت وہاں ہنگامہ نہیں چاہتے تھے، نہ ہی روشنی کی رسوائی انہیں مقصود تھی۔ لہذا ایک نظر ان سب کو دیکھنے کے بعد وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے تھے۔

”تو گھر چل روشنی، میں انہیں فارغ کر کے آتا ہوں۔“

گاڑی کا لاک کھول کر اسے واپس گھر جانے کا حکم دیتے، وہ تیزی سے گاڑی کو ڈرائیو کرتے وہاں سے نکل گئے تھے۔

اگر روشنی کو ذرا سا بھی گمان ہوتا کہ اس وقت وہ انہیں ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہی ہے تو شاید وہ کبھی انہیں اکیلا نہ جانے دیتی۔

دل اس وقت بے چینی کی انتہا پر تھا جب اس نے اپنے بڑے لالہ کو بے حد غصے میں اسلحے کے ساتھ، گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے دیکھا تھا، اباجی انہیں روک رہے تھے، سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر... وہ طوفان کسی طور نہ تھم سکا۔

جلے پیر کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر ٹھلتے ہوئے وہ یا اللہ، یار حمن، یار حیم کا ورد کر رہی تھی، جب ہو سپٹل سے آئی کال نے اس کا دل جکڑ لیا۔ فون کے دوسری طرف اس کا بھانجا فرحان اپنے بڑے بھائی سبحان اور بڑے لالہ کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔

اس کا دل اپنے بھائی کے زخمی ہونے پر کٹا تھا۔ جہاں زیب حسن کی ضد اور ہٹ دھرمی پر اس وقت شدید مشتعل ہوتے ہوئے وہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی، بار بار اس کے موبائل نمبر کو ٹرائی کرتے ہوئے وہ غصے سے بے حال ہو رہی تھی مگر اس کا نمبر مسلسل آف مل رہا تھا۔ اور پھر شام میں جب سب لوگ ہو سپٹل جا رہے تھے، اس کے گھر کا فون بجا تھا۔ فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے اس کی دھڑکنوں کو جیسے جکڑ لیا تھا۔

سب لوگ گھر سے نکل چکے تھے، صرف وہ اور اباجی گھر پر تھے، لہذا شدید مجبوری کے عالم میں اس نے فون ریسو کیا تھا۔ دوسری طرف عظمیٰ زار و قطار روتے ہوئے اس کے ہیلو کے جواب میں کہہ رہی تھی۔

”شافی! جہاں زیب لالہ کی ڈیٹھ ہو گئی ہے، پچھلے دو گھنٹے سے وہ ہو سپٹل میں تھے مگر سر پر لگنے والی بھاری چوٹ نے ان کی جان لے لی۔“  
”واٹ؟“ اس کے سر پر ایکدم سے جیسے کسی نے وزنی شے دے ماری تھی۔ ایک سناٹا سادبن سے نکل گیا تھا۔

”روشنی آکر دیکھو ناں، زیب لالہ کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ انہیں کہونا آ نکھیں کھولے، روشنی دیکھو، انکل اور آنٹی کیسے رو رہے ہیں، زیب لالہ جا رہے ہیں روشنی، انہیں روک لو، پلیز۔“ نمبرہ سے گہری دوستی کے باعث وہ اس وقت ہو سپٹل میں ہی تھی۔

شافیہ کا سارہ وجود لمحوں میں ساکت ہو گیا۔

جہاں زیب حسن کی ڈیڈ باڈی کو اس کے آبائی گاؤں روانہ کیا جا رہا تھا مگر اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر نیچے لٹک گیا۔

”تو چل روشنی“ میں ابھی انہیں فارغ کر کے آتا ہوں۔“

اس کی سماعتوں میں ابھی چند گھنٹے قبل کہے گئے اس کے لفظ گوئے تھے اور وہ کپکپاتے وجود کے ساتھ لڑکھڑاتی وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

کتنی برہم تھی وہ ان سے ابھی کیا کچھ نہیں سنانا تھا انہیں مگر اس بار وہ اسے کچھ بھی غلط سلط کہنے کا موقع دیئے بغیر چپ چاپ آنکھیں موند گئے تھے۔

”نہیں... یہ فاول ہے جہاں زیب حسن“ تم ایسا نہیں کر سکتے“ تم نے ابھی

واپس آنے کا وعدہ کیا تھا“ اپنا وعدہ پورا کرو“ پلیز۔“

گھٹی گھٹی آواز میں چلاتے ہوئے اس نے اپنا سر زور سے ٹیبل پر دے مارا

تھا۔ ہاتھ میں پہنی چوڑیوں کو زور سے دیوار پر مارتے ہوئے ایک ہی پل میں کرچی کرچی کر ڈالا۔

”تم ایسے نہیں جاسکتے مجھے چھوڑ کر“ مجھے تمہارے ساتھ جینا تھا“ صرف تمہارے

ساتھ۔“

سینے میں اٹکتی سانس کی پروا کئے بغیر وہ چلا رہی تھی، مگر وہاں اس کی صدا سننے والا تھا ہی کون؟ آنکھوں میں ریت بھر آئی تھی۔ مگر وہ بال نوچتی، خود کو کوسنے دیتی، کب ہوش کی دنیا سے بیگانی ہو گئی اسے پتہ نہ چل سکا، پورے تین دن بے ہوش رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو سب کچھ اجڑ چکا تھا۔ بہار اس کی زندگی سے روٹھ چکی تھی اور خزاں نے اس کے اندر مستقل ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

آنکھیں ایسی پتھر ہوئیں کہ ایک آنسو تک نہ ٹپک سکا، اباجی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ادھر بڑے لالہ کی زندگی کے بارے میں ڈاکٹرز زیادہ پر امید نہیں تھے۔ جہاں زیب حسن کے ساتھ جھگڑے میں وہ اپنا بھی شدید نقصان کر دیا تھا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینے میں بدل گئے تھے مگر روشنی کا سکتہ نہ ٹوٹا۔ بڑے لالہ، شدید تکلیف کے باوجود ہوش میں آتے ہی اسے پکارتے مگر اس میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ رہی تھی اور پھر وہ بھی اس سے روٹھ گئے۔ دو ماہ کے اندر اندر اس نے اپنی زندگی کے دو اہم رشتوں کو کھودیا۔ سبھی گھر والے چپ تھے جبکہ جہاں زیب حسن کے والدین اپنی طرف سے کیس



دائر کرنے کا سوچ رہے تھے مگر صورت حال سے اصل آگاہی کے بعد خاموش ہو گئے۔ روشنی اپنے جان سے پیارے بھائی کا آخری دیدار کرنے بھی نہ جاسکی تھی۔ جنہیں حادثے کے بعد گھر لایا ہی نہیں گیا تھا۔

سنائے صرف اس کے اندر ہی نہیں بلکہ پورے گرین پیلس میں اتر گئے تھے۔ اباجی کو بہت بعد میں بڑے لالہ کی رحلت کا پتہ چلا تھا۔ جس پر ایک مرتبہ پھر وہ شدید ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئے تھے۔ اور یہیں اس مرحلے پر شافیہ خان نے اپنی ہر یاد، ہر خواب، ہر درد کا گلا گھونٹ کر خود کو سنبھالا تھا۔ گرین پیلس سے ریاض لالہ کی فیملی بھی اچانک خود غرضی کا مظاہرہ کرتی رخصت ہو گئی تھی مگر اسے اپنے اباجی اب بھی ہر شے سے عزیز تھے، سو اس نے اپنی زندگی کا محور ان کی ذات کو بنالیا۔

چھوٹے لالہ اب زیادہ چپ رہنے لگے تھے۔ اس روز وہ اپنے اباجی کے بستر پر بیٹھی انہیں کھانا کھلا رہی تھی، جب چھوٹے لالہ نے اچانک جہاں زیب حسن کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور بڑے لالہ کی محبت میں جذباتی ہو کر انہیں کافی برا بھلا کہنا

شروع کر دیا۔ شافیہ خاموشی سے سنتی اور اپنے آنسو دل پر گراتی رہی تاہم جب وہ حد سے بڑھ گئے تو اس کے ضبط کی طنابیں بھی ٹوٹ گئیں۔

”بس کرو، خدا کا واسطہ ہے آپ لوگوں کو، اب بس کرو، جان تو لے چکے ہو اس کی، اب کون سی کسر باقی رہ گئی ہے، اب تو بخش دو انہیں پلیز۔“

چلا کر روتے ہوئے اس نے وہ راز افشاء کیا تھا جس کی اب تک کسی کو بھنک بھی نہیں تھی۔ چھوٹے لالہ اس کے الفاظ پر مشتعل ہوئے تھے۔

”ہم نے جان لی ہے اس کی؟ خود مرنے کا شوق تھا اسے اور ساتھ میں ہمارے بھائی کو بھی لے گیا، گھٹیا انسان۔“

”وہ گھٹیا نہیں تھا، کوئی گھٹیا کام نہیں کیا تھا اس نے، جائز طریقے سے رشتے کی بھیک مانگی تھی آپ لوگوں سے اس نے، گھٹیا ہوتا تو لیکر نکل جاتا اور آپ کو پتہ بھی نہ چلتا۔“

”شٹ اپ...“

وہ غم و غصے میں دیوانی ہو گئی تھی۔ تبھی چھوٹے لالہ کا بھاری ہاتھ اس پر اٹھ گیا۔ اور وہ پلٹ کر اباجی کے سینے پر جاگری جنگی سوچوں میں جانے کب سے

پہلے ہی اضطراب اتر آیا تھا۔ جہاں زیب حسن کی وفات کے بعد کتنی مصیبتیں نہیں آئی تھیں ان کے خاندان پر، پہلے ہی پچھتاوے کم نہیں تھے کہ اب بیٹی کے حال دل نے انہیں اور شکستہ کر ڈالا۔

ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے تھے۔ شافیہ خان کو اپنے کمزور بازوؤں کی تحویل میں لے کر انہوں نے بے حد برہمی سے اپنے بیٹے کو ڈانٹا تھا۔

”اعجاز“ تو نے یہ تھپڑ میری دھمی کے نہیں، میرے منہ پر مارا ہے۔“

ان کا لہجہ غصے اور بے بسی سے لپکپا رہا تھا۔ اعجاز لالہ فوراً کمرے سے نکل گئے۔

اور پھر رفتہ رفتہ پورے خاندان میں اس کی توقیر بڑھ گئی کسی کو اس کی کہانی کا نہیں پتہ تھا کہ اس کے اور جہاں زیب حسن کے ساتھ کیا ہوا، سوائے جہاں زیب حسن کی فیملی، اباجی، آپا، بجو، بھابی، ریاض لالہ اور اعجاز لالہ کے۔ آپا کے بچے بڑے تھے اور بھابی کے بھی، تاہم اس کے باوجود، فرحان اور سبحان کے علاوہ باقی کسی کو بھی اصل واقعات سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

شافیہ کو وہ سرد راتیں اکثر یاد آتی تھیں جب گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ صرف وہ تنہا اپنے بیمار باپ کو سنبھالتی، ان کا بچوں کی طرح خیال رکھتی، اباجی اکثر روتے ہوئے خدا سے توبہ استغفار کرتے اس کے سامنے ہاتھ باندھ دیتے۔

”روشنی... میری دھمی مجھے معاف کر دے، کتنی بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔ اب کہاں سے واپس لاؤں اسے۔“

ان کے آنسوؤں میں کتنی پشیمانی اور بے بسی ہوتی تھی، شافیہ محبت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیتی۔

زندگی نے اپنا ڈھب بدل لیا تھا۔ اب وہ زندگی کو نہیں، بلکہ زندگی اسے گزار رہی تھی۔

گھر میں کوئی بھی اس کی شادی کا نام لیتا تو اس کی حالت غیر ہو جاتی۔ روزانہ رات میں نیند کی گولیاں پھانکے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کھانا اس وقت تک نہ کھاتی جب تک پیٹ کی بھوک سے بے بس نہ ہو جاتی، سارے اچھے ملبوسات، بہانزیب حسن کے گفٹس سب box میں بند کر کے رکھ چھوڑے تھے

اس نے اور پھر اباجی کی رحلت کے بعد زندہ رہنے کی وہ آخری وجہ بھی ختم ہو گئی اس کے لیے، اباجی کی رحلت کے بعد وہ یوں ٹوٹ کر بکھری کہ پھر کسی بھی رشتے کے لیے اسے سمیٹنا ممکن نہ رہا۔ بڑے لالہ اور جہانزیب حسن کی المناک وفات کے بعد اس نے جیسے خود کو پتھر کیا تھا، ویسے ہی اباجی کی وفات پر بھی اس کی آنکھ سے ایک آنسو کا قطرہ بھی نہیں ٹپکا۔ وہ جیسے زندہ رہی ہی نہیں تھی۔ تنہائیاں بڑھی تھیں تو زخم بھی جاگ اٹھے تھے۔

اور اب راتوں میں اٹھ کر، کئی کئی گھنٹے آسمان پر ستاروں کو تکتے رہنا، جیسے اس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔

ہر ویلے تانگاں یار دیاں، میں تے بیٹھی گاگ اڑاواں

آپ و نجاں کہ میں قاصد بھیجاں، میرا تھی گیا حال نماں

غلام فریدا میں تے دوزخ سڑساں، جے میں مکھ ماہی کولوں موڑاں

کھلی کر کے توڑ دیتا اے، تے بیٹھی لکھ گلیاں دے رولاں

یار باہجوں بن جیون کیڑا، تے میرے اندر درد ہزاراں

غلام فریدا میں تے اینج روواں، جیویں و چھڑی کوچ قطاراں

اباجی کی رحلت کے دو سال بعد چھوٹے لالہ کا زبردستی بیاہ کر دیا گیا۔ شافیہ نے ذہنی اذیت کو کم کرنے کے لیے جاب کے لیے اپلائی کر دیا تھا، جس میں کامیابی کے بعد وہ باقاعدہ لیکچرار کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دینے لگی۔ شادی کے بعد چھوٹے لالہ اپنی وائف کو لیکر لندن چلے گئے، تو اسے سارہ حسن کی صورت خدا نے ایک اور رشتہ دے دیا۔

جس روز چھوٹے لالہ لندن روانگی کا پروگرام بنا رہے تھے، اسی روز سارہ مارکیٹ میں اسے ملی تھی۔ وہ رہائش کے لیے پریشان تھی اور اس کا شوہر ملک سے باہر تھا، اپنے پانچ چھ سالہ بچے کے ساتھ وہ، سرکاری ہوسپتال کے کوارٹر میں ہی رہ رہی تھی، لہذا شافیہ نے اسے اپنے ساتھ گھر میں رہنے کی آفر کر ڈالی، جسے سارہ نے فوراً قبول کر لیا اور یوں چھوٹے لالہ کے گھر سے رخصت ہوتے ہی سارہ وہاں شفٹ ہو گئی جس کے بعد اس کے بہن بھائیوں کی اس کے لیے فکر جیسے ختم ہو گئی۔



سارہ اور شافیہ کی دوستی رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ اکثر رات میں وہ اپنے بچے کو اپنے کمرے میں سلا کر خود شافیہ کے ساتھ اسی کے کمرے میں آکر سو جاتی اور پھر دونوں رات بھر جاگ کر اپنی اپنی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتیں۔

مسلل ضبط کی کوشش میں اس کی آنکھیں خون چھلکا رہی تھیں۔ تبھی سارہ حسن نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تھا جو کھڑکی میں کھڑی ڈوبتے ہوئے سورج کا اداس منظر دیکھتی جانے کس دنیا میں کھوئی تھی۔

”شافیہ...“

”ہاں...“ اس کے نرمی سے پکارنے پر وہ فوراً پیچھے پلٹی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں کے بھیگے گوشے سارہ کو پھر اداس کر گئے تھے۔

”تم نے سچ کیوں چھپایا شافیہ...؟ تم نے بتایا کیوں نہیں کہ زیب لالہ کی ڈیوٹی ہو گئی تھی...“ اس کا اپنا لہجہ بھی نرم تھا۔

شافیہ نے آہستہ سے پھر رخ پھیر کر ڈوبتے سورج کے منظر پر نگاہیں جمادیں۔

”کیسے بتاتی... ان کی ڈیوٹی کے پیچھے بہت سی کہانیاں تھیں۔ بہت سے راز چھپے تھے اور میں... اپنوں کے چہرے سے نقاب نہیں ہٹا سکتی تھی، ان رشتوں کے وقار کا بھرم نہیں توڑ سکتی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں جمع ہوئے اداس پانی کا منظر اس لمحے بڑا دل فریب تھا۔

”تم نے رشتوں کا بھرم سلامت رکھنے کے لیے خود کو توڑ لیا شافیہ...“ سارہ خود بھی کل پوری رات روئی تھی اور اب بھی اس کے لہجے میں نمی تھی۔

”کیا کرتی یار، میری تقدیر نے مجھ سے مشرقی بیٹی ہونے کا تاوان مانگا تھا۔ سو میں نے محبت لٹادی اور تھا بھی کیا میرے پاس۔“

جلتی آنکھوں میں سلگتے آنسو لیے وہ چپ چاپ سکیاں بھر رہی تھی۔

”پھر... کیا ملا شافیہ...؟ زندگی بھر کا دکھ مول لے لیا تم نے۔“

”قسمت میں تھا یار، بہت مشکل ہوتا ہے عظیم ہونا، اپنا وقار بنانا، مینی کہتی ہے میں بے حس پتھر ہوں، پتھر ایسے ہوتے ہیں سارہ...؟ میرے اندر دیکھو، کیسے کیسے کھڑ پڑ گئے ہیں، کیسے کیسے رشتے نہیں گنوائے ہیں میں نے... سب میرا قصور ہے، میں نے جان لی ہے اپنے بڑے لالہ کی، اپنے جہاں زیب

کی، ہمیشہ زیادتی کرتی رہی میں ان کے ساتھ... ہو سکتا ہے کوئی اس جیسا، کیسے لمحوں میں کفن پہن لیا انہوں نے میرے لیے، اور میں... میں دل و جان سے صرف انہی کی ہونے کے باوجود ان کا ساتھ نہ دے سکی، کیا قصور تھا ان کا، صرف یہی کہ وہ میری کاسٹ سے نہیں تھے۔ سب نے ان کی ذات کو دیکھا، یہ نہیں دیکھا کہ میری زندگی میں وہ کیا تھے...؟ آج کیا کچھ حاصل نہیں ہے مجھے...؟ مگر دیکھو سارہ! یہ میرے ہاتھ کتنے خالی ہیں، یہ میری آنکھیں دیکھو، کسی بھی لمحے آنسوؤں سے خالی ہی نہیں ہوتیں۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

سارہ نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔

”نہیں جانو، تم تو بہادر ہو تم نے وہی کیا جو مشرقی عورت کی پہچان ہے، باپ بھائیوں کی عزت کا مان رکھنا ہر اچھی بیٹی اور بہن کا فرض ہے، تم نے حقیقت میں مشرق کا سر فخر سے بلند کر دیا، تم نے دکھادیا ثانی کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے، بے حد فخر... اور میرا ایمان ہے، اس جہان میں نہیں تو اس دوسرے جہان میں جہاں زیب لالہ

ضرور تمہیں ملیں گے، کیونکہ اللہ ہمیشہ اپنے محبوب بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔“

اس کے بالوں کو نرمی سے سہلاتے ہوئے وہ اپنائیت سے بولی تھی۔

شافیہ خان نے آہستگی سے اپنا سر اس کے کندھے سے اٹھالیا۔

”مجھے بڑے لالہ یاد آتے ہیں سارہ! وہ ساری کوتاہیاں یاد آتی ہیں جو میں نے زیب کے معاملے میں کیں، کاش ایسا نہ ہوتا، لیکن... میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، بہت بڑا دھوکہ کیا ہے انہوں نے میرے ساتھ، ابھی آنے کا کہہ کر، عمر سے لمبی جدائی دے گئے مجھے، اب یہ زندگی کس کام کی یار، اب کس کے لیے بننا سنورنا، میرے لیے تو اس کائنات میں کچھ بھی نہیں رہا۔“

اس کا درد وہ درد تھا، جسے نہ بانٹا جاسکتا تھا، نہ ہی کم کیا جاسکتا تھا، تاہم اس سے پہلے کہ سارہ کچھ کہتی، بھابی جان کے شور نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

”یمنی... یمنی آنکھیں کھولو۔“

وہ چلا رہی تھیں، شافیہ اور سارہ دونوں بدحواس ہو کر کمرے سے باہر کی طرف بھاگی تھیں۔ مگر... انہیں دیر ہو چکی تھی۔

خودکشی کا قطعی ارادہ نہ رکھنے کے باوجود اس کی چہیتی بھتیجی جانے کیسے سیڑھیوں سے گر پڑی تھی، اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے سیڑھیوں سے اپنے نیچے گرنے کی خبر ہی نہ ہو سکی اور لمحوں میں اس کا پورا وجود لہو لہان ہو گیا۔ دماغ پر شدید چوٹ لگنے کے باعث ہوش کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹرز نے جیسے ہی اس کے کومے میں جانے کی اطلاع دی، شافیہ کا ضبط پھر جواب دے گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بڑا دل چسپ منظر تھا، یعنی اندر وارڈ میں تھی اور باہر شاہ زر چلا رہا تھا، اسے کوئی اندر یعنی کے پاس آنے نہیں دے رہا تھا۔ غم سے ٹڈھال ہونے کے باوجود، فرحان، سبحان اور دیگر اس کے بھانجے بھتیجے، اس سے الجھ رہے تھے۔ اسے مار رہے تھے، تبھی وہ وارڈ سے نکل کر باہر لان میں آتے ہوئے دھاڑی تھی۔

”رک جاؤ، بند کرو یہ کھیل۔“

جس شخص کی سارہ شہر اس کے پیشے اور حیثیت کی وجہ سے عزت کرتا تھا، وہی شخص دل کے ہاتھوں مجبور اپنی محبت کے نام پر خوار ہو رہا تھا۔

شافیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”بہت شوق ہے تم لوگوں کو تماشہ لگانے کا، اب بس کرو۔“

اس کا لہجہ غصے سے کپکپا رہا تھا۔ سبحان کا پارہ فوراً چڑھ گیا۔

”آپ اندر جائیں پھوپو، یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے۔“

جہاں زیب حسن کے معاملے میں بھی وہی سب سے آگے تھا اور شافیہ تب سے اسے منہ لگانا ترک کئے ہوئے تھی مگر آج پھر سے وہی کھیل دوبارہ آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھ کر وہ چپ نہ رہ سکی۔

”یہ تمہارا بھی معاملہ نہیں ہے، سمجھے تم؟“

اس کا غصہ کنٹرول سے باہر ہو رہا تھا، تبھی ریاض لالہ وہاں آئے تھے۔

”کیا بات ہے شافی، کیوں جھگڑ رہے ہو تم لوگ؟“ باپ کو سامنے پا کر سبحان

کے حوصلے بلند ہوئے تھے۔



”ابو‘ پھوپو کا دماغ خراب ہو گیا ہے‘ انہیں گھر بھیج دیں‘ فضول ٹانگ اڑا رہی ہیں ہمارے معاملے میں۔“

اس سے دو تین سال بڑا ہونے کے باوجود‘ وہ اب اس سے بے تکلف نہیں رہا تھا۔ ریاض لالہ کی توجہ اب شافیہ کی طرف ہو گئی۔

”کوئی مسئلہ ہے شافی...؟“

”ہاں بھائی...“ سر جھکا کر کہتی وہ انہیں الجھن میں ڈال گئی تھی۔

”آپ اندر چلیے‘ مجھے کچھ بات کرنی ہے آپ سے۔“

ہمیشہ لبوں پر چپ کا قفل رکھنے والی اس لڑکی نے پہلی بار سراٹھانے کی جرأت کی تھی‘ وہ حیران حیران سے ایک نظر وہاں موجود سب افراد پر ڈالنے کے بعد‘ اس کے ساتھ اندر وارڈ میں چلے آئے‘ جہاں بھابی جان‘ چھوٹے لالہ‘ ان کی وائف‘ بچو سب جمع یعنی کے بارے میں بے حد پریشان تھے۔

”اسے دیکھیں بھائی‘ یہ آپ کی بیٹی ہے‘ اللہ نے رحمت بنا کر اسے آپ کے گھر میں بھیجا ہے‘ لیکن دیکھئے‘ ذہنی الجھن نے اسے کس موڑ تک پہنچا دیا‘ آپ بیٹے کی خوشی کے لیے‘ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح اپنی بیٹی کی خوشیوں

کو قربان کر رہے ہیں لیکن ذرا سوچئے اگر اس کا وجود ہی نہ رہا تو کیا کریں گے؟“

”تمہارے منہ میں خاک‘ خبردار جو میری بیٹی کے لیے کچھ بھی غلط کہا تم نے۔“ بھابی جان کے دل پر جیسے ہاتھ پڑا تھا‘ وہ تلخی سے مسکرا دی۔

”ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ غلط کرنے والوں کو کیا کہیں گی آپ؟ میری ماں نہیں تھی‘ لہذا میں چپ چاپ آپ کے اصولوں پر قربان ہو گئی مگر ذات پات اور ضد کا وہی اثر دھا اس بار آپ کی بیٹی کو نکلنے آیا ہے‘ کیسی ماں ہیں آپ‘ آپ کو اپنی بیٹی کی آنکھوں میں چھپے آنسو نظر نہیں آتے‘ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے یا نہیں؟ یہ زندہ رہنا چاہتی ہے یا نہیں؟ لیکن... اس کا حال آپ کے سامنے ہے‘ فقط دو ماہ میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئی ہے یہ‘ کیوں رحم نہیں آتا آپ کو کسی پر‘ اور کتنا خون پلائیں گے فضول رسم و رواج کو اپنی بیٹیوں کا‘ یہ کیسا بوجھ ہے ہمارے کندھوں پر جو جان نکلنے تک کم ہی نہیں ہوتا زبان نہ کھول سکنے کی یہ کیسی سزا ہے ہماری کہ ساری زندگی خود اپنی ہی سانسوں کا عذاب سہیں...؟ یہ کیسے امتحان

ہیں ہمارے کہ جن میں کامیابی کی صورت ہمیں زندگی سے نفرت کروادی جاتی ہے، ہم اپنی خواہشوں کے لیے گھر سے بھاگنے والیوں میں سے نہیں ہیں، ہم اپنی عزت کو اپنی جان پر ترجیح دینے والوں میں سے ہیں مگر... ہمیں اتنا سا حق تو ملنا چاہئے کہ ہماری پوری زندگی کا فیصلہ کرنے سے پہلے صرف ایک بار ہم سے پوچھ لیا جائے۔“

”کیوں پوچھ لیا جائے تمہارے بڑے مرگئے ہیں کیا؟ یا ہم لوگ تمہارے دشمن ہیں؟ خوب سمجھتی ہوں میں، کون سے زخم دکھا رہی ہو تم، ضرور یمنی کا دماغ خراب کرنے میں بھی تمہارا ہی ہاتھ ہے، اسی لیے کہتی تھی میں ریاض سے، مت اکیلا چھوڑو، مت کرو اتنا بھروسہ مگر یہاں میری سنتا ہی کون ہے؟“

اس عورت نے بھابی ہو کر بھی ہمیشہ اس کے اندر نشتر ہی اتارے تھے۔ جانے وہ اس سے اتنی خائف کیوں رہتی تھیں، تاہم آنکھوں کے سامنے پڑی زندگی اور موت کے درمیان جھولتی بیٹی کے برے حال نے بھی انہیں عقل نہیں دی تھی۔

شافیہ کرب سے مسکرا نے کی کوشش میں روپڑی۔ تبھی چھوٹے لالہ کو غصہ آیا تھا۔

”زبان سنبھال کر بات کریں بھابی، میری بہن نے رشتوں کا مان سلامت رکھنے کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ پورے خاندان کو اس کے کردار پر فخر ہے، یمنی کے ساتھ جو بھی ہوا ہے وہ آپ کے اعمال اور تربیت کا نتیجہ ہے، سبھی آپ...؟“

”بس رہنے دو، سارے کے سارے بہن بھائی ایک ہی لڑی کے موتی ہو۔“ بات خود پر آتے دیکھ کر وہ اور بھی برہم ہوئی تھیں۔ جس پر آپا جان، بچو، سب نے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ سارہ حسن بھی وہیں تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ شافیہ کو غلط کہنے والی اس عورت کا منہ تھپڑوں سے سرخ کر ڈالتی۔

”آپ لوگ یہاں سے جائیں پلیز، یہ ہو سپٹل ہے، کسی جنگ کا میدان نہیں، سمجھے آپ لوگ؟“ وہ پرائے پھڑے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتی تھی مگر بھابی کی باتوں نے اسے غصہ دلا دیا تھا۔ اس کی صدا پر سب خاموش ہو گئے تھے جب وہ برہمی سے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ آپ جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں جن کو موت یاد نہیں رہتی‘ شافیہ کے ساتھ‘  
ایک عورت ہو کر جو کچھ آپ نے کیا‘ اس کی سزا آپ کی بیٹی کو بھگتنا پڑی  
ہے۔ اس کے کردار کی

بات کرتی ہیں آپ... مجھ سے پوچھیں کہ اس کا کردار کیا ہے؟ حرام کیا ہوا  
ہے اس لڑکی نے کسی بھی غیر محرم مرد کی آواز کو دانستہ سننا بھی۔ ضرورت کے  
بغیر خود سے کسی کو مخاطب کرنا‘ کیا کچھ نہیں سنا اس نے آپ کی بیٹی سے‘ اس  
کی اصلاح کے جرم میں‘ یہ غلط ہوتی تو اب تک اس کا گھر بھی آپ کے گھر  
کی طرح آباد ہوتا‘ کتنے موقع تھے اس کے پاس‘ اپنے لیے سوچنے کے مگر  
نہیں‘ اس نے ہمیشہ آپ لوگوں کا سوچا‘ پہاڑ راتوں اور عذاب دنوں کی اذیت  
اندر ہی اندر سہہ کر آج یہ اس مقام تک پہنچ گئی ہے کہ اب دل بھی اس  
کا اپنا نہیں رہا‘ مر رہی ہے یہ گزرتے ہر لمحے کے ساتھ‘ دیکھیں اس کے چہرے  
کی طرف‘ زندگی کی کوئی رمق نظر آتی ہے آپ کو یہاں‘ میں نے سنی ہیں  
راتوں میں اس کی سسکیاں‘ میں نے دیکھا ہے‘ اسے تنہائیوں میں چھپ کر

روتے ہوئے‘ آپ تو وہی ہیں جو اس کے دل کو اجاڑ کر سخت مشکل کے عالم  
میں اسے اکیلا چھوڑ آئی تھیں۔ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ کیسے تنہا خود کو اور  
اپنے اباجی کو سنبھالا ہو گا اس نے‘ اس اباجی کو‘ جسے آپ کی بے حسی اور  
دوری نے وقت سے پہلے مار کر ابدی نیند سلا دیا‘ دیکھیں اس لڑکی کو‘ پچھلے پانچ  
برسوں میں اندر ہی اندر گھٹ کر کیسا روگ لگایا ہے اس نے خود کو‘ نیند  
کی گولیاں پھانک پھانک کر اعصاب مفلوج کر لیے ہیں اس نے اپنے‘ زندہ  
رہنے کی ساری خواہشیں دم توڑ چکی ہیں اس کے اندر‘ پھر بھی اس نے کبھی  
اف نہیں کی‘ آپ کیا جان پائیں گے اس کی قربانیوں کو۔“  
تلخی سے سر جھٹکتے ہوئے‘ سب پر سرسری سی ایک نگاہ ڈالنے کے بعد‘ وہ  
روشنی سے مخاطب ہوئی تھی۔

”تمہاری دوا کا ٹائم ہو گیا ہے شافی‘ انہیں کرنے دو‘ جو کرتے ہیں‘ تم ٹینشن  
مت لو پلینز“

”نہیں سارہ اگر یمنی نے آنکھیں نہیں کھولیں تو میں بھی... میں بھی زندہ نہیں  
رہ سکوں گی۔“ اپنا ہاتھ چھڑاتی وہ یمنی کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔



”آنکھیں کھولو یمنی“ وہ دیکھو باہر شاہ زر آیا ہے، مم... میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، میں خود کرواؤں گی تمہاری اس سے شادی، تم جو چاہو گی وہی ہوگا، تم ڈاکٹر بننا چاہتی ہو ناں، ٹھیک ہے، تم ڈاکٹر بننا تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ پلیز آنکھیں تو کھولو، پلیز۔“ اس کی اپنی حالت بگڑ رہی تھی۔

اس وقت وہاں کھڑے اس کے سب اپنوں کی نگاہیں اس سچ کا سامنا کرنے سے کتر رہی تھیں جس کی بھینٹ چڑھنے والوں کو کبھی کھل کر سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔ شافیہ خان کا بلڈ پریشر پھر خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ جانے رات بھر وہ کیا کیا سوچتی رہی تھی۔ سب یمنی کو بھول کر اس کی فکر میں لگ گئے تھے۔

پورے بارہ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو وہاں ہوسپٹل کے اس شفاف کمرے میں اس کے سب اپنے متفکر چہروں کے ساتھ اس کے ہوش میں لوٹ آنے کی دعائیں کر رہے تھے۔ سارہ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔

”مبارک ہو شافو، یمنی کو ہوش آگیا ہے۔“

پہلی خبر جو اسے ہوش سنبھالتے ہی ملی تھی وہ یہی تھی۔ تبھی اس کا دل سکون سے بھر گیا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“

اوپر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد اس نے کمرے میں کھڑے تمام افراد پر نگاہ کی، شاہ زر اور سریزمان، وہیں کمرے میں ریاض لالہ کے ساتھ کھڑے، ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اگلے ہی پل اس نے نظروں کا رخ پھیر کر دیکھا، وہاں کمرے میں کھڑکی کے اس پار بڑے دنوں کے بعد خاصی روشن اور چمکیلی دھوپ بکھری تھی۔ اس نے دیکھا، وہاں کھڑکی کے اس پار دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا، اس کا جہاں زیب حسن دل کشی سے مسکرا رہا تھا۔

شافیہ کی آنکھ سے پھر آنسو کی صورت ایک شفاف قطرہ ٹوٹ کر بکھرا اور اس نے آہستہ سے جیسے تمام دکھوں سے بے نیاز ہو کر سر تکتے پر ٹکاتے ہوئے چپ چاپ پلکیں موند لیں۔

☆...☆...☆

پتھروں کی بستی میں

اسے کہنا دسمبر لوٹ آیا ہے

ہوائیں سرد ہیں اور وادیاں بھی دھند میں گم ہیں  
پہاڑوں نے برف کی شال پھر سے اوڑھ رکھی ہے

سبھی رستے تمہاری یاد میں پُر نم سے لگتے ہیں

جنہیں شرفِ مسافت تھا

وہ سارے کارڈز، وہ پرفیوم

وہ چھوٹی سی ڈائری

وہ ٹیرس، وہ چائے

جو ہم نے ساتھ میں پی تھی

تمہاری یاد لاتے ہیں، تمہیں واپس بلاتے ہیں

اسے کہنا کہ دیکھو یوں سناؤ ناں

دسمبر لوٹ آیا ہے

سنو...

تم لوٹ آؤ ناں!

ٹھنڈا اچھی خاصی بڑھ گئی تھی اور وہ گرم شال سے محروم بار بار اپنے بازوؤں کو  
اپنے جسم کے گرد لپیٹتی، ارسلان کا انتظار کر رہی تھی جو اسے بھول کر نجانے  
کہاں نکل گیا تھا۔ اسٹیج پر اب اس کی دوست نمرہ کے ہاتھوں پر مہندی لگنے  
کے ساتھ باقاعدہ رسم کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ ہجوم بڑھ جانے کے باعث اسٹیج سے  
اٹھ آئی تھی اور اب گھر واپسی کے لیے پُر تول رہی تھی مگر اس کا بھتیجا  
ارسلان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بے بسی سے وہ قریب پڑی کرسی پر ٹک گئی جب اچانک اس کا سیل بج  
اٹھا۔ اسکرین پر سارہ کا نمبر اس کے نام کے ساتھ جگمگا رہا تھا، کیفیہ نے کال  
پک کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا۔

”ہیلو...!“

”السلام علیکم جانو! کیسی ہو؟“ دوسری طرف وہ چہک رہی تھی، کیفیہ کے لب  
بھی مسکرا اٹھے۔

”ٹھیک ہوں الحمد للہ! تم سناؤ، کیسی گزر رہی ہے گاؤں کی زندگی؟“

”اے ون‘ فٹ کلاس... تم آؤ نایار! سچی گاؤں آکر پتا چلا ہے کہ زندگی کا اصل لطف کیا ہے۔“

”ہاں بھتی ہر چیز خالص جو ملتی ہے وہاں‘ مجھے یاد تو نہیں کیا ہوگا ان چھ سات دنوں میں۔“ سرد آہ بھر کر وہ اب اس سے گلہ کر رہی تھی۔ دوسری طرف سارہ اس کے معصوم سے گلے پر دھیرے سے مسکرا دی۔

”پاگل ہے تو... بھلا ایسا ممکن ہے کہ میں کہیں بھی رہتے ہوئے تجھے یاد نہ کروں؟“

”ہاں ممکن تو نہیں ہے مگر تیرا پتا کہاں چلتا ہے‘ خیر اپنے ہیرو کی سناؤ‘ کیا حال احوال ہیں؟“

”حال احوال کیا ہونے یار! یہیں گاؤں کے قریب پوسٹنگ ہو گئی ہے اس کی‘ ہر دوسرے دن ٹپکا رہتا ہے‘ اوپر سے ایسی شرارتی نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ اچھی بھلی لڑکی ہو کر کنفیوز ہو جاتی ہوں‘ کسی دن ضیاء بھائی نے دیکھ لیا تو شامت آجائے گی۔“

”کیا شامت آجائے گی‘ پولیس افسر ہیں جناب! تیرے وہ کوئی معمولی مزارع نہیں جو شامت آجائے گی۔“ وہ فوراً اس کے دفاع میں بولی تھی۔ سارہ شرمیلے سے انداز میں مسکرا دی۔

”اور ہاں! یہ جو گاؤں کی زندگی کی خوب صورتی کے قصیدے پڑھ رہی ہے ناں تو‘ اس کی وجہ بھی سمجھ میں آرہی ہے مجھے...“

”بس رہنے دے‘ اب ایسے بھی سرخاب کے پر نہیں لگے اس میں‘ تجھے تو یونہی شوق رہتا ہے اس کی قصیدہ خوانی کا‘ خیر کیا کر رہی ہو اس وقت؟“

”کچھ نہیں‘ نمرہ کی مہندی کی تقریب میں آئی بیٹھی ہوں‘ تم کیوں نہیں

آئیں؟“ جو سوال سب سے پہلے پوچھنا تھا اس کا موقع آخر میں ملا تھا اسے۔

”بس یونہی یار! تجھے تو پتا ہے میرے بھائی کتنے سخت ہیں‘ گاؤں آکر تو دہلیز سے باہر قدم رکھنے کی اجازت بھی نہیں ملتی‘ خیر تو تقریب انجوائے کر‘ میں ذرا چائے بنالوں‘ بھائی وغیرہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔“

جلد ہی گفتگو سمیٹ کر اس نے کال ڈراپ کر دی تو کیفیہ پھر سے ارسلان کا نمبر پریس کرنے لگی۔ اسی اثناء میں اچانک اس کی توجہ اپنے سے کچھ ہی



فاصلے پر بیٹھی ہوئی چھوٹی سی بچی اور اس کی گود میں چڑھے بمشکل دو سالہ کیوٹ بچے کی جانب مبذول ہوئی تھی کیونکہ بچہ ضد میں اس کی آنکھوں کے سامنے بچی کی گود سے پھسل کر زمین پر گر پڑا تھا اور اب حلق پھاڑ کر رو رہا تھا مگر وہاں اس کی طرف متوجہ ہونے والا کوئی بھی نہیں تھا کیونکہ تقریب میں موجود لگ بھگ سبھی لوگ اسٹیج پر جاری مہندی کی رسم میں مصروف تھے۔

ارسلان کا نمبر آف مل رہا تھا اور ادھر بمشکل چھ سالہ بچی زمین پر گرے ہوئے بچے کو اٹھا کر سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر بچہ اپنی ضد میں اس کے قابو نہیں آ رہا تھا تب مجبوراً اپنے گداز دل کے باعث اسے اپنی نشست چھوڑنی پڑی تھی۔

”بیٹے! بھائی اتنا رو رہا ہے، جاؤ ماما کو بلا کر لاؤ، ماما کہاں ہیں آپ کی؟“ جھک کر زمین پر ایڑیاں رگڑتے بچے کو زبردستی اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے بچی سے کہا تھا، جب وہ حیرانی سے پلکیں جھپک جھپک کر اس کی طرف دیکھتی آہستگی سے سر جھکا گئی۔

”میری ماما نہیں ہیں۔“

”ارے... کیوں...؟ میرا مطلب ہے کہاں گئیں آپ کی ماما؟“ بچی کے معصومیت سے کہنے پر وہ فوری طور پر کچھ نہ سمجھ سکی۔ تبھی وہ بولی۔

”اللہ میاں کے پاس...“

”اوہ! ویری سیڈ... سوری بیٹے! مجھے معلوم نہیں تھا، یہاں کس کے ساتھ آئی ہیں آپ؟“ گڑبڑا کر وضاحت دیتے ہوئے وہ بینچوں کے بل نیچے زمین پر ہی بیٹھ گئی تھی۔

”پاپا اور دادو کے ساتھ، دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پاپا انہیں روم میں چھوڑنے گئے ہیں اور یہ سعد ان کے پاس جانے کی ضد کر رہا ہے۔“ بچی کی عمر کم تھی مگر ذہانت قابل رشک تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ان کے قریب آگیا۔

”خُرعین...!“ کیفیہ کی پشت تھی آنے والے کی طرف، لہذا وہ اسے نہیں دیکھ سکی مگر بچی اپنے نام کی پکار پر ضرور آنے والے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”جی پاپا!“

”سعد کیوں رو رہا ہے؟“ اچلتی سی نظر کیفیہ پر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں گھسائے تھے۔ کیفیہ چاہتے ہوئے بھی پلٹ کر اس کے چہرے پر پھیلی بے زاری نہ دیکھ سکی۔

”پاپا! سعد آپ کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا۔“

حرمین وضاحت دے رہی تھی۔ کیفیہ سعد کو آرام سے کرسی پر بٹھاتے ہوئے خود اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوکے بیٹا! میں چلتی ہوں اپنا اور بھائی کا خیال رکھا کریں۔“ بچی کے گال کو نرمی سے چھو کر وہ تیزی سے پلٹ آئی جب کہ اس کی پشت پر کھڑے عظیم حیدر لغاری نے فوراً لپک کر بیٹے کو گود میں لیا اور اسے چپ کروانے کی کوشش کرنے لگا۔

☆...☆...☆

گزرتے ہر دن کے ساتھ ٹھنڈ بڑھ رہی تھی، وہ شام کے گہرے ہوتے ہی بڑی بھابی کی پکار پر ڈائجٹ پھینک کر دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے صحن میں اتر

آئی۔ جہاں آج پھر سالار آفندی خوب پھیل کر بیٹھا اس کے بڑے بھائی کے ساتھ گپیں لڑا رہا تھا۔ کہنے کو وہ خاصا میچور اور آفیسر بندہ تھا مگر سارہ کے ساتھ اس کی چھیڑ چھاڑ اور بچکانہ حرکتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ جتنا اس کے سائے سے دور بھاگتی تھی اتنا ہی وہ قریب آکر اسے زچ کرتا تھا۔

اس وقت بھی اسے دیکھ کر منہ پھیرتے ہوئے وہ بڑے دل فریب انداز میں مسکرایا تھا۔

”سارہ! میں نے سالن تیار کر لیا ہے تو جلدی سے روٹی ڈال لے، سالار بھائی آئے ہوئے ہیں تیرے بھائی کے ساتھ ہی کھانا کھالیں گے۔“

جونہی اس نے باورچی خانے میں قدم رکھا بھابی کا حکم نامہ شروع ہو گیا۔ وہ تپ کر ہونٹ بھینج گئی کیونکہ سامنے بیٹھے بڑے بھائی اور سالار آفندی کی موجودگی میں ان سے کچھ بھی کہنا ممکن نہیں تھا۔ اسے حکم سنا کر اگلے ہی پل

وہ باورچی خانے سے باہر نکل گئیں تو سارہ نے جلے دل کے ساتھ پیڑھی

سنبھال لی، کیونکہ سالار کی نظر سیدھی اس کے تپے ہوئے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ اسے چڑانے کے لیے مسکرا رہا تھا۔

”اور سنا... وہ بابا حکیم کے بیٹے والے کیس کا کیا بنا؟“ ضیاء بھائی چونکہ اس کے ماموں زاد سالار آفندی سے بھی چھ سات سال بڑے تھے لہذا اس کے ساتھ بھی ان کا سلوک بزرگانہ ہی تھا، جسے وہ قطعی محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی ان کے سوال پر وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

”بنا کیا تھا بھائی! بیس سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی، میرے آنے سے پہلے ہی مدعیوں نے کیس کھڈے لائن لگوادیا، اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”ہاں! ہو تو کچھ نہیں سکتا مگر بڑی زیادتی ہوئی ہے بے چارے کے ساتھ، ایک ہی بیٹا وہ بھی قطعی بے قصور... صحیح کہتے ہیں کہنے والے یہ پیسہ بڑی ظالم چیز ہے، سزاوار کو پھانسی کے تختے سے بچالائے اور بے قصور کو ساری عمر جیل میں سڑا دے، بندہ کس سے گلہ کرے، کہاں انصاف مانگنے جائے۔“ ان کے لہجے میں درد تھا۔ سالار ان کی رحم دلی کے احساس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

”بس بھائی! دنیا کا یہی دستور ہے۔ اب میں اور آپ کتنے لوگوں کو انصاف دلا سکتے ہیں یہاں تو ہر فیئلہ میں کالی بھیڑیں منہ چھپائے بیٹھی ہیں۔ اعلیٰ افسران

تک بات پہنچتی ہی نہیں اور نیچے زندگیوں کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ ذرا سے پیسوں کے ہونے سے رپورٹ آپ کے حق میں اور نہ ہونے سے رپورٹ مخالف پارٹی کے حق میں، کون دیکھتا ہے ایسی بے ایمانی؟ ذرا سا قلم ہی تو چلتا ہے بہر حال میں اب چلتا ہوں، آپ فارغ ہوں تو کبھی بھابی کے ساتھ گھر کا چکر لگایے گا۔“ تیزی سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تو سارہ نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

”کھانا کھا کر جانا سالار! سارہ روٹی ڈال رہی ہے۔“ اسے اٹھتے دیکھ کر ضیاء بھائی نے فوراً روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ معذرت کر گیا۔

”نہیں بھائی! کل سہی... آج کہیں جانا ہے اس لیے تھوڑا سا مصروف ہوں۔ اچھا پھر خدا حافظ!“ اسے شاید کچھ یاد آگیا تھا۔ اس لیے فوراً اٹھ کر اندر کمرے میں نماز پڑھتی فائزہ بیگم سے پیار لے کر، سرسری سی نگاہ چلتے ہوئے باورچی خانے میں بالکل سامنے پیڑھی پر بیٹھی ہوئی سارہ پر ڈالتے ہوئے وہ سرعت سے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆...☆...☆



سارہ نایاب اور کیفیہ ہمدانی کی دوستی بچپن میں ہی اسی گاؤں میں پروان چڑھی تھی۔ سارہ کی والدہ، کیفیہ کی والدہ کی بہت اچھی دوست تھیں اور ان کے والد کا بھی آپس میں کافی ملنا ملنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں گھرانے بلا روک ٹوک ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ سارہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور تین بڑے بھائیوں کی واحد بہن تھی۔ اس کے دادا وسیع زمینوں اور باغات وغیرہ کے ساتھ ساتھ شہر میں کئی مکانات کے مالک تھے۔ ان کی رحلت کے بعد ان کی ساری جائیداد اس کے والد صاحب کے حصے میں آگئی کیونکہ وہ اپنے والد کے اکلوتے وارث تھے اب چونکہ اس کے والد کی بھی رحلت ہو چکی تھی تو ساری جائیداد اس کے بھائیوں کے قبضے میں آگئی تھی۔

والد کی زندگی تک اس کی زندگی بڑی پُر آسائش تھی اسے پڑھ لکھ کر کچھ نہ کچھ بننے کا شوق تھا، مگر اس کے بھائی اس کی پرائمری کے بعد تعلیم کے حق میں نہیں تھے، ان کا بس نہ چلتا تھا کہ آگے پڑھنے کی خواہش کرنے پر وہ اس کی سانس روک دیتے، تاہم اس کے والد نے اس کا ساتھ دیا تھا، اپنے بیٹوں کی مرضی کے خلاف انہوں نے اکلوتی بیٹی کی خواہش پر نہ صرف اسے

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی بلکہ شہر میں اس کے قیام کے لیے ہوٹل میں رہنے کی اجازت بھی دے دی، جو کم از کم اس کے بھائیوں کے لیے کسی طور قابل برداشت بات نہیں تھی مگر مصیبت یہ تھی کہ تینوں میں سے کوئی بھی باپ کے فیصلوں میں ٹانگ اڑانے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔

سالار اس کی پھوپھو کا چھوٹا بیٹا تھا، اس کی پھوپھو اس کے والد سے چھوٹی تھی اور ان کے بس دو بیٹے ہی تھے، بڑا بیٹا آرمی میں تھا اور ہر چھ ماہ کے بعد مختلف شہروں میں اس کی پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ سالار کو پولیس لائن میں دلچسپی تھی لہذا وہ اسی لائن کی طرف آگیا تھا۔

کیفیہ ہمدانی کے والد پروفیسر تھے، لہذا اپنی سہولت کے لیے روزانہ شہر سے گاؤں کا سفر ترک کرتے ہوئے انہوں نے شہر میں ہی گھر تعمیر کروالیا تھا اور یوں میٹرک سے پہلے ہی کیفیہ اسے چھوڑ کر شہر چلی گئی۔ میٹرک کے بعد کالج میں دوبارہ دونوں کا ملاپ ہوا تھا۔ کیفیہ کا صرف ایک بڑا بھائی تھا جو اس سے تقریباً دس پندرہ سال بڑا تھا، لہذا ان کے بچے بھی اس کے برابر آگئے تھے۔ اس کے والدین چونکہ اس کے بچپن میں ہی وفات پا چکے تھے۔

لہذا شروع سے ہی اس کے مزاج میں حساسیت در آئی تھی۔ کسی کو بھی مشکل میں دیکھتی تو آنکھیں بھر آتیں، نرم دلی اور مروت جیسے اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ابھی ان کا بی اے کلیئر بھی نہیں ہوا تھا کہ سارہ کے والد کی وفات ہو گئی، وہ اینول پیبرز دیئے بغیر والد کی وفات پر گھر آئی تو پھر اس کے بھائیوں نے دوبارہ اسے شہر کا رستہ دیکھنے ہی نہیں دیا وہ چونکہ اپنے والد کے ساتھ ساتھ بھائیوں سے بھی بہت پیار کرتی تھی لہذا ان کے حکم پر بنا چوں چراں آرام سے گھر بیٹھ گئی۔

سالار نے اس موضوع پر ایک دوبار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس کے ہاتھ ہی نہ لگی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے سالار اچھا نہیں لگتا تھا وہ اسے پسند کرتی تھی مگر اپنی پسند سے زیادہ اسے اپنے بھائیوں کی عزت کا خیال تھا، وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس سے اس کے بھائیوں کی رائے اس کے بارے میں خراب ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی سالار اس کی راہ روکتا یا اس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سختی سے اسے

ڈپٹ کر رکھ دیتی۔ تعلیم چھوڑنے کے بعد گاؤں میں اس کا زیادہ تر وقت ماں کی خدمت میں یا گھر کے کام کاج میں ہی بسر ہوتا تھا۔

اس شام بھی ماں کے حکم پر وہ سالار کے گھر کی طرف آئی تھی، اسے گاجر کا حلوہ دینے کیونکہ وہ کئی روز سے ان کے گھر نہیں آیا تھا۔ اس وقت بھی وہ گھر نہیں پہنچا تھا لہذا وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ آئی تھی مگر ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ وہ راستے میں مل گیا۔ سارہ کا دل اسے سامنے دیکھ کر تیزی سے دھڑکا تھا مگر بظاہر وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتی چلتی رہی۔ تبھی اس کی سرکاری گاڑی کے ٹائر عین اس کے قدموں کے قریب چرچرائے تھے۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ حسب معمول اس کی شرارت پر خفا ہوتے ہوئے وہ تپ اٹھی تھی۔ سالار کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا دھیرے سے مسکرا دیا۔

”خیریت! اس ٹائم کہاں سے آرہی ہو؟“ اس کی خفگی بھرے سوال کو اس نے اہمیت نہیں دی تھی۔

”کہیں سے نہیں، راستہ چھوڑو میرا۔“ وہ جتنا گھبرا رہی تھی، سالار کو اسے تنگ کرنے میں اتنا ہی مزا آتا تھا کیونکہ بچپن سے وہ اسے پسند کرتا آ رہا تھا۔ مگر سارہ اس بات سے قطعی بے خبر تھی۔

”اگر نہ چھوڑوں تو...؟“ گاڑی سے نکل کر عین اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔ سارہ کا دل اور تیزی سے دھڑک اٹھا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے، اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”اماں کی پریشانی کا اتنا خیال اور میرے جذبات کی کوئی قدر نہیں۔“ صد شکر کہ وہ راستہ زیادہ آباد نہیں تھا ورنہ آتے جاتے کوئی دیکھ لیتا تو اچھی خاصی کہانی بن جاتی۔ سارہ اب حقیقی معنوں میں پریشان ہو اٹھی تھی جب کہ وہ پُر شوق نگاہوں سے اس کے گہرائے گہرائے سے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”سالار پلیز...!“ بالآخر بھیگی پلکیں اٹھا کر اس نے ملتی انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

”ایک شرط پر راستہ چھوڑوں گا۔“

”کیسی شرط...!“ وہ موقع کا فائدہ اٹھا رہا تھا اور ادھر سارہ کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

”پہلے وعدہ کرو کل گھر ملنے آؤ گی۔“

”پاگل ہو گئے ہو کیا، بھائی روز آنے جانے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے آج قدرت نے تم سے دو، دو ہاتھ کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے تو کیوں نہ یہیں فائدہ اٹھالوں۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ سارہ کے ہاتھ سرد پڑ گئے۔

”سالار میں کہہ دیتی ہوں اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہاری جان لے لوں گی۔“

”اچھا! مثلاً کیسے...؟“ عادت کے عین مطابق اسے سارہ نایاب کو تنگ کرنے میں مزا آ رہا تھا جب کہ وہ روہانسی ہو رہی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا وہ اس پر جھپٹی اور اسے شانے کے قریب سے اتنی زور سے کاٹا کہ وہ بلبلا اٹھا۔



”ایسے...“ اس کے دھکا دینے پر کچھ جتنی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنبھل کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی جب کہ وہ اس کے اس قدر جارحانہ انداز پر دانت پیس کر رہ گیا۔

”بد تمیز...!“

☆...☆...☆

وہ گہری نیند سو رہی تھی اور گاڑی کا مسلسل بجتا ہارن اس کی بیٹھی پُرسکون نیند میں خلل ڈال رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ مسلسل بجتے ہارن نے اس کی پُرسکون نیند کو بالآخر ختم کر دیا تھا۔ وہ خاصے کوفت بھرے انداز میں اٹھ کر بیٹھی تھی۔

”بد تمیز... جاہل... پتا نہیں کس پینڈو کو اللہ نے گاڑی دے دی ہے جو جان کا عذاب بننے پر تلا ہوا ہے۔“ اپنے ریشمی بال دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے

ہوئے وہ بستر سے اٹھ کر باہر روڈ کی جانب کھلنے والی کھڑکی طرف بڑھ آئی۔

پچھلے چار روز کی مانند اس وقت بھی اس کے گھر کے عین سامنے والے بنگلے کے بڑے سے گیٹ کے سامنے گاڑی کھڑی تھی اور کوئی ہارن پر ہاتھ رکھ کر

اسے ہٹانا بھول گیا تھا۔

”ایک نمبر کا لوفر“ آوارہ شخص ہے، بھلا یہ کوئی وقت ہے گھر واپسی کا، اوپر سے نوابیاں دیکھو اپنے گھر کے افراد کا نہیں تو کم از کم محلے والوں کے سکون و آرام کا ہی خیال کرے مگر اتنی تمیز اللہ نے دی ہو تب ناں!“ غصے میں اپنے ناخن چباتے ہوئے وہ جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی۔

فجر کی اذان ہونے میں بس کچھ ہی وقت باقی تھا لہذا تہجد کی نماز کی نیت سے وضو کرنے وہ واش روم میں گھس گئی۔ چار نوافل کی ادائیگی کے بعد ایک عجیب سے نور بھرے سکون نے جیسے اسے اپنے حصار میں لے لیا، وہ وہیں مصلے پر بیٹھی فجر کی اذان تک مختلف آیات کا ورد کرتی رہی پھر فجر کی نماز مکمل یکسوئی سے ادا کر کے کچھ دیر کلام پاک کی تلاوت

کی اور پھر کمرے سے نکل آئی۔ نیچے کچن میں حسب معمول بھابی ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں اور ان کا سب سے چھوٹا بیٹا کچن میں ہی ان کے پاس کھڑا اٹھلاتے ہوئے جانے کس چیز کی فرمائش کر رہا تھا۔

”السلام علیکم بھابی! طلحہ کیوں رو رہا ہے؟“ بھابی اس کی پکار پر فوراً چونک کر پلٹیں۔

”ارے میں آٹا گوندھ رہی ہوں اور یہ صاحب آملیٹ کے لیے ضد کر رہے ہیں، اب ہاتھ فارغ ہوں گے تو ہی موصوف کی فرمائش پوری کر سکوں گی ناں۔“

”ہاہا... بات تو بالکل ٹھیک ہے آپ کی، یہ اپنے طلحہ صاحب دن بہ دن کچھ زیادہ ہی خراب نہیں ہوتے جارہے۔“ ایک چھوٹی سی دھپ اپنے ننھے منے بھتیجے کی پشت پر رسید کرتے ہوئے اس نے اپنی سادا سی بھابی کے شکوے کو خوب انجوائے کیا تھا پھر ان کے فارغ ہونے سے قبل ہی اس نے آملیٹ بنا کر بھتیجے صاحب کی فرمائش پوری کر دی۔

”بھابی! یہ سامنے بنگلے میں کون جاہل لوگ آکر ٹھہرے ہیں؟“ بھتیجے کی ٹیٹیں بند ہوتے ہی اس نے بھابی سے پوچھا تھا کیونکہ کل رات کی بے آرامی اسے بھتیجے کو روتے دیکھ کر پھر یاد آگئی تھی۔ بھابی نے اس کے سوال پر ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

”ارے جاہل کہاں، خاصی پڑھی لکھی فیملی ہے۔ بے چاری زینب بی کے شوہر پی آئی اے میں بائیس گریڈ کے آفیسر تھے۔ چند سال پہلے ان کی رحلت ہو گئی اب اکلوتا بیٹا سنا ہے پی آئی اے میں پائلٹ ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں موصوف کے، ابھی کچھ عرصہ پہلے اس کی بیوی کی بھی اچانک وفات ہو گئی۔ اسی لیے خاصا سر پھرا ہو گیا ہے، سنا ہے بہت پیار کرتا تھا اپنی بیوی سے، محبت کی شادی تھی۔“

”اوہ ویری سیڈ! ویسے آپ کو یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟“

”بہت اچھی خاتون ہیں زینب بی! تم ان کے چہرے پر بکھرا نور دیکھو ناں کیف! تو سچ حیران رہ جاؤ، ہر وقت وضو میں رہتی ہیں اور اللہ کو یاد کر کے روتی رہتی ہیں، انہیں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ جیسے ہم بس زندگی کو ضائع کر رہے ہیں۔“

بھابی زینب بی سے خاصی متاثر دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

”سارے دن کمرے میں گھسی بے کار کاموں میں وقت برباد کرتی رہتی ہو“  
 کبھی لگایا کرو ادھر کا چکر، ذرا دل ہی بہل جائے بے چاری بوڑھی عورت کا۔“

”ہاں! دیکھوں گی۔ ان کے بیٹے نے پچھلے چار روز سے سارے محلے والوں کی  
 ناک میں دم کیا ہوا ہے، اس کی شکایت تو لگانی ہی ہے۔“

اپنے بھتیجے کی پلیٹ سے آملیٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے  
 اس نے تفصیلاً زینب بی کے بیٹے کی حرکت سے متعلق تمام تر شکایت ان  
 کے گوش گزار کردی تھی جس پر ایک مرتبہ پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے خود  
 بھی اپنے ڈسٹربنس کا اظہار کرتیں، اپنے اور کیفیہ کے لیے چائے کا پانی رکھنے  
 لگیں۔

☆...☆...☆

”سالار پتر! میں پچھلے کئی روز سے تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہ رہی تھی،  
 تم آئے کیوں نہیں؟“ سارہ کی بدتمیزی کے باعث اس بار سالار نے کئی روز  
 بعد اپنی پھوپھو فائزہ بیگم کے گھر کا چکر لگایا تھا جس پر وہ اس سے شکوہ کناں

تھیں۔ تاہم اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ وہ کیوں نہیں آرہا تھا۔ تبھی سر جھکا کر زیر  
 لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”کچھ مصروف تھا پھوپھو! دو تین کیس ایسے چل رہے تھے کہ گھر جانے کی بھی  
 فرصت نہیں مل رہی تھی، بہر حال خیریت تو تھی ناں؟ کون سی ضروری بات  
 کرنا چاہ رہی تھیں آپ؟“

”ہے ایک بات، جو مجھے بہت پریشان کر رہی ہے مگر سمجھ میں نہیں آرہا کہ  
 کیسے تم سے کہوں؟“

ان کے تینوں بیٹے ضیائی، ریاض اور شاہد کسی جھگڑے کی پچائیت میں مصروف  
 ہونے کے باعث ابھی تک گھر نہیں آئے تھے اور فائزہ بیگم نے اسی وقت کا  
 فائدہ اٹھایا تھا۔ سارہ البتہ اپنی بھابی کے ساتھ جان بوجھ کر باورچی خانے میں  
 مصروف ہو گئی تھی۔

”کہیں ناں پھوپھو! میں سن رہا ہوں۔“ اس کے اصرار پر کچھ الجھتی نگاہوں سے  
 اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پھر سر جھکا گئی تھیں۔



”سالار! تم تو جانتے ہو پتر! سارہ میری اکلوتی دھی ہے، جسے میں نے اور تمہارے مرحوم پھوپا نے بڑی منتوں مرادوں کے بعد رب سوہنے سے پایا تھا، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے اور تیرے مرحوم پھوپا نے اس کی سگائی تیرے جیسے سوہنے گھرو پتر کے ساتھ اسی لیے طے کی تھی کہ ہماری دھی اس آنگن سے رخصت ہونے کے بعد بھی سدا سکھی رہے۔“

”جی پھوپو میں جانتا ہوں لیکن بات کیا ہوئی ہے۔ کیا اب آپ سارہ کی شادی میرے ساتھ نہیں کرنا چاہتیں؟“

”ایسی بات نہیں ہے بیٹے!“ اس کے الجھن بھرے انداز پر ذرا سی دیر کو انہوں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو ان کی پرنور آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھ کر وہ بے قرار ہو اٹھا۔

”پھوپو آپ... آپ رو کیوں رہی ہیں؟ آخر بات کیا ہے؟“ وہ اچھا خاصا پریشان ہو اٹھا تھا۔ فائزہ بیگم نے اپنے بہتے آنسو پی لیے۔

”سالار پتر! وقت بڑا ظالم آگیا ہے، رو پے پیسے کی ہوس نے سارے رشتوں کی خوب صورتی اور احترام کو نگل لیا ہے، مجھے لگتا ہے جیسے میری معصوم دھی

بھی اسی اژدھے کی بھوک کی نذر ہو جائے گی۔“ وہ بہت مدہم آواز کے ساتھ بول رہی تھی۔ سالار کا دل انجانے سے خدشے کے احساس سے دھڑک اٹھا۔

”آپ... کہنا کیا چاہتی ہیں پھوپو...؟“

”وہی جو مجھے نہیں کہنا چاہیے۔ سالار... تم...!“

ابھی ان کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ بیرونی دروازہ ٹھک سے کھلا اور اگلے ہی پل ضیائی، ریاض اور شاہد خاصے خوش گوار موڈ کے ساتھ گھر کے اندر چلے آئے۔

”یہ لوگ آگئے ہیں میں تم سے بعد میں بات کروں گی، کل یا پرسوں چکر ضرور لگانا۔“ اپنے بیٹوں کو آتا دیکھ کر وہ اچانک بوکھلا گئی تھیں جس پر سالار مزید الجھ کر رہ گیا، تاہم اس سے پہلے کہ وہ ان سے کچھ پوچھتا، شاہد تھل تھل کر تاویں فائزہ بیگم کے کمرے میں چلا آیا۔

”آ... میرا یار آیا ہوا ہے، بڑے دنوں کے بعد شکل دکھائی تو نے، کیسی چل رہی ہے تیری تھانے داری؟“ اس سے بغل گیر ہو کر سالار کے مضبوط وجود

کو اپنی طاقت ور بانہوں میں کستے ہوئے اس نے پوچھا تو مجبوراً سالار کو دکھاوے کی مسکراہٹ لبوں پر سجانی پڑی۔

”اچھی چل رہی ہے تُو سنا“ کہاں مصروف رہتا ہے آج کل سارا سارا دن۔“  
 ”کہاں ہونا ہے یار! ان کمی کین لوگوں کے جھگڑے ہی ختم نہیں ہوتے“ وہ  
 اسلم لوہار نہیں ہے اس کی بیٹی کی کسی نے عزت خراب کر کے لاش میرے  
 یار راشد کے کھیتوں میں پھینک دی“ سارا گاؤں اس پر شک کر رہا تھا“ بڑی  
 مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں اس کی۔“ شاہد کے لہجے میں گہرا سکون اور  
 فخر تھا۔ سالار کن انکھیوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”کیسے چھڑا کر آئے ہو جان؟“

”کیسے چھڑانی تھی یار؟ ان کمی کین بھوکے ننگے لوگوں کو جب تک ان کی  
 اوقات یاد نہ دلاؤ“ یہ سیدھی راہ پر نہیں آتے۔ میرا خیال تھا کچھ روپے پیسے  
 سے بات بن جائے گی مگر وہ سالی اسلم لوہار کی بیوی بات نہیں مان رہی تھی،  
 گھوم گیا میرا میٹر... اور میں نے سارا کیس خود ان دونوں میاں بیوی پر  
 ڈال کر اندر کروادیا انہیں، اب دیکھوں گا کیسے چڑ چڑ کرتی ہے میرے

سامنے۔“ سالار کو اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی لہذا لب بھینچ کر رخ پھیر  
 گیا۔ ضیاء بھائی اور ریاض بھی اسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے، وہ فائزہ بیگم کو  
 تسلی دے کر صحن میں ان کے پاس آ بیٹھا۔

”آشہزادے! سنا ہے آج کل بڑی نیکی اور بھلائی کی مہم پر لگا ہے“ خیال رکھنا  
 یار! پانی میں رہ کر کوئی مگر مجھ سے بیر نہیں لیتا اور تیری جو نوکری ہے، اس  
 میں تو ویسے بھی ایمان داری نہیں چلتی، بندہ زیادہ سیدھا ہو کر چلے تو منہ کے  
 بل گرنا پڑتا ہے“ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟“ ریاض بھائی نے اس کی  
 پیٹھ تھپکتے ہوئے ہزار بار پہلے کی، کی ہوئی نصیحت پھر اس کے کان میں  
 انڈیلی، جسے وہ معمول کے مطابق سنی ان سنی کرتے ہوئے سر جھٹک گیا۔

”مجھ جیسے چند افسران کی نیکی اور بھلائی سے کچھ نہیں ہوتا ریاض بھائی! جتنا زہر  
 اس ملک کی جڑوں میں پھیل چکا ہے، اس کے لیے بڑے پیمانے پر صفائی کی  
 ضرورت ہے، آپ اطمینان رکھیے ابھی ان چھوٹے موٹے دیہاتوں میں آپ جیسے  
 با اثر زمین داروں کی طاقت کا سورج ڈوبنے والا نہیں۔“ اس کی سنجیدگی سے کہی

بات پر ریاض وڈیرا نے بڑا بے ڈھنگا قہقہہ لگایا تھا۔ وہ ان کے قریب سے اٹھ کر کچن کے دروازے پر آکھڑا ہوا۔

”بھابی! ایک گلاس پانی ملے گا؟“

نظریں چاول پکاتی سارہ کے تپے ہوئے چہرے پر جما کر وہ بظاہر ضیاء بھائی کی بیوی زہرا سے پانی مانگ رہا تھا، جو اس کی شرارت پر خود بھی مسکرا اٹھی تھیں۔

”دیتی ہوں‘ سارہ چاول بنا رہی ہے چاول کھا کر جانا۔“

”نہیں بھابی! رہنے دیں آل ریڈی ان کے ہاتھوں بہت کچھ کھا چکا ہوں میں۔“ خوب صورت نگاہوں میں ہزاروں شکوے مچل رہے تھے۔ وہ اس کی طرف سے دانستہ رخ پھیر گئی۔

”آج سردی میں پہلے کی نسبت زیادہ شدت محسوس ہو رہی ہے‘ ہے ناں!“

بھابی زہرا سے گلاس لے کر پانی پینے کے بہانے وہ پنجنوں کے بل چولہے کے قریب سارہ کے سامنے ہی بیٹھ گیا تھا، جس پر وہ خفگی سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی مدہم لہجے میں بولی۔

”مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی، کل اتوار ہے تم گھر پر ہو گے ناں؟“

”نہیں! گھر پر تو نہیں ہوں گا لیکن آجاؤں گا، کیوں خیریت ہے ناں؟“

”پتا نہیں! کل عصر کے بعد چکر لگاؤں گی، آجانا گھر۔“

”ٹھیک ہے جو سرکار کا حکم! اب جاؤں؟“

”ہاں...!“

لکڑیاں گیلی ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ساتھ سالار سے بھی چولہے سے اٹھتا دھواں برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لہذا لو دیتی نگاہوں سے کچھ پل مسکرا کر اسے دیکھنے کے بعد وہ اس کے قریب سے اٹھ آیا تھا۔

☆...☆...☆

اگلے روز عصر کی نماز کے بعد وہ بھابی کو بتا کر فائزہ بیگم کی باقاعدہ اجازت سے سالار آفندی کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کی بھابی فاطمہ صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی جب کہ ماں آمنہ بیگم ابھی جائے نماز پر بیٹھی مختلف تسبیحات کا ورد کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سالار کے پکارنے پر اس کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔

شدید سرد موسم میں بھی اس نے یونیفارم شرٹ اتار کر صرف بنیان پہن رکھی تھی، وہ ایک نظر اسے بستر میں گھسے دیکھ کر جزبہ سی ہو گئی۔

”آجاؤ یار! کب سے راہ دیکھ رہا ہوں، تم تو امریکی وزیر خارجہ بن گئی ہو۔“  
کہانیوں کے بل اٹھ کر وہ بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ سارہ نے بیڈ سے قدرے فاصلے پر پڑی کرسی سنبھال لی۔

”اللہ معاف رکھے مجھے امریکی وزیر خارجہ بننے سے۔“

”صحیح کہہ رہی ہو، کہاں وہ پیروں سی صورت اور کہاں تم چڑیلوں کی ملکہ!“  
اس کو چڑیل کہنے پر سارہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”تو تمہیں کون کہتا ہے چڑیلوں کی ملکہ کے ناز اٹھاؤ، ویسے بھی یہاں اس وقت میں تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئی۔“

”اچھا! پھر کیا پیار کرنے آئی ہو؟“ نچلا لب دبا کر اس کے شرارت سے کہنے پر وہ پھر سلگ کر رہ گئی۔

”سالار! اگر تم نے ایسی ہی فضول باتیں کرنی ہیں تو میں جارہی ہوں گھر واپس۔“ اسے لفظوں سے زیادہ اس کی نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی تبھی فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی تو وہ گڑبڑا گیا۔

”بیٹھو! جان نکال دوں گا اگر یہاں سے ہلی تو...“ کمبل پھینک کر وہ بستر سے نکل آیا تھا۔ ناچار اسے دوبارہ بیٹھنا پڑا۔

”چلو بولو کیا بات ہے، پھوپو بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر بات ادھوری رہ گئی۔“

”مجھے ان کا تو نہیں پتا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں مگر جو بات میں کہنا چاہ رہی تھی وہ یہ ہے کہ ابھی کچھ روز قبل یہاں اسلم لوہار کی بیٹی کا جو قتل ہوا ہے، میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اس لڑکی کا ہمارے گھر بہت آنا جانا تھا اور جو شاہد بھائی ہیں ناں ان کی بھی کافی نیت خراب تھی اس پر، میرے سامنے کئی بار اس کی بانہہ پکڑی تھی انہوں نے، جس پر ایک بار اس نے تھپڑ بھی مارا تھا انہیں، یہ بات ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی ہے۔ سالار! ان لوگوں کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے قتل میں



ضرور بھائی کے دوست کا ہاتھ ہوگا‘ ہو سکتا ہے بھائی نے اس کی کوئی مدد کی ہو تو پلیز تم چاچا اسلم اور ان کی بیوی کو چھوڑ دو ناں‘ وہ تو خود ظلم کا شکار ہیں۔“

”پتا ہے مجھے لیکن ان لوگوں کے خلاف مقدمہ بنانے والے خود تمہارے بھائی ہیں سارہ! آج ایف آئی آر رپورٹ پڑھی ہے میں نے‘ اسلم لوہار اور اس کی بیوی کے خلاف تمہارے معزز بھائی کے چند دوستوں نے خود تھانے جا کر یہ بیان دیا ہے کہ پسند کی شادی کے لیے گھر سے بھاگنے پر خود اسلم لوہار اور اس کی بیوی نے بے دردی سے اپنی بیٹی کو مار ڈالا۔ یہ بھی لکھا گیا کہ اس لڑکی کے گاؤں سے باہر کسی شخص کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات تھے‘ لہذا گھر والوں نے غیرت کے جوش میں آکر اسے کھیتوں میں قتل کر ڈالا‘ جس کے چشم دید گواہ تمہارے بھائی کے معزز دوست ہیں۔ اب بتاؤ بھلا کیا میں تمہارے بھائیوں کے ساتھ جنگ کروں، جب کہ ان کے تعلقات مجھ سے بھی اوپر ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے تھانے دار ہو کر بھی تم سب کی طرح چپ چاپ ان لوگوں کی بے بسی کا تماشا دیکھو گے؟“ اس کے دل میں دکھی انسانیت کا گہرا درد تھا۔ سالار نے لب بھینچ کر رخ پھیر لیا۔

”اور کیا کروں... تم بتاؤ؟“

”ریزائن دے دو جاب سے اور آکر میرے بھائیوں کی زمین پر کاشت کاری شروع کر دو۔“ وہ پتی تھی اور سالار کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے الفاظ پر ہنسی آگئی۔

”اچھا مشورہ ہے غور کروں گا اس پر اور کوئی حکم؟“

”اور چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جاؤ‘ یہی بہتر ہے تمہارے لیے کل کو میرے ساتھ بھی یہی سب ہو گیا تو یونہی ہنستے رہنا۔“

اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے یونہی جذبات میں اس نے کہہ دیا تھا مگر جواب میں سالار کی طرف سے پڑنے والے بھرپور تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔

”آج ایسی بکواس کی ہے، دوبارہ کبھی کوئی فضول لفظ منہ سے نکلا تو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا تمہیں سمجھی...“ پل میں موڈ خراب ہوا تھا اس کا، وہ گال پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر حیرانی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

☆...☆...☆

اے ڈھلتی شام کے لمحو

ابھی نہ لوٹ کے جاؤ

مجھے کچھ وقت تو دے دو

کہ سوچوں کے درپچے سے

کسی کو یاد کرنا ہے

گزرنے والا یہ دن بھی

کسی کے نام کرنا ہے

شدید بخار کے باوجود خود اپنے آپ سے بے نیاز وہ اپنے گھر کے سر سبز لان میں بیٹھا بے حد بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کیفیہ صبح سے کئی بار اسے وہیں بیٹھا دیکھ چکی تھی۔ دو تین دن کی ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو اس کے اندر

کے حال کا بخوبی پتا دے رہی تھی۔ وہ یونہی بے مقصد ٹیس کے آہنی جنگے پر کہنیاں ٹکائے اسے اپنے آپ سے بے نیاز دھوپ سینکتے ہوئے دیکھتی رہی کہ اچانک اسے حیران ہونا پڑا۔

ابھی چند روز قبل نمرہ کی شادی کی تقریب میں جو بچی اسے بہت پیاری لگی تھی، وہی بچی ہاتھ میں کوئی برتن اٹھائے اب اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔

”پاپا! یہ دادو نے سوپ بنایا ہے آپ کے لیے، پی لیں۔“ وہ ہو بہو اپنی ماں کی کاپی تھی۔ عظیم نے ایک نظر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں پکڑے سوپ کے پیالے پر ڈالنے کے بعد اس کے ہاتھ سے پیالہ پکڑ کر اپنے سامنے دھرے ٹیبل پر رکھا اور اسے پیار سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

”حرمین! کیا ماما اللہ میاں کے پاس جانے سے پہلے آپ کو یہ کہہ گئی تھیں کہ آپ نے ان کے بعد اس طرح سے پاپا کا خیال رکھنا ہے۔“ پلکوں کے گوشوں میں ہلکی ہلکی سی نمی ابھی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ حرمین کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھتی یونہی نفی میں سر ہلا گئی۔

”پاپا! کیا آپ ماما سے ناراض ہیں؟“

”ہاں!“ اس کے ریشمی بالوں پر تھوڑی ٹکائے ہوئے اس نے پلکیں بند کی تھیں۔

”کیوں پاپا؟ ماما تو آپ سے اتنا پیار کرتی تھیں پھر آپ ان سے ناراض کیوں ہیں؟“

”ماما نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ بیٹے! کوئی یوں کسی کو بیچ راہ میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے دور جاتا ہے۔“ اس کی پلکیں ابھی بھی بند تھیں۔ کیفیہ حیران کن نگاہوں سے کچھ بھی سنائی نہ دینے کے باوجود اسے دیکھتی رہی۔ وہ شخص اپنی سرخ و سپید رنگت کے ساتھ وجاہت میں بے مثال تھا۔ پھر اسی روز رات میں بہت دیر تک وہ سارے اسے ڈسکس کرتی رہی اور وہ سالار آفندی سے متعلق جانے کیا کیا اس کے گوش گزار تھی۔

☆...☆...☆

فضا میں سردی کی شدت ایک مرتبہ پھر بڑھ گئی تھی۔

وہ سالار آفندی کے گھر سے واپس آئی تو اندھیرا اچھا خاصا بڑھ چکا تھا۔ ضیاء ریاض اور شاہد تینوں ہی گھر آچکے تھے اور اب اس کی واپسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ جونہی اس نے گھر میں قدم رکھا شاہد لپک کر اس کی طرف بڑھا اور غرا کر اس کا دودھیا بازو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا۔

”کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟“ انداز ایسا تھا کہ وہ سالار کے تھپڑ کی تکلیف بھول کر ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی۔

”مم... میں... ماموں کے گھر سے۔“

”کیوں! یہ وقت ہے آوارہ پھرنے کا اور روزانہ بھاگ بھاگ کر ماموں کے گھر کیوں جاتی ہو، اپنے گھر میں چین نہیں ہے تمہیں؟“ وہ قہر کی علامت بنا کھڑا تھا۔ سارے کا اس غیر متوقع صورت حال پر حلق تک خشک ہو گیا۔ تبھی صحن کے وسط میں بڑی چار پائی پر بیٹھے ضیاء بھائی نے اسے آواز دی۔

”شاہد! بازو چھوڑ دے سارے کا۔“ ان کے حکم پر فوراً اسے گھورتے ہوئے وہ بازو چھوڑ کر ان کے پاس ہی دوبارہ آ بیٹھا۔

”اسے سمجھا دیں ضیاء بھائی! مجھے اس کا یوں لور لور آوارہ پھرنا اور بھاگ بھاگ کر سالار کے گھر جانا بالکل پسند نہیں ہے۔ دوبارہ عصر کے بعد گھر سے باہر دیکھا تو خون پی جاؤں گا اس کا۔“

سارہ کو اس کا اشتعال اور جذبات دونوں ہی سمجھ میں آرہے تھے لہذا وہ بنا سر اٹھائے کمرے میں فائرہ بیگم کی جانب بڑھ گئی۔ ضیاء بھائی اب شاہد کا غصہ ٹھنڈا کر رہے تھے اور اس مقصد کے لیے وہ شاہد کے ساتھ ساتھ ریاض کو بھی اٹھا کر بیٹھک میں لے آئے تھے۔

”ابا کی طرح آپ نے بھی اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے ضیاء بھائی! مجھے اس کی یہ آزادی پسند نہیں ہے۔“ اپنی چادر جھاڑتے ہوئے اس نے پھر غیرت دکھائی تھی جب کہ ریاض کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ اس کی طبیعت ضیاء اور شاہد دونوں سے ہی میل نہیں کھاتی تھی۔ تبھی ضیاء بھائی نے سرسری سی ایک نگاہ اس کے سپاٹ چہرے پر ڈالتے ہوئے قدرے بیٹھے لہجے میں کہا۔

”ٹھنڈا ہو جا شاہد! ٹھنڈا ہو جا... یہ عورت ذات کے معاملات ہی ایسے ہوتے ہیں، ایویں تو پرانے وقتوں میں بڑے بڑے سیانے اس ذات کو پیدا ہوتے

ہی زندہ دفن نہیں کر دیتے تھے، ایک مرد کے لیے بیٹی کی پیدائش سے بڑھ کر اور کوئی شکست نہیں، کوئی گالی نہیں۔ خیر جانے دو غصے کو یہ بتاؤ سارہ کی شادی کا کیا کرنا ہے؟ اماں دو تین بار کہہ چکی ہے مجھے کہ میں جلد سے جلد اس کے ہاتھ پیلے کرنے کا بندوبست کروں اور یہ بھی کہ سالار کے گھر والے ایک دو روز میں تاریخ لینے آرہے ہیں۔“

”تو آنے دیں بھائی! ہاتھ پیلے تو کرنے ہی ہیں اس کے، اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں کس چیز کی کمی ہے۔“ جواب شاہد کے بجائے ریاض کی طرف سے آیا تھا۔

”کمی تو کوئی نہیں مگر میں جو بات تم لوگوں کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔“ ان کا انداز مبہم تھا، شاہد اور ریاض دونوں الجھے انداز میں انہیں دیکھنے لگے۔

”کیا مطلب؟“

”دیکھو ناں یار! ابا کی وسیع زمین اور جائیداد ہے، جس میں ان کی وصیت کے مطابق ہم تینوں کے علاوہ اماں اور سارہ بھی حصے دار ہیں، جب تک یہ زمین



اٹھی ہے گاؤں میں ہماری ٹکر کا دوسرا کوئی نہیں، جس دن اس زمین کی وٹ ہوگی اسی دن ہماری چوہدراہٹ بھی سمجھو ختم ہو جائے گی۔ اماں کو تو اسی بُو ہے پر مرنا ہے اس کی جائیداد کہیں نہیں جاتی البتہ سارہ کی شادی سالار سے ہوتے ہی زمین کا ایک بڑا حصہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور پھر یہ بات تو تم لوگ بھی جانتے ہو کہ سالار اور اس کے بھائی کی نظریں اصل میں ہماری زمین پر ہیں۔ آج تھانے دار ہے، کل بڑی پوسٹ پر چلا جائے گا تو بہت تنگ کرے گا، گلے میں پھنسی ہڈی کی طرح نہ اسے اگل سکیں گے، نہ نکل سکیں گے۔“

”بات تو ٹھیک ہے آپ کی یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمیں سارہ کی شادی سالار سے نہیں کرنی چاہیے۔“ شاید بہت جلدی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا جس پر ضیاء بھائی نے تو صیفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میرا مطلب تو یہی ہے آگے تم لوگوں کی مرضی ہے اگر تم دونوں اپنے حصے کی جائیداد میں سے اسے کچھ دینا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

وہ یہ بات اس سے پہلے فائزہ بیگم کے کانوں میں بھی ڈال چکا تھا وہی بات دونوں بھائیوں کے گوش گزار بھی کر دی۔ جس پر ریاض تو خاموش رہا لیکن شاید بول اٹھا۔

”نہیں ضیاء بھائی! میرا خیال ہے ابا کی جتنی بھی زمین جائیداد ہے اس پر بس ہم تینوں بھائیوں کا حق ہے اگر اپنی زندگی میں ابا نے کوئی احمقانہ وصیت کی بھی تھی تو ان کے ساتھ وہ بھی مٹی میں مٹی ہو گئی اور جہاں تک سالار کی بات ہے تو سارہ کے حوالے سے میں بھی اس حق میں نہیں، ہاں ریاض اگر چاہے تو اپنے حصے کی زمین سے آدھا حصہ اسے دے سکتا ہے۔“

”ہوں! اب بول ریاض! تیرا کیا جواب ہے؟“ شاید کے جواب سے خوش ہو کر ضیاء بھائی کی توجہ اب خاموش بیٹھے ریاض کی طرف مبذول ہوئی تھی۔

”میرا کیا جواب ہونا ہے بھائی! فیصلہ تو آپ لوگ کر ہی چکے ہو آگے سارہ سمجھ دار پڑھی لکھی لڑکی ہے، وہ کسی کے ساتھ بھی بیاہی جائے اپنا حق کبھی نہیں چھوڑے گی، یہ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔“

”تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے؟“

”مسئلے کا حل میرے پاس ہے۔“ ضیاء بھائی کے پُرسوج سوال پر شاہد نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اچانک کہا تو وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

”کیا...؟“

”حل بڑا آسان ہے، جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ باہر بیٹھک کے دروازے پر کھڑی بھابی زہرا جو چھوٹے بچے کو واش روم لے جا رہی تھیں اور اپنی فطری تجسس بھری طبیعت کے ہاتھوں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھیں، اندر تینوں بھائیوں کے درمیان طے پانے والی بات سن کر تھرا اٹھی۔ سارہ اپنے کمرے میں بند ہو چکی تھی لہذا انہیں فائزہ بیگم کو صورتِ حال سے باخبر کرنے کا اچھا موقع میسر آ گیا تھا۔

☆...☆...☆

سارہ نایاب سے ہوتے جھگڑے کے باعث فائزہ بیگم کے پیام پر وہ بڑی مشکل سے وقت نکال کر اس طرف آیا تھا۔ جس پر وہ نئے سرے سے جل بھن

اٹھی تھیں مگر اس نے پروا نہیں کی۔ تیز بخار میں جلتی فائزہ بیگم شدت سے اس کی آمد کی منتظر تھیں۔

”السلام علیکم پھوپو!“

”وعلیکم السلام! آؤ بیٹے، میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“

”خیریت؟ میں اصل میں بہت مصروف تھا، اس لیے چکر نہیں لگا سکا، آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟“ وہ ان کے قریب چارپائی پر ہی جگہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ فائزہ بیگم کی آنکھیں اسے قریب پا کر پھر آنسوؤں سے بھر آئیں۔

”میری طبیعت کا کیا ہونا ہے بیٹے! بس سارہ کی طرف سے بہت پریشان ہوں، اسی لیے زہرا کو بھیجا تھا تمہاری طرف۔“

”سارہ کی طرف سے پریشان ہونا چھوڑ دیں آپ، کل پرسوں امی تاریخ لینے آرہی ہیں۔“

”نہیں! جو تم اور میں سوچ رہے ہیں وہ کبھی نہیں ہوگا یہ لوگ... یہ سارہ کے بھائی اس کی شادی کبھی نہیں ہونے دیں گے تم سے۔“

”کیوں... میرا مطلب ہے آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟“ وہ تھوڑا سا پریشان ہوا تھا جب وہ بولیں۔

”کیوں کہ میں ان دولت کے پجاریوں کے ارادے جان چکی ہوں بیٹے! ان کی نیت میں فتور آگیا ہے۔ یہ... یہ میری معصوم بیٹی کو جان سے مارنے کا پروگرام بنا رہے ہیں تاکہ اس کے حصے کی جائیداد پر قابض رہ سکیں مگر یہ نمائی اس بات کو نہیں جانتی، یہ تو جان دیتی ہے بھائیوں پر۔ سالار تو میرا بیٹا ہے، تجھ سے بڑھ کر مجھے سارہ کے لیے کوئی بھی عزیز نہیں، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں بیٹے! اسے یہاں سے دور لے جا، آج ہی کہیں لے جا کر چھپا دے اسے، وگرنہ یہ اسے بے موت مار کر الزام کسی اور پر ڈال دیں گے۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں اپنے بیٹوں کو، یہ روپے، زمین جائیداد کے لیے اپنی بہن تو کیا ماں کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ میں انہیں تیرا دشمن نہیں بنانا چاہتی، نہ تمہیں ان کی نظروں میں لانا چاہتی ہو، اسی لیے... اسی لیے...

بیٹے... سارہ کو چھپا کر یہاں سے دور لے جا، تجھے خدا کا واسطہ سالار! ایک ماں کے بندھے ہاتھوں کی لاج رکھ لے...“ ان کے لفظ کیا تھے، چنگاریاں تھیں

جو لمحوں میں اسے جھلسا کر رکھ گئی تھیں۔ اس لمحے بے ساختہ سارہ کے الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کی سماعتوں میں گونجنے لگے۔

”اور چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جاؤ، یہی بہتر ہے تمہارے لیے، کل کو میرے ساتھ بھی یہی سب ہو گیا تو یونہی ہنستے رہنا۔“

”نہیں! سارہ کو میرے ہوتے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ آپ ٹینشن مت لیں پھوپو! میں خود بات کروں گا ضیاء بھائی سے۔“

”ہرگز نہیں، اس کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی تو غضب ہو جائے گا سالار! تم نہیں سمجھتے ان نجی معاملات کو، میں ماں ہوں ان کی، جو میں جانتی ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ یہاں ان

دیہاتوں میں کتنے ہی جاگیرداروں کی بیٹیاں یونہی بے قصور موت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ان زمینوں، جائیدادوں نے بڑے ظلم کیے ہیں حوا کی بیٹی پر، خدا کا واسطہ ہے سالار! میری بات مان لو۔“ اب کے سالار آفندی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ باقاعدہ رو پڑی تھیں جس پر وہ مضطرب ہوا تھا۔

”نہیں پھوپو! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ میری کیا مجال کہ آپ کے کسی حکم سے انحراف کر جاؤں لیکن... یہ... اقدام صحیح نہیں لگ رہا ہے مجھے۔ سارہ کیا سوچے گی؟ اور پھر جو چیز میری ہے اسے پانے کے لیے چوری کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے؟“

”ضرورت ہے سالار! وقت تمہارے حق میں نہیں ہے، یہ چیز جو تمہاری میرے پاس امانت ہے، میں اپنی خوشی سے تمہیں سوپ رہی ہوں، اب مزید بحث میں نہ پڑنا بیٹے! اس سے پہلے کہ کوئی انہونی ہو جائے، خدا کا واسطہ ہے تجھے میری بات مان لے۔“ ان کے ہاتھ بار بار سالار کے سامنے بندھ رہے تھے، تبھی وہ بے بس ہو گیا تھا۔

”اوکے پھوپو! جیسی آپ کی مرضی، ابھی میں نکلتا ہوں تھوڑی دیر بعد اسے کسی بہانے سے میرے گھر کی طرف بھیج دیجیے گا، آگے اللہ نے چاہا تو میں خود سنبھال لوں گا۔“ فائزہ بیگم اس کی رضامندی پر جیسے پھر سے جی اٹھی تھیں اور اس وقت ان کے کپکپاتے لب سالار آفندی کو دعائیں دیتے نہیں تھک رہے تھے۔

☆...☆...☆

اس روز بھابی کی ہدایت پر بڑے دنوں کے بعد وہ اپنے گھر کے سامنے والے بنگلے کی طرف آئی تھی۔ بنگلہ باہر سے جتنا شان دار دکھائی دیتا تھا اندر سے اس کا حال اتنا ہی ابتر تھا۔ عجیب سی ویرانی اور اجاڑ پن ہر سو بکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک تفصیلی نگاہ ارد گرد ڈالتی، کھلا ہوا گیٹ آہستہ سے اندر دھکیل کر بنا دشتک دیئے لان میں چلی آئی۔ جو اس وقت خشک اور ویران پڑا اپنی بد حالی پر آنسو بہا رہا تھا۔

لان عبور کر کے اندر بڑے سے ہال میں داخل ہوئی تو وہاں کا ماحول بھی ایسا ہی بکھرا ہوا پایا۔ عظیم لغاری کی وہ بیٹی جو اسے بے حد پسند تھی۔ کچن میں کسی چیز پر کھڑی کھٹ پٹ کر رہی تھی اور اس کا چھوٹا سا دو سالہ بھائی ہال میں ایک طرف زمین پر پڑا روتے ہوئے چلا رہا تھا۔ اسے یہ منظر دیکھ کر دکھ کے ساتھ ساتھ قدرے حیرانی بھی ہوئی تھی تبھی وہ دبے پاؤں چلتی کچن کے دروازے پر آکھڑی ہوئی۔

”گڑیا!“ اس کی میٹھی پکار پر بچی نے فوراً پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔



”آئی! آپ یہاں کیسے؟“ دودھ بوائے کر کے فیڈر میں ڈالتے ہوئے وہ بڑی طرح چونکی تھی۔ کیفیہ اس کی حیرانی پر نرمی سے مسکرا دی۔

”کہو کیسا لگا آئی کا سر پرانز؟ ویسے میں یہیں آپ کے سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔“

”سچ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ بڑے اسٹول سے اتر آئی تھی تبھی کیفیہ نے اس سے پوچھا۔

”کیا دادی اماں نہیں ہیں گھر پر...؟“

”نہیں! ان کی طبیعت بہت خراب تھی پاپا اسپتال لے کر گئے ہیں انہیں، اسی لیے یہ سعد رو رہا ہے، یہ پاپا کے بغیر نہیں رہتا۔“ کتنی معصومیت تھی اس پیاری سی بچی کے لہجے میں وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آپ پاپا کی غیر موجودگی میں بھائی کو سنبھال لیتی ہو حرمین!“

”جی! جب ماما کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو دادو نے تھوڑا تھوڑا کام کرنا سکھایا تھا مجھے۔“

”ماما کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، کیسے... اور کب ہوا تھا ایکسیڈنٹ؟“

”جب سعد پیدا ہوا تھا تب پاپا کو شاپنگ کروانے لے گئے تھے تو ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“ اسے پوری بات نہیں پتا تھی، وہ افسوس سے سر ہلاتی چھوٹے بچے کو سنبھالنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

”حرمین بیٹا! اسکول جاتی ہو آپ کہ نہیں۔“

”جاتی ہوں، یہ پاس میں ہی اسکول ہے میرا، پتا ہے آئی! میری ماما بہت اچھی تھیں وہ مجھ سے اور سعد سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اب میری ماما نہیں ہیں تو میری کوئی دوست بھی میرے گھر نہیں آتی، کیونکہ اب میں انہیں ماما کے ہاتھ کی بنی مزے مزے کی چیزیں جو نہیں کھلاتی۔“ سعد فیڈر پیتے ہوئے رونا بھول چکا تھا تبھی وہ اسے بتا رہی تھی۔ ”آئی! کیا جن کی ماما نہیں ہوتی، ان سے کوئی پیار نہیں کرتا؟“ اگلے ہی پل وہ بھرپور معصومیت کے ساتھ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں جانو! ایسا نہیں ہوتا۔“

”اچھا! لیکن اللہ میاں ماما کا کیا کرتے ہیں‘ کیا میری ماما اللہ میاں کے پاس ہمارے لیے کچھ لینے گئی ہیں؟“

”نہیں بیٹے!“

”تو پھر پایا کیوں کہتے ہیں کہ میری ماما اللہ میاں کے پاس ہمارے لیے ڈھیر سارے کھلونے لینے گئی ہیں؟“ اگلے ہی پل بچی کے عجیب و غریب سوال نے اسے پھر لاجواب کر ڈالا۔ ”آئی! میری ماما کو دیکھیں گی آپ...؟“

کتنی ترسی ہوئی تھی وہ کسی کی کپنی کی، کیفیہ کی آنکھیں بے ساختہ بچی کے دکھ پر آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

”ہاں!“

اس کے ”ہاں“ میں سر ہلانے پر وہ بچی فوراً بھاگتے ہوئے گئی اور اپنے ماں باپ کے بیڈ روم سے ایک بڑی سی تصویر اٹھا لائی۔ جس میں ماں کے ساتھ ساتھ اس کا دلہا بنا باپ بھی اپنی انوکھی چھب دکھا رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اس دلہن بنی پری پیکر چہرے والی نازک سی دوشیزہ اور اس کے پہلو میں بیٹھے اس مسرور سے شان دار مرد کو دیکھتی رہی جو اس بچی کا باپ تھا۔

”میری ماما پیاری ہیں ناں آئی؟“

”ہاں! بہت پیاری ہیں‘ بہت زیادہ...“

بچی کے اشتیاق سے پوچھنے پر اس نے مثبت جواب دیا تو اس کا چھوٹا سا معصوم چہرہ پھر چمک اٹھا۔

”آئی! آپ سامنے رہتی ہیں تو روز چکر لگایا کریں ناں!“ دوسرے ہی پل فریم سائیڈ پر خیال سے رکھ کر وہ اس سے نئی فرمائش کر رہی تھی۔ کیفیہ نے اپنی بھیگی پلکیں پونچھ لیں۔

”ٹھیک ہے‘ جب آپ اسکول سے واپس آجائیں اور پایا گھر پر موجود نہ ہوں تو آپ فوراً مجھے بلا لیا کریں‘ اوکے۔“

”تھینک یو آئی!“ اس کی اتنی سی عنایت پر بچی بہت خوش ہو گئی تھی۔

اگلے روز پھر اسی ٹائم وہ بچی کی کال پر اس طرف چلی آئی اور لگ بھگ تین گھنٹے میں گھر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ حرمین کی خوشی اس کی ہیلپ پر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی مگر جیسے ہی وہ صفائی سے فارغ ہوئی، عظیم چلا آیا۔ کیفیہ کا

چہرہ بھی کپڑوں کے ساتھ ساتھ گندا ہو گیا تھا تبھی اس کی آمد کا جان کر وہ شرمندہ سی کمرے میں ہی رک گئی۔

”حرمین! تم تو کہہ رہی تھیں پاپا شام کو آئیں گے، اب... مائی گاڈ... میں کیسے سامنے جاؤں گی ان کے؟“ بچی کو کندھوں سے پکڑ کر روکتے ہوئے اس نے گلہ کیا تھا وہ مسکرا دی۔

”مجھے تو پاپا نے شام کا ہی کہا تھا، اچھا آپ یہیں چھپ جائیں میں پاپا سے بات کر کے آتی ہوں۔“ اسے تسلی دے کر وہ فوراً باہر بھاگ گئی تو کیفیہ لاچاری سے وہیں بیڈ پر ٹک گئی، اٹیچ باٹھ بھی نہیں تھا کہ وہ جا کر منہ ہی دھولیتی۔ عظیم اب حرمین کو ڈانٹ رہا تھا۔

”کون آیا تھا گھر میں... اور یہ سب کام... یہ کس نے کیے ہیں؟“ اس کا موڈ بے حد بگڑا ہوا تھا حرمین پہلی بار اسے اس درجہ غصے میں دیکھ رہی تھی۔

”وہ... وہ سامنے والی آنٹی ہیں نا کیفیہ... انہوں نے کیے ہیں۔“

”کیوں! منع کیا ہے ناں میں نے کہیں آنے جانے، کسی کو یہاں بلانے سے پھر کیوں آئیں وہ یہاں؟“ وہ پھر دھاڑا تھا۔ کیفیہ کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ ہو گیا۔

”مم... میں نے کہا تھا پاپا، سعد بہت رو رہا تھا اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔“ عظیم لغاری کو غصے میں دیکھ کر بچی کا چہرہ بھی رونے والا ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ ضبط کر گیا۔

”کچھ نہیں ہوتا سعد کو، اس گھر کی ہر چیز جہاں جیسے پڑی ہے، پڑی رہے آئندہ کبھی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا، اوکے۔“

عجیب عشق کے حصار میں تھا وہ کہ محبوب بیوی کے ہاتھ لگی چیزوں کا ہلنا بھی گوارا نہیں تھا اسے۔ کیفیہ جو پہلے احساسِ توہین سے سرخ ہو رہی تھی اب جیسے اگلے ہی پل اسے اس خوبرو سے شان دار مرد پر ترس آنے لگا تھا۔ کتنا توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا محبت نے اسے۔

☆...☆...☆

شام کا ملگجا اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔

فائزہ بیگم اور زہرا بھابی کے بے حد مجبور کرنے پر وہ سالار کے گھر کی طرف نکلی تھی مگر اس ارادے کے ساتھ کہ جو چیز زہرا بھابی نے چھپا کر شاپر میں بند کر کے اسے سالار کو دینے کے لیے زبردستی تھمائی تھی وہ اس کے حوالے کرتے ہی فوراً انہی قدموں سے واپس لوٹ آئے گی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ ابھی راستے میں تھی جب وہ گاڑی لے کر سامنے آگیا۔

”بیٹھو... جلدی...“ بنا کسی سلام دعا کے بوتل کے جن کی مانند نمودار ہوتے ہی اس نے سنجیدگی سے حکم صادر کیا تو وہ اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”جی نہیں! مجھے مرنا نہیں ہے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں، یہ شاپر پکڑو اور اپنا راستہ ناپو۔“

سالار کو اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی لہذا وہ خود اچھل کر سیٹ سے اترا اور اگلے ہی پل احتیاط سے ارد گرد دیکھتے ہوئے سارہ کے منہ پر اپنا مضبوط

ہاتھ جمادیا۔ شام گہری ہو رہی تھی لہذا اس وقت اس راستے کی طرف کم لوگ ہی آتے جاتے تھے۔ اگلے دو منٹ میں وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی مچل رہی تھی۔ سالار کے مضبوط ہاتھ کی گرفت نے اس کے جبروں کو بہت اچھی

طرح سے بھیج رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کر پار ہی تھی۔

گاڑی جب گاؤں کی حدود سے باہر نکلی تب سالار نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا دیا۔ سامنے روڈ پر رش نہیں تھا مگر اس کے باوجود اسے احتیاط سے ریش ڈرائیونگ کرنی تھی۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے، کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟“ سارہ کا سانس جیسے ہی بحال ہوا وہ حلق کے بل چلا اٹھی مگر سالار نے جیسے سنا ہی نہیں۔

”سالار میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں گی، اپنے تھانے دار ہونے کا رعب مجھ پر مت چلاؤ۔“ اس کا حال قطعی غیر متوقع صورت حال پر بُرا ہوا تھا لہذا سالار کو مجبوراً ایک ہاتھ سے پھر اسے قابو کرنا پڑا۔ اگلے پون گھنٹے میں اس نے ایک درمیانے درجے کے مکان کے سامنے گاڑی روکی تھی۔

”چلو...“

گاڑی پارک کر کے اس نے بائیں ہاتھ سے اس کا بازو دبوچا اور زبردستی گھسیٹتے ہوئے دروازے کے قریب لے آیا، یہ شہر میں اسی کی جائے رہائش تھی اور



جس پر لگا چھوٹا سا قفل سارہ کے خوف میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ اس کی رنگت اپنے ساتھ پیش آنے والے اس عجیب و غریب واقعے پر سفید پڑ چکی تھی۔ مکان کا چھوٹا سا صحن عبور کر کے سالار جس وقت اسے کمرے میں لایا، وہ چلا اٹھی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس درجہ گھٹیا اور اندر سے اتنے مکینے انسان ہو گے۔ تم کیا سمجھتے ہو یوں طاقت اور دہشت سے تم اپنا مقصد حاصل کر لو گے؟ ہر گز نہیں، میرے بھائیوں کو پتا چل گیا تو وہ تمہاری بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔“

”فضول بکواس کرنا چھوڑو، میں ابھی اپنے دوستوں کو کال کر کے بلاتا ہوں اور مولوی صاحب کا بندوبست بھی کرتا ہوں، ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہمارا نکاح ہوگا، اس کے بعد تمہیں جو بکواس کرنی ہے شوق سے کرتی رہنا، فی الحال یہاں بیٹھو چپ کر کے، سمجھی۔“ اس وقت وہ کتنے مختلف روپ میں دکھائی دے رہا تھا۔ سارہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے بے یقین سی اسے دیکھ گئی۔

”ہر گز نہیں... کبھی سوچنا بھی مت کہ میں یوں چھپ کر اپنے بھائیوں کی مرضی کے خلاف تم سے نکاح کروں گی۔“

”ٹھیک ہے مت کرو، رہنا تو اب تمہیں یہیں ہے وہ بھی میرے ساتھ، جائز تعلق کے ساتھ رہو یا ناجائز تعلق کے ساتھ، فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں میں۔“

وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا سارہ کے اندر اس ایک لمحے میں بہت کچھ ٹوٹا تھا۔ وہ جسے عام مردوں سے قطعی مختلف سمجھتی تھی وہ کتنا گھٹیا مرد ہو کر اس کے سامنے ظاہر ہوا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ زندگی میں شاید پہلی بار اسے اپنی بے بسی پر اس درجہ رونا آرہا تھا کہ نہ وہ اپنا وقار بچا پارہی تھی اور نہ اپنے بھائیوں کی شان، اس لمحے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ کچھ بھی کھا کر ہمیشہ کے لیے سو رہتی۔ شاید اسی لیے اس کے بھائی اس کے گھر جانے سے روکتے تھے اسے، مگر اب رونے سے کیا حاصل تھا جو نقصان نہیں ہونا چاہیے تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب تو بس اسے گزرے ہوئے سانپ کی لکیر پیٹنا تھی۔

☆...☆...☆

آج بہت دنوں کے بعد گڑیا کی ضد و اصرار پر وہ پھر عظیم لغاری کے ”گرین پیلس“ کی طرف آئی تھی۔ نائٹ بلب کی مدہم روشنی میں نہایا لاؤنج ہر

طرف عجیب سا فسوں بکھیر رہا تھا۔ وہ بچے تلے قدم اٹھاتی ابھی حرمین کے کمرے کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک کچن سے برآمد ہونے والی خاتون کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

السلام علیکم!

”وعلیکم السلام! آؤ بیٹے! کیفیہ ہی ہونا، آپ؟“

”جی اور آپ غالباً حرمین کی دادی ماں ہیں۔“

”ہاں! ٹھیک پہچانا تم نے، حرمین بہت باتیں کرتی ہے تمہاری، میں نے کہا بھی کہ تمہیں بلا کر لائے مگر یہ آج کل کے بچے، کہاں سنتے ہیں بڑوں کی۔“ اپنے گرم دوپٹے کے کونے سے بھیکے ہاتھ خشک کرتیں وہ اسے لے کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔

”نہیں! وہ اصل میں میری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے چکر نہیں لگا سکی، وگرنہ حرمین تو روزانہ بہت اصرار کرتی ہے۔“

”اچھا! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

”اب تو ٹھیک ہوں، حرمین اور سعد دکھائی نہیں دے رہے؟“

”ہاں! وہ ابھی عظیم کے ساتھ باہر گئے ہیں، پورے پندرہ روز کے بعد گھر آیا ہے تو بچوں کو باہر گھمانے لے گیا۔ تم بیٹھو آرام سے، میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔“

”نہیں آنٹی! بہت شکریہ، چائے تو میں پیتی ہی نہیں ہوں، آپ کی طبیعت ناساز تھی، اب کیسی ہیں آپ؟“ انہیں بمشکل اٹھنے سے روک کر اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ جب وہ بولیں۔

”اللہ کا شکر ہے بیٹی! ہاتھ پیر سلامت ہیں ٹھیک سے کام کر رہے ہیں وگرنہ منزہ کی وفات کے بعد تو سمجھو بستر کی ہی ہو کر رہ گئی ہوں میں۔“

”منزہ... منزہ کون...؟“

”بہو تھی میری، عظیم کی بیوی۔ چھوٹی سی تھی جب میں نے اپنی تنہائی کے خیال سے اسے گود لے لیا تھا، ارادہ یہی تھا کہ اپنے عظیم کی دلہن بنا کر ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھوں گی، عظیم کا بھی بہت دل تھا اس میں، یوں سمجھو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے، ابھی پچھلے سال موئے روڈ ایکسپرنٹ میں

وفات ہو گئی اس کی۔“ منزہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ اچھی خاصی رنجیدہ ہو گئی تھیں جب وہ بولی۔

”مجھے بے حد دکھ ہے آنٹی! کچھ حادثے ایسے ہوتے ہیں جو انسانی دل و دماغ پر اتنے گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں کہ وقت کا مرہم بھی انہیں مٹا نہیں پاتا لیکن انسان اپنی تقدیر کے سامنے بے بس ہے، ہم چاہیں بھی تو قسمت کے لکھے کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے۔“

”صحیح کہتی ہو بیٹے! عظیم کو دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، بچوں کی زندگی الگ متاثر ہو کر رہ گئی ہے، کئی بار ماسی کے لیے کہہ چکی ہوں مگر سنتا ہی نہیں۔ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔ اپنے کمرے میں تو بچوں کا داخلہ بھی بند کر رکھا ہے اس نے۔ میں بوڑھی جان کہاں تک اس کا اور اس کے بچوں کا خیال رکھوں، سارے گھر کا حال دیکھو۔ دھول مٹی سے اٹا پڑا ہے۔“ زینب بی اپنے بیٹے کی بکھری زندگی اور گھر کے حالات سے خاصی دل برداشتہ دکھائی دے رہی تھیں وہ افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔

”جہاں تک میرا خیال ہے انہیں اپنے گھر میں کسی کا آنا جانا بھی گوارا نہیں ہے۔“

”نہیں بیٹے! ایسی بات نہیں ہے، بس ذہنی طور پر پریشان ہے تو اول فول کہتا رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اندر سے بھی ایسا ہے۔ میرے بیٹے کے حسنِ اخلاق اور اچھے کردار کی مثالیں دی جاتی ہیں ہمارے خاندان میں۔“

بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے زینب بی کے چہرے پر عجیب سی چمک آگئی تھی۔ کیفیہ ابھی اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ تیز تیز چلتا ہال میں آگیا۔

”مم... میں چلتی ہوں آنٹی! پھر آؤں گی کسی وقت۔“ اسے دیکھتے ہی کسی اسپرنگ کی طرح وہ کھڑی ہو گئی تھی جب کہ وہ ماتھے پر ڈھیر ساری شکنیں لیے اسے ایک نظر دیکھ کر رخ پھیر گیا تھا۔

”یہ لڑکی روز ہمارے گھر کیا لینے آتی ہے امی؟“ کیفیہ کے رخصت ہوتے ہی وہ خفا خفا سے موڈ کے ساتھ زینب بی سے مخاطب ہوا تھا۔

”ارے... ہر روز سے کیا مراد ہے تمہاری؟ اتنے دنوں کے بعد چکر لگایا ہے بچی نے اور تمہیں یہ بھی گوارا نہیں، تم ایسے تو نہیں تھے عظیم!“

”امی پلیز! جب میں آؤں آپ سب کو منع کر دیں کہ ہمارے گھر کوئی نہ آیا کرے۔ مجھے نفرت سی ہو گئی ہے دنیا سے۔“

”بڑی بات بیٹے! انسان معاشرتی حیوان ہے، دنیا سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”تو میں بھی زندہ کب ہوں امی!“ ہلکے بھرائے لہجے میں کہتا وہ صوفے پر ڈھے گیا تھا۔ زینب بی پھر دل مسوس کر رہ گئیں۔

”ایسا نہیں کہتے بیٹے! ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا بندے پر واجب ہے، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ ہر نیک و گناہ گار کا امتحان لیتا پھرے۔ وہ صرف اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے جنہیں اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے اور اللہ کی نعمتوں اس کے انعاموں کی کوئی حد نہیں۔“

”لیکن میں اس کی نعمتوں، اس کی آزمائشوں کے قابل نہیں ہوں۔“

”یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو بیٹے! اللہ جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس قابل ہے، بہر حال جو ہو چکا اس پر صبر کرنا سیکھ لو، اپنے دکھ کی بھٹی میں ان لوگوں کو مت جلاؤ جن کا کوئی قصور نہیں اگر تم دوسری شادی کا ذکر بھی پسند نہیں کرتے تو کم از کم اس بچی کو یہاں آنے سے مت روکو جسے تم سے یا اس گھر سے کوئی غرض کوئی لالچ نہیں ہے۔“ زینب بی کے لہجے میں رنجیدگی ہی نہیں ہلکی سی سختی بھی تھی لہذا وہ چاہنے کے باوجود کوئی احتجاج نہ کر سکا۔

☆...☆...☆

سارہ کا نکاح سالار آفندی کے ساتھ اس کی خواہش کے عین مطابق ہو چکا تھا اور اب اس چھوٹے سے فلیٹ میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ سالار کے دوست اس سے ہنسی

مذاق کر رہے تھے جب کہ ان کی بیویاں سارہ کو گد گدانے کی کوشش میں مصروف تھیں مگر... اس کا دھیان تو بار بار بھٹک کر اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ پتا



نہیں اس کی پیاری ماں کس حال میں تھی، گاؤں سے اچانک اس کی گمشدگی کی خبر سن کر اس کے ”غیرت مند“ بھائیوں پر کیا بیتی ہوگی؟

اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ گھر سے رخصتی کے وقت بھابی نے جو شاپر سالار کو دینے کے لیے زبردستی اسے تھمایا تھا اس میں کیا تھا؟ کیسی عجیب بے بسی تھی کہ وہ اپنی عزیز از جان دوست کیفیہ سے بات کر کے اسے بھی تمام صورت حال سے باخبر نہیں کر سکتی تھی۔

سالار اس کے گھر چکر لگا کر آیا تھا اور اب اپنے دوستوں کو بتا رہا تھا کہ سارہ کے بھائی بھوکے کتوں کی طرح پاگل ہو کر پورے گاؤں میں اسے تلاش کر رہے ہیں۔ پولیس لائن میں ہونے کی وجہ سے لوگ اس پر شک کے باوجود اسے مورد الزام ٹھہرانے میں ہچکچا رہے ہیں، اس کے دوست ہوٹل سے کھانے کا آرینج کرتے ہوئے اسے مزید احتیاط کی تلقین کر رہے تھے اور وہ سر ہلا رہا تھا۔ رات گئے کہیں وہ رخصت ہوئے تو سارہ نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

اتنی دیر تک سب کچھ جانتے بوجھتے خاموش رہنا اور صبر کر کے بناؤ سنگھار کے ساتھ بیٹھنا اب اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا تبھی سالار کے دوستوں اور ان

کی بیویوں کے رخصت ہوتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور پنوں سے سیٹ کیے دوپٹے کو بے دردی سے نوچتے ہوئے سر سے اتار کر موٹا سا گولا بناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے سالار آفندی پر دے مارا۔

”تم نے میرے ساتھ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مکرو فریب سے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”اچھی بات ہے، میں معافی مانگ بھی نہیں رہا تم سے، ویسے بھی ابھی کچھ کیا کہوں، ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔“ چمکتی ذہین آنکھوں میں شرارت لیے مزے سے کہتا وہ پلٹ کر کمر لاک کر گیا تھا۔ سارہ نے اس لمحے اس کے سامنے خود کو قطعی بے بس محسوس کیا۔

”سالار! میں کہے دیتی ہوں اگر تم نے زبردستی میرے ساتھ ایسی ویسی کوئی حرکت کی، تو تمہارے حق میں قطعی اچھا نہیں ہوگا۔“

”اچھا... مثلاً کیا کرو گی تم؟ اگر میں تمہارے ساتھ ایسی ویسی کوئی حرکت کر لوں گا تو؟“ وہ اس کی بے بسی سے لطف اٹھا رہا تھا اور ادھر سارہ نا چاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے کمزور پڑ گئی۔

”مم... میں اپنی جان لے لوں گی اور تمہاری بھی۔“

”اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے، لو لے لو جان۔“ خمار چھلکاتی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ اس کے کمزور شانوں پر بڑھایا تھا تبھی وہ پھپک کر رو پڑی۔

”تم بہت بُرے ہو سالار! بے حد بُرے ہو تم، مگر کاش... میں پہلے جان سکتی۔“

”خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم پہلے کچھ نہیں جان سکیں، بہر حال یہاں تو تم مکمل میرے رحم و کرم پر ہو، اگر اچھے بچوں کی طرح تعاون کرو گی تو فائدے میں رہو گی بہ صورت دیگر تم جانتی ہو کہ میں پولیس والا ہوں۔“

وہ جس ”تعاون“ کی بات کر رہا تھا سارہ کے لیے وہ موت سے بدتر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رات اس کی مکمل آنسوؤں میں ڈوب کر گزری تھی جب کہ اس کے برعکس سالار بہت پُر سکون انداز میں مزے کی نیند سو رہا تھا۔

صبح جس وقت اس کی آنکھ کھلی وہ شاور لے کر آئینہ ہاتھ میں لیے اپنے بال سیٹ کر رہا تھا۔ سارہ خفگی بھری ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد رخ پھیر گئی۔ جانے رات بھر روتے روتے صبح فجر کی اذان کے قریب کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خود کو از حد لاچار و بے بس محسوس کیا تھا۔

”صبح بخیر سارہ ڈئیر! شادی شدہ ایک نئی زندگی کی پہلی روشن صبح مبارک ہو۔“ اس پر نگاہ ڈالتے ہی وہ پھر چکا تھا جیسے صاف اس کا مذاق اڑا رہا ہو، وہ آنسو پی کر رہ گئی۔

”شٹ اپ...!“

”اُف! ابھی تک رات والی خفگی اور غصہ برقرار ہے، خیر کوئی بات نہیں، اتنا حق تو بنتا ہے تمہارا، ابھی میرے محکمے کو میرے اس کارنامے کا پتا نہیں ورنہ پورے تین ماہ کی چھٹیاں لیتا اور ہر وقت تمہارے سر پر سوار رہتا، ابھی تو مجبوری ہے گاؤں جانا ہے تب تک شاور لے کر ریٹ کرو، پھر گھومنے پھرنے چلیں گے۔“ اس کے احساسات سے قطعی بے نیاز وہ یوں کہہ رہا تھا

جیسے دونوں کے بیچ بہت دوستی ہو۔ سارہ اس کے ارادے پر سر سے لے کر پاؤں تک سلگی تھی، تبھی چٹخی۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے پر، میری طرف سے جہنم میں جاؤ تم، مجھے کوئی پروا نہیں۔“

”آہستہ بولو یار! میں اونچا نہیں سنتا اور بڑی بات مجازی خدا کو ایسے نہیں کہتے۔ تمہیں چاہیے کہ اب جب میں تیار ہو کر آفس کے لیے نکلوں تو تم مختلف آیات اور دعائیں میری باحفاظت واپسی کے لیے پڑھ کر پھونکو، پھر محبت سے میری پیشانی چومو، کبھی کبھی...“

”سالار! چپ ہو جاؤ، نہیں تو میں کچھ اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گی۔“ اس سے پہلے کہ اسے پتانے کو وہ مزید کچھ کہتا، وہ پھر حلق کے بل چلاتے ہوئے اس پر چڑھ دوڑی، تبھی وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، ایک تو تم ہر بات میں غصہ کرتی ہو، لڑکیاں ترستی ہیں ایسے محبت کرنے والے شوہروں کے لیے اور ایک تم ہو کہ... آہ... میری تو سمجھو قسمت ہی پھوٹ گئی۔“ وہ باز آنے والا نہیں تھا، سارہ نے قطعی لاپاری

محسوس کرتے ہوئے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ تبھی وہ ایک مسرور نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے ایک میٹھی سی دھن لبوں پر سجاتا، اپنی تیاری مکمل کر کے روم سے باہر نکل گیا، جب کہ وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپائے کتنی ہی دیر تک پھر آنسو بہاتی رہی تھی۔

☆...☆...☆

بہت معصوم تھے ہم بھی ہمیں اب یاد آتا ہے کہ ہم اک اجنبی کو عمر کی تاریک راہوں میں سہارا جان بیٹھے تھے

کہ اس کے چاند چہرے کو

ہم اپنے بخت کا روشن ستارا مان بیٹھے تھے

ہمیں معلوم ہی کب تھا

کہ دشتِ زندگانی میں

سہارے چھوٹ جاتے ہیں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

نظر جن پر ٹھہرتی ہے

وہ تارے ٹوٹ جاتے ہیں

خود اپنے روٹھ جاتے ہیں

بہت معصوم تھے ہم بھی ہمیں اب یاد آتا ہے

پچھلے کئی دنوں سے زینب بی کی طبیعت ناساز تھی مگر وہ ”گرین پیلس“ جانے کے بجائے بچوں کو اپنے گھر ہی بلوالیتی تھی۔ سعد اب پاؤں پاؤں چلنے لگا

تھا۔ عظیم اپنی

مصروفیات کے باوجود زینب بی کا حال دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا اس

روز جیسے بے حد مجبور ہو کر اس نے حرمین کو ڈانٹا تھا۔

”حرمین! تمہیں نظر نہیں آتا دادی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور تم جب

دیکھو سامنے والوں کے گھر گھسی رہتی ہو، ان کے پاس رہا کرو، خیال رکھا

کرو ان کا۔“

”سوری پاپا!“ چھوٹی سی معصوم بچی اس کی ڈانٹ پر فوراً سہم کر سر جھکا گئی تھی۔ وہ لب بھینچ کر رخ پھیر گیا۔

اسی روز رات میں سردی کی شدت کے باعث زینب بی کی طبیعت اچانک خطرناک حد تک بگڑ گئی۔ وہ صرف تین روز کی چھٹی پر گھر آیا تھا اب اس بگڑتی صورت حال میں خاصا پریشان ہو کر بوکھلا اٹھا، رات کے تین بجے تھے جب وہ گھر اور بچوں کو خدا کے سپرد کر کے زینب بی کو اسپتال لے گیا۔ جہاں فوری طور پر انہیں ایمر جنسی وارڈ میں داخل کیا گیا تھا، ڈاکٹرز کے مطابق ان کے ہارٹ پر شدید اٹیک کی شکایت ہوئی تھی مگر بروقت ٹریٹمنٹ کے باعث انہیں خطرے سے نکال لیا گیا تھا۔

ان کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہونے بعد وہ گھر آیا، تو اندھیرے میں ڈوبے گھر کو روشنی میں نہایا پایا۔ اندر حرمین کے کمرے میں سعد اسی دوشیزہ کی نرم آغوش میں سکون سے سو رہا تھا جس کا اپنے گھر آنا اسے ناگوار گزرتا تھا۔ صبح فجر کی اذان ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا اور وہ بھرپور پُر سکون



انداز میں بیڈ پر بیٹھی سعد کو گود میں اور حرمین کو بازوؤں کے حلقے میں لیے جانے انہیں کون سی کہانیاں سنارہی تھی۔

وہ بس ایک لمحے کے لیے حرمین کے کمرے کے دروازے پر رکا تھا اور پھر پلٹ گیا تھا۔ منزہ کی رحلت کے بعد پہلی بار اس لڑکی کی اپنے گھر میں موجودگی بڑی نہیں لگی تھی۔

اگلی صبح شدید تھکن کا شکار ہونے کے باوجود وہ اسپتال میں زینب بی کے پاس ہی رہا تھا۔ ان کے ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر مزید ان کے پاس بیٹھ کر وہ کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے گھر آیا تو کیفیہ اس کے دونوں بچوں کو ناشتہ کروا رہی تھی۔ وہ جزبز سا بے مقصد ہی اس سے الجھ پڑا۔

”ایسکویوز می مس! اب آپ اپنے گھر جا کر ریٹ کر سکتی ہیں، میں آگیا ہوں اپنے بچوں کو ناشتہ میں خود کروا دوں گا۔“ کیفیہ جو بچوں کو پراٹھا تل کر دے رہی تھی چونک کر واپس پلٹی۔

”اوکے! یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ اپنے بچوں کا خیال رکھیں، انہیں یہ تسلی دیں کہ اگر ان کی ماں نہیں ہے تو کیا ہوا ان کا باپ تو ہے۔ جو مجتوں کے

معاملے میں اتنا جنونی ہے کہ اپنی چیز پر کسی دوسرے کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتا مگر آدھی رات کے اندھیرے میں اپنی قیمتی متاع کو بنا کسی خطرے کی پروا کیے بے یارو مددگار چھوڑ کر جاسکتا ہے۔“

”میں نے لیکچر سنانے کے لیے نہیں کہا آپ کو۔“

”مجھے شوق بھی نہیں ہے آپ جیسے ایرے غیرے، بددماغ شخص کو کچھ کہنے کا، مگر اتنا ضرور کہوں گی عظیم صاحب! محبت کسی تتلی کا نام نہیں ہے جسے آپ مٹھی میں دبا کر بیٹھے رہیں، یہ خوش بو ہے جسے پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ آپ کے بچے مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں انہیں کسی مصیبت میں گرفتار دیکھ کر بے نیاز نہیں رہ سکتی، سمجھے آپ...!“

اس کے اپنے اندر آگ لگی تھی، عظیم سرد نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ صافی سے ہاتھ صاف کر کے دھپ دھپ کرتی اس کے گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر میں آج کل اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی جس کے باعث بھابی کی مصروفیات دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کیفیہ کو اس سارے سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہذا وہ اپنے ہی کاموں میں مصروف رہتی۔

آج کل اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عظیم حیدر لغاری اس کے اعصاب پر کیوں سوار ہو گیا تھا، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے وہ ناچاہتے ہوئے بھی اس شخص سے متعلق سوچنے پر مجبور تھی، اپنے بکھرے بکھرے سے حلیے و لہجے کے ساتھ وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انا کو درمیان میں لائے بغیر وہ اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کی غیر موجودگی میں دو تین بار اس کے گھر کا چکر لگا چکی تھی۔

سعد اسے آنٹی کے بجائے ماما کہتا تھا جس پر حنین ہنستی تھی جب کہ وہ پریشان ہو کر اس کی تصحیح کرواتے ہوئے اسے ”آنی“ کہنے پر مجبور کرتی۔ بچوں کا کھویا اعتماد آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہا تھا اور وہ ماں کی کمی اس کی ذات سے پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ وہ عظیم کو تنگ کرنے اور چڑانے کے لیے پہلے سے زیادہ بچوں کو اپنے

قریب کرنے کی کوششوں میں مصروف عمل ہو گئی تھی۔ سعد اب عظیم سے بھی زیادہ اس کے قریب آگیا تھا اور اپنی اس جیت پر بے حد مسرور تھی۔

☆...☆...☆

گاؤں میں سارہ کی اچانک گمشدگی پر جیسے طوفان بپا تھا۔

اس کے تینوں بھائیوں کا بس نہیں چل رہا کہ وہ کہیں سے سامنے آجاتی اور وہ اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیسے ہی ان کا گھر چکر لگتا۔ وہ فائرہ بیگم اور زہرا کو نئی سے نئی بات سنا کر چلے جاتے۔ شام سے کچھ پہلے سالار ان سے ملنے آیا تو وہ ان کے سامنے رو پڑیں۔

”سالار پتر! یہ لوگ کہیں سارہ تک پہنچ تو نہیں جائیں گے۔“

”نہیں پھوپو! آپ بالکل بے فکر رہیں، سارہ مضبوط ہاتھوں میں ہے آپ اس کی کوئی ٹینشن نہ لیں۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے سارہ سے شادی کر لی ہے اور اب اس کے نام کے ساتھ میرا نام ہے اور آپ کو یہ سن کر بھی خوشی ہوگی کہ میری پر موشن ہو گئی ہے اور اب آپ کا یہ بیٹا ڈی ایس پی ہو گیا ہے۔“

”ماشاء اللہ! اللہ عمر لمبی کرے میں تو جتنی دعائیں بھی کروں تمہارے لیے کم ہیں بیٹے! تم نے ایک ماں کے آنسوؤں کی لاج رکھی ہے، وہ گل جہانوں کا

مالک تمہیں اس سے زیادہ نوازے گا۔“ اس کی اطلاع پر فائزہ بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ اسی لمحے زہرا چائے کے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی لے آئی۔

”بہت بہت مبارک ہو عظیم بھائی! اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔“

”آمین! اور بہت شکریہ بھابی کہ آپ نے میری اتنی مدد کی، خواہنا خواستہ کبھی زندگی میں آپ پر مشکل وقت آیا تو اس بھائی کو آپ جاں نثاروں میں سے پائیں گی۔“

”نہیں میرے بھائی! اللہ تمہیں سلامت رکھے، سارہ ٹھیک تو ہے ناں؟“

”جی بالکل ٹھیک اور بخیر و عافیت ہے۔ بس ہم دونوں کو اب تو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

”وہ تو میں کرتی ہوں، اس کے بھائی اس وقت بہت غصے میں ہیں انہیں اپنی جائیداد اور ساکھ ہاتھ سے نکلتی دکھائی دے رہی ہے اس لیے انہوں نے سارہ کو ڈھونڈنے کے لیے بہت سے بندے مختلف علاقوں میں بھجوا چھوڑے ہیں، ان

کا ارادہ ہے کہ سارہ کے ہاتھ لگتے ہی اسے مار کر اپنی ساکھ اور زمین دونوں بچالیں گے۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا بھابی! آپ بے فکر رہیں، میں اب چلتا ہوں تھوڑی دیر امی کے پاس رکوں گا پھر گھر جاؤں گا۔ آپ نے کوئی پیغام دینا ہو سارہ کو تو دے سکتی ہیں۔“

”پیغام کو چھوڑیں، یہ کچھ چیزیں بنا رکھی ہیں میں نے اس کے لیے، یہ لے جاؤ۔“ جلدی سے واپس پلٹ کر کچن سے کچھ چیزیں نکال کر شاپر میں منتقل کرتے ہوئے وہ تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھیں، سالار ان کی انوکھی محبت پر نثار ہوتا وہاں سے نکل آیا۔ گاؤں سے واپسی میں اسے اچھی خاصی شام ہو گئی تھی، کچھ دیر دفتر میں رک کر جس وقت وہ گھر آیا سارہ بھوکی ہی سوچکی تھی۔ وہ کچھ دیر محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ آہٹ کی آواز سے سارہ کی آنکھ اچانک کھلی تھی۔

”السلام علیکم! گڈ ایوننگ...!“ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ پھر مسکرایا تھا۔ سارہ نے کروٹ بدل کر دوبارہ پلکیں موند لیں۔ ”کمال ہے، سلام کا جواب دینا

بھی گوارہ نہیں۔“ کندھے اچکاتے ہوئے جوتے اتار کر وہ اس کے برابر میں ہی نیم دراز ہو گیا، تبھی وہ اٹھی تھی۔

”کیا مصیبت ہے تمہیں؟“

”بھوک لگی ہے یار! مجھے پتا تھا تم نے تو کچھ کرنا نہیں، لہذا آتے ہوئے بازار سے ہی کھانا لے آیا، اب اٹھ کر پلیٹ میں نکال تو دو۔“

”خود ہی نکال لو، مجھے کوئی بھوک نہیں لگی سونے دو مجھے۔“ اس کے لہجے میں کوفت تھی۔ سالار کے لبوں کی مسکراہٹ پل میں غائب ہو گئی۔

”سارہ! تم مجھے سختی پر مجبور کر رہی ہو، مت بھولو کہ میرا تعلق کس فیلڈ سے ہے۔“

”پتا ہے مجھے جس فیلڈ سے ہے بار بار نہ باور کرایا کرو۔ ہونہہ ڈاکو، لیٹرے بھی خود اور چور چکر باز بھی خود، پکڑتے پھرتے ہیں بے چارے بے گناہ معصوم لوگوں کو، تم لوگوں

کے لیے تو جیسے کوئی قانون ہے ہی نہیں ناں، سیاہ کرو یا سفید، کون پوچھنے والا ہے۔“ وہ بے جا پتی ہوئی تھی۔ سالار اس کے غصے بھرے انداز کو دیکھتا رہ گیا۔

”ایک پولیس والے کے منہ پر اسی کے محکمے کی برائی کر رہی ہو، جیل جانے کا ارادہ ہے کیا؟“

”جیل میں ہی ہوں اس وقت، جو تم نے کیا ہے یہی کام کوئی سول بندہ کرتا تو اب تک اس بے چارے کو اچھی طرح دھو کر دس پندرہ سال کی سزا بھی کروا چکے ہوتے تم لوگ۔“

”تو مجھے بھی تو عمر قید کی سزا ہوئی ہے وہ بھی وہ مشقت یہ دکھائی نہیں دے رہی تمہیں۔“ وہ ہنوز اسے چڑانے کے موڈ میں تھا اور وہ چڑ رہی تھی۔

”کس نے کہا تھا اس عمر قید کی سزا کے لیے؟ میرا بس چلے تو تڑپا تڑپا کے ماروں تمہیں۔“

”اُف! اتنے خطرناک عزائم، دیکھنے میں اتنی معصوم لگتی ہو اور اندر سے کتنی کٹھور ہو۔ کوئی دیکھے تو کبھی یقین نہ کرے کہ جس پولیس والے کے نام سے



بڑے بڑے خطرناک قیدی منہ چھپاتے ہیں وہ اپنی ہٹلر محبوبہ بیوی کے سامنے کس قدر بے بس ہے۔“ مظلومیت سے کہتے ہوئے اس نے سارہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ مزید تپ گئی۔

”ہاتھ چھوڑو میرا...“

”چھوڑنے کے لیے نہیں تھاما۔“

”سالار! میں کہہ رہی ہوں میرا دماغ خراب مت کرو، نہیں تو میں نے اس کھڑکی سے باہر چھلانگ لگادینی ہے۔“

”اچھی بات ہے، ساری ٹینشن ہی ختم ہو جائے گی۔“

”مرو تم...“

اسے قطعی سنجیدہ نہ پا کر وہ پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی جب کہ سالار اس کی خفگی سے بھی لطف اٹھاتے ہوئے خود ہی کھانا پلیٹوں میں نکالنے کو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆...☆...☆

”کیفیه! زینب بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، حرمین رو رہی تھی آج۔ میں نے تمہیں اٹھایا نہیں کہ کل پوری رات جاگتی رہی تھیں تم۔“ جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی بھابی بیڈ پر اس کے قریب ہی آکر بیٹھ گئیں۔

”واٹ! لیکن کل رات تو ان کا بیٹا خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا، اب کہاں ہے حرمین؟“ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھی تھی۔

”چلی گئی ہے اپنے گھر، تمہارا پوچھ رہی تھی میں نے کہا تم سو رہی ہو، جب اٹھو گی تو ان کی طرف آجاؤ گی۔“

”نہیں بھابی! آپ نے اٹھا دینا تھا مجھے، پتا نہیں کیا ہوا ہے زینب بی کو۔“ جلدی سے اپنے سلکی بال کلپ میں مقید کرتے ہوئے وہ بستر سے اتر آئی تھی۔

ابھی پچھلے ہفتے اس کی عظیم لغاری سے ٹھیک ٹھاک تُو تُو میں میں ہوئی تھی اس کے بعد وہ گرین پیلس کی طرف گئی ہی نہیں۔ حرمین سے ہی پتا چلا تھا کہ زینب بی اسپتال سے گھر آچکی ہیں اور وہ اس اطلاع پر اچھی خاصی مطمئن ہو گئی

تھی اب محض ایک ہفتے کے بعد جب کہ عظیم بھی گھر پر نہیں تھا، انہیں جانے کیا ہو گیا تھا؟

جلدی جلدی منہ پر نیم گرم پانی کے دو چار چھپا کے مار کر وہ سیدھی گرین پیلیس چلی آئی تھی۔ حرین اور سعد دونوں کے حلیے خاصے رف تھے۔ سعد کو بھی سردی لگی تھی جس کی وجہ سے وہ ہلکے ہلکے بخار اور فلو میں مبتلا رہا تھا جب کہ حرین کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے، زینب بی اپنے کمرے میں بستر پر اوندھے منہ پڑی تھیں، کیفیہ گھبرا گئی۔ بھاگ کر اپنے گھر سے بھائی کو فون کر کے بلوایا، حرین اور سعد کو بھابی کے پاس چھوڑ کر بھائی کے ساتھ خود انہیں لے کر اسپتال گئی۔ جہاں ان پر اچانک فالج کے اٹیک کا انکشاف ہوا، ایک کے بعد ایک مصیبت نے جیسے ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس لمحے اسے جہاں زینب بی کے اکھڑ مزاج بیٹے پر بے حد غصہ آیا۔ وہیں دل ہی دل میں خود اپنے آپ کو بھی بے بہا سنائیں، جو اس کٹھور انسان کی باتوں کو دل پر لے کر ان کی طرف سے یکسر لا تعلق ہو گئی تھی۔

کتنی اچھی تھیں زینب بی! ان کے ہونے سے جیسے پورے علاقے میں روشنی سی پھیلی تھی، اگر ان کا بیٹا عقل سے پیدل ہو گیا تھا تو اسے تو ہوش سے کام لینا چاہیے تھا مگر اب

کیا ہو سکتا تھا جو اذیت ان کی قسمت میں لکھی تھی وہ تو انہیں جھیلنا ہی تھی۔ فالج کے اچانک اٹیک نے ان کا پورا دایاں حصہ بے کار کر کے رکھ دیا تھا، ایسے میں بستر سے اٹھنا تو درکنار وہ اپنی مرضی سے کروٹ بھی نہیں لے سکتی تھیں۔ کیفیہ نے انہیں بہت بے بسی سے روتے دیکھا تھا اور اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔ عظیم کو ان کی طبیعت کے بارے میں خبر مل گئی تھی مگر فوری چھٹی منظور نہ ہونے کے باعث وہ جاب پر ہی دو حرف بھیج کر سیدھا گھر چلا آیا۔ زینب بی کے کمرے میں کیفیہ انہیں سہارا دے کر پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی وہ نادم نادم سا آگے بڑھ آیا۔

”امی...!“

جواب میں زینب بی بولنے کی کوشش کیے بغیر رو پڑیں۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ان سے لپٹ گیا۔

اگلے روز کیفیہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر آئی تو اسے مصلیٰ پر بیٹھے پایا۔ خدا کی بارگاہ میں مکمل انکساری سے سر جھکائے وہ بھرپور خضوع و خشوع کے ساتھ اس پاک ذات سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی زینب بی کے کمرے کی طرف بڑھ آئی، آج گھر میں اس کی منگنی کی تقریب کا اہتمام ہونا تھا مگر اس کے احساسات بے حد سرد تھے، یوں جیسے کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا ہو۔

عظیم نے نماز کی ادائیگی کے بعد بچوں کو اٹھادیا، پچھلے کئی روز سے حرمین کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا، آج اس کا ارادہ اسے خود اسکول چھوڑ کر آنے کے ساتھ ساتھ اس کی پرنسپل سے ملنے کا بھی تھا۔ حرمین کے کمرے میں سعد بھی اسی کے ساتھ لپٹ کر سو رہا تھا جب کہ رات اس نے بھی بچوں کے ساتھ ہی گزاری تھی یہ الگ بات تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد وہ اٹھ کر زینب بی کو چیک کرتا رہا تھا۔

کیفیہ بچوں کے ناشتے کی غرض سے کچن کی طرف آئی تو وہ بھی سعد کو گود میں اٹھائے اسی طرف آگیا۔ کیفیہ اس کی آہٹ پا کر پھر چونکتے ہوئے پلٹی تھی۔

”کچھ چاہیے آپ کو؟“

”نہیں!“ شرمندہ شرمندہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ فوراً رخ پھیر لیا۔

”میں آپ سے معذرت خواہ ہوں مس! کہ آپ کے اس درجہ خلوص اور اچھائی کے باوجود، میں آپ کے بارے میں غلط رائے قائم کر کے آپ کو ڈس ہرٹ کرتا رہا۔ میری غیر موجودگی میں میری ماں کی خدمت کر کے آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

”اچھی بات ہے لیکن میں نے یہ سب آپ کے لیے کیا ہے نہ آپ کی احسان مندی سے مجھے کوئی فرق پڑتا ہے، میں زینب بی کی دل سے عزت کرتی ہوں اور انہیں اپنی ماں کی جگہ سمجھتی ہوں اسی لیے آپ کو گوارا ہو یا نا گوار گزرے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

دھڑکتے دل کی پروا کیے بغیر اس نے اندر کا غصہ نکالا تھا۔ عظیم لغاری کے لبوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”چلیں یہ بھی اچھی بات ہے، دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بنا کسی صلے یا مطلب کے نیکی کرتے ہیں۔ میں منزہ کے بعد کسی صورت اپنی محبوب ماں کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے میرے کہے سننے کو درگزر کر کے اپنی نیکی کے لیے پلیر اسی طرح ان کا خیال رکھیے گا۔“ اس کے لہجے میں عجیب سی ٹوٹ تھی، کیفیہ نے فوراً نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتا جانے کن خفیہ انہونیوں پر پردا ڈال رہا تھا۔

”کیا مطلب... آپ کہیں جارہے ہیں؟“

”نہیں! ابھی تو یہیں ہوں، لیکن جانا تو پڑ سکتا ہے۔“ وہ مبہم گفتگو کر رہا تھا، کیفیہ کام کے دوران سارے دن الجھی رہی۔

شام میں جو نہی ان کے گھر مہمان آنا شروع ہوئے، گھر کی رونق کو چار چاند لگ گئے۔ اس کا فیانسی بہت بڑا مل اوزر تھا، لہذا ان کی طرف سے تیاریاں دیکھنے والی تھیں۔ حنین، سعد کی انگلی تھام کر اس کے پاس ہی لے آئی تھی،

جس نے سر درد کا بہانہ بنا کر خود کو فی الحال کمرے میں مقید کر لیا تھا۔ حنین اب اس سے باتیں کر رہی تھی۔

”آنی! کیا آپ ماما کی طرح دلہن بنیں گی؟“

”نہیں بیٹے!“

”پھر آپ کے گھر اتنے سارے لوگ کیوں آتے ہوئے ہیں، پاپا کہہ رہے تھے آپ کی شادی ہو رہی ہے۔“

”نہیں بیٹے! ایسی کوئی بات نہیں، آپ کے پاپا کا دماغ خراب ہے اور کچھ نہیں۔“

”ہوں... پتا ہے آنی! کل رات پاپا کی طبیعت بہت خراب تھی، ان کے دوست آئے تھے وہ پاپا کو ڈانٹ رہے تھے۔“

”کیوں...؟“ حنین کی انوکھی بات سن کر وہ حیران ہوئی تھی۔

”پتا نہیں! پاپا آج کل اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلتے۔ دادی ماں روتی رہتی ہیں اور سعد بھی مگر انہیں کچھ خبر نہیں، روزانہ میرا ہوم ورک رہ جاتا ہے سعد کی



وجہ سے اور روزانہ پُچر پوری کلاس کے سامنے میری پٹائی کرتی ہیں۔ پاپا اسکول گئے تھے تو پرنسپل نے ان سے بھی میری شکایت کی تھی، جب ماما تھیں تو پرنسپل میری بہت تعریف کرتی تھیں اب ڈانٹتی رہتی ہیں! جب تک میری ماما واپس نہیں آجائیں، کیا آپ میری اور سعد کی ماما نہیں بن سکتیں؟“

بلا تکان بولتی اس معصوم بچی کے عاجزانہ لہجے نے اسے جیسے ساکت کر دیا تھا۔ اس کی پلکیں لمحوں میں آنسوؤں کے بار سے بوجھل ہوئی تھیں۔

”نہیں حرمین! میں آپ کی ماما جتنی اچھی نہیں ہوں۔“

”لیکن سعد تو آپ سے زیادہ پیار کرتا ہے، ماما پاپا سے بھی زیادہ... آئی! اگر میری ماما کبھی واپس نہ آئیں کیا تب بھی آپ میری ماما نہیں بنیں گی؟“

وہ اس سے حد درجہ مانوس ہو گئی تھی۔ کیفیہ نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگالیا۔

☆...☆...☆

فائزہ بیگم کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے ناساز تھی مگر ان کے تینوں بیٹوں کو ہی ان کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ سارہ کی اچانک گمشدگی سے

ہونے والی رسوائی نے جیسے آگ دہکا رکھی تھی ان کے اندر۔ شاہد اس کی گمشدگی کا سارا الزام، اپنے پرانے غصے کی آگ پر پانی ڈالنے کے لیے اسلم لوہار اور اس کے اکلوتے بیٹے پر ڈال کر اسے لمبی سزا کروانے پر بضد ہو گیا تھا۔ اسلم لوہار کی بیوی صبح و شام جھولی پھیلا پھیلا کر اسے اور اس سے متعلقہ پولیس والوں کو بددعائیں دیتی پھرتی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اسے نہ کسی کی آہوں سے ڈر لگتا تھا نہ بددعاؤں پر یقین تھا، لہذا خوب ظلم کا بازار گرم کیا ہوا تھا گاؤں میں بے کس، غریب، مجبور، ان پڑھ دیہاتیوں اور سیدھے سادے لوگوں پر ظلم کا بھی اپنا ہی الگ مزا تھا۔ اپنے بیٹوں کی اسی بے راہ روی نے فائزہ بیگم کو بستر سے لگا چھوڑا تھا۔ اس روز ان کے سینے میں بہت تکلیف تھی، زہرا اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کر رہی تھی ان کی تکلیف دور کرنے کی مگر وہاں کوئی افاقہ نہیں تھا۔ وہ خالص دیسی روٹی گرم کر کے جس وقت ان کے سینے پر ٹکور کر رہی تھی تب انہوں نے کہا تھا۔

”زہرا! تو میری بہت اچھی بہو ہے، میں جیتے جی تیرے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی، لیکن اس دائمی جہان میں ضرور تیرے لیے رب سوہنے کے حضور

فریاد کروں گی۔ تو نے میری دھی کو اس کے ظالم بھائیوں کے قہر سے بچا کر بڑا احسان کیا ہے پتر! میرے بعد بھی خیال رکھنا اس کا، میری دھی بڑی نمائی ہے۔“ تکلیف کے باعث ان کا لہجہ بلند تھا، زہرا کا دل کانپ اٹھا۔

”نہ چاچی! ایسے نہ کہہ، میں بھی عورت ہوں اور عورت کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ سارہ میرے لیے چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں، میرے ہوتے کوئی اس کے پاؤں کی دھول کو بھی نہیں پاسکتا۔“

”اچھا...؟“ وہ اپنی رو میں لگی ہوئی تھی اسے گمان ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر اور دونوں دیور کمرے کی دہلیز تک پہنچ چکے ہیں۔ یلکھت سفید چہرے کے ساتھ وہ پلٹی تھی اور اپنے شوہر کی آنکھوں میں خون ابلتے دیکھ کر سہم گئی تھی۔

”حرام زادی... ہمارا کھا کر ہمیں ہی ہاتھ دکھاتی ہے؟“ شاہد، جسے اس نے بچوں کی طرح پالا تھا لپک کر اس کے لمبے بالوں کی چوٹی کو گرفت میں لے چکا تھا جب کہ اس کے شوہر ضیاء نے آگے بڑھ کر فائزہ بیگم کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس کی کمر میں اتنی زور سے لات رسید کی کہ وہ درد سے کراہ بھی نہ سکی۔

”نند سے پیار اور میاں سے غداری! سارے گاؤں میں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا اس نے۔“ اسے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے باہر صحن میں گھسیٹتے ہوئے ضیاء چیخ رہا تھا۔ فائزہ بیگم نے بلکتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی تو ریاض نے لپک کر انہیں دبوچ لیا۔

”تو پڑی رہ ماں! میاں بیوی کا معاملہ ہے تو بیچ میں مت آ...“

”ارے چھوڑو مجھے، میری بیٹی ہے وہ۔ خدا کے قہر سے ڈرو ظالمو، اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔ بڑے بڑے غاصبوں کی زمین جائیدادیں یہیں رہ گئیں...“

”اماں کو چپ کروا ریاض! نتیں تو اس پر بھی میٹر گھوم جائے گا۔“

شاہد کے لہجے میں آگ کی تپش تھی۔ ریاض نے فائزہ بیگم کے منہ پر اپنا ہاتھ جمادیا جب کہ ضیاء اب کچن میں مٹی کے تیل کی بوتل کے ساتھ ماچس ڈھونڈ رہا تھا۔ قرب و جوار کے گھروں کی خواتین منہ پر کپڑا لے کر اپنے اپنے گھر کی چھتوں پر چوہدریوں کے گھر ہونے والا یہ نیا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ گاؤں کے کسی مرد میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان تینوں کو ان کے ظلم سے باز رکھنے کی سعی کر سکتا۔

زہرا کے ہاتھ اس کی لمبی چوٹی سے باندھ کر اب شاہد نے اس کی ٹانگیں قابو کر رکھی تھیں جب کہ اس کی پندرہ سالہ رفاقت میں اس کی ساری خدمت گزار یوں پر پانی پھیرنے والا اس کا ظالم مجازی خدا اس پر مٹی کا تیل پھینک رہا تھا جیسے اسے پانی میں نہلا رہا ہو۔ اپنے آپ کو بظاہر مسلمان کہلانے والے ان مسلم شیطانوں نے اپنے غصے کی آگ میں اس وقت جس مسلم پاک باز عورت کو ”ستی“ کیا تھا وہ تو بیوہ بھی نہیں تھی، اسے تو آگ کے شعلوں کی نذر کرنے والا خود اس کا اپنا شوہر ہی تھا۔ محض چند لمحوں کا کھیل تھا مگر...

چند لمحوں کے اس بھیانک کھیل میں ایک بھرپور جان دار زندگی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا۔ سالار کو جیسے ہی اس افسوس ناک واقعے کی خبر ہوئی وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے فوراً وہاں پہنچا مگر اب وہاں صرف انسانی ہڈیوں کی راکھ کا ڈھیر تھا۔ ضیائی، ریاض اور شاہد تینوں کا ہی کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں روپوش ہو گئے ہیں۔

اجڑے ہوئے گھر کے ویران کمرے میں اپنے بستر پر پڑی فائزہ بیگم جیسے اپنی آخری سانس پوری کر رہی تھیں۔ سالار کا دماغ جیسے فریز ہو گیا۔ اتنا سب کچھ

ہو جانے کا تو اسے گمان ہی نہیں تھا۔ غم و غصے سے اس کی حالت جیسے پاگلوں جیسی ہو گئی تھی اس لمحے اس نے فوری طور پر اپنی پوری پولیس فورس کو سختی سے کسی بھی حال میں ان تینوں کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا تھا۔

زہرا کی افسوس ناک وفات کے اگلے ہی روز فائزہ بیگم نے بھی چپ چاپ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اتنی فرصت بھی نہ مل سکی تھی کہ وہ سارہ کو تمام صورت حال سے باخبر کر کے وہاں لاسکتا۔ اس کے گھر والے حویلی آگئے تھے، ابھی وہ فائزہ بیگم کی تدفین سے فارغ ہوا تھا کہ اسے علاقے کے منسٹر کی کال آگئی، جس نے فوری ملاقات کے لیے اسے اپنی کوٹھی پر طلب کر لیا۔

”آؤ جوان! سنا ہے پر موشن ہو گئی ہے تمہاری، بھئی بہت بہت مبارک ہو۔“ جیسے وہ منسٹر کے حضور پیش ہوا، سلام دعا کے بعد یہی پہلا جملہ اسے سننے کو ملا۔

”جی! کرم ہے اللہ پاک کا، آپ کی مبارک باد کا شکریہ۔ مجھے کیسے طلب فرمایا آپ نے؟“

”کام تھا یار! تمہیں تو پتا ہے ہم لوگ صبح و شام عوام کی خدمت میں کتنے مصروف رہتے ہیں، میل ملاقاتوں کے لیے ٹائم کم ہی ملتا ہے۔“

”جی میں جانتا ہوں اور میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا مگر سوری سر میں اس وقت گھر میں مصروف تھا۔ میری مسز کی بھابی اور ماں کی رحلت ہو گئی ہے میں...“

”مجھے ساری خبر ہے ڈی ایس پی صاحب! زیادہ ٹائم میرے پاس بھی نہیں ہے۔ آج کل تو ویسے بھی الیکشن سر پر ہیں، تمہیں بس اتنا بتانا تھا کہ وہ جو لڑکی، کیا نام تھا اس کا، ہاں

زہرا! وہ جو مری ہے اس کا قتل اپنی جیل میں کسی بھی ایکس وائے زیڈ پر ڈال کر کیس بنادو، جو اصل مجرم ہیں ان کے ساتھ میرے بیٹے کی اچھی اٹھ بیٹھ ہے تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات...؟“

”سوری سر! مرنے والی کو میں نے اپنی بہن بنایا ہوا تھا اور اس کی ناگہانی موت کے باعث میری سگی پھوپو کی وفات بھی ہو گئی ہے، اس لیے یہ کیس

کوئی معمولی کیس نہیں ہے میرے لیے، جس میں کسی کے گناہ کی سزا کسی اور کو دے دوں۔“

”میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں جوان! مگر تم ٹینشن نہ لو، یہ نمائی عورتیں یہ اللہ نے ہمارے کام آنے کے لیے ہی بنائی ہیں۔ یہاں گاؤں، پنڈوں میں، یوں ہی گائیوں، بھینسوں کی طرح روز مرتی رہتی ہیں یہ کوئی ایف آئی آر نہیں کٹتی، کوئی گرفتار نہیں ہوتا، ہو بھی جائے تو زیادہ دن اندر نہیں رہتا۔ غصے کو جانے دو اور اپنی مزید ترقی کے خواب دیکھو، میں کل ہی اوپر بات کر کے ایک دو پھول اور لگوادیتا ہوں تمہاری وردی پر۔“

”سوری سر! مجھے یہ گھاس منظور نہیں، بے شک آپ کی پہنچ اونچی ہے مگر میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں برت سکتا۔ اب چلتا ہوں خدا حافظ۔“

منسٹر کو گمان بھی نہیں تھا کہ نئی نئی ترقی پانے والا وہ پولیس افسر اتنا ٹیڑھا ہو گا۔ اس نے فوری طور پر ضیائی، ریاض اور شاہد کی عبوری ضمانت کروا کر انہیں بھرپور تسلی کے ساتھ حویلی سے رخصت کر دیا اور خود اس مسئلے کا حل اپنے طور پر نکالنے کی کوشش فی الحال سائیڈ پر رکھ دی۔



☆...☆...☆

رات خاصی گہری ہو رہی تھی جب وہ تھکن زدہ وجود کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف واپس آیا تھا۔ سارہ جو اس کی دو دن مسلسل غیر موجودگی کے باعث اچھی خاصی پریشان ہو گئی تھی، اب اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی۔

”آگیا گھر یاد‘ میں پوچھتی ہوں میرا قصور کیا ہے جو مجھے یہاں جانوروں کی طرح لا کر قید کر دیا ہے اور خود پتا نہیں کہاں کہاں عیاشی کرتے پھر رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں چنگھاڑ تھی۔ سالار نے کچھ دیر گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد رخ پھیر لیا۔

”مصروف تھا میں‘ بہت زیادہ۔“

”تو میرا کیا قصور ہے‘ جو بھوکے پیاسے مجھے یہاں اجنبی سنان علاقے میں لا کر قید کیا ہے۔“

”کوئی قید نہیں کیا میں نے تمہیں‘ یہاں ضرورتِ زندگی کی ہر شے موجود ہے‘ ہل کر کھاپی سکتی ہو‘ کسی نے روکا نہیں ہے تمہیں۔“ پہلی بار اس کی بدتمیزی کا جواب اس نے تلخی سے دیا تھا‘ وہ گنگ سی اسے دیکھنے لگی۔

”میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے‘ کل شفٹنگ کرنی پڑے گی‘ جو تھوڑا بہت سامان ہے پیک کر لو۔“ اس کی حیرانی پر دوسرے ہی لمحے تھکے تھکے سے انداز میں کہتا وہ بیڈ پر گر پڑا تھا۔ سارہ کچھ پل اسے ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”سالار! گاؤں میں سب کیسے ہیں؟ پتا نہیں کیوں کل شام سے میرا دل بہت پریشان ہے۔“

”ٹھیک ہیں سب‘ تمہارے بھائیوں کے ہاتھ بہت اونچے ہیں‘ انہیں کچھ نہیں ہو سکتا سارہ!“ آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر وہ رنجیدگی سے بولا تھا جس پر وہ مزید الجھ کر رہ گئی۔

”کب ہوا ہے ٹرانسفر...؟“

”کل شام! صبح منسٹر نے بلا کر ضمیر کی بولی لگائی اور شام میں ظلم کے سامنے سر نہ جھکانے کے جرم میں ٹرانسفر آرڈر آگئے۔“

”واہٹ! لیکن اتنی جلدی یہ کیسے ممکن ہے‘ کچھ روز تو لگتے ہیں ٹرانسفر آرڈر میں۔“

”تم نہیں سمجھو گی سارہ! یہاں کچھ بھی ممکن ہے، بڑی کرسیوں پر براجمان بڑے افسران کے قلم کی ایک جنبش کیا سے کیا نہیں کر سکتی۔“ سارہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی معمولی سی بات پر وہ اتنا دکھی اور پریشان کیوں تھا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“

”نہیں! بس سونے لگا ہوں میں، تم نے اگر نہیں کھایا تو کھالو اور... وہ جو زہرا بھابی نے کچھ چیزیں دی تھیں مجھے وہ استعمال کر لیں کہ نہیں۔“

”کر لی تھیں، میرے گھر کی چیزوں کی بات ہی الگ ہے۔“

آج وہ شکستہ لگ رہا تھا تو اس کا موڈ خود بخود اچھا ہو گیا تھا۔

اگلے روز وہ خاصا لیٹ بیدار ہوا تھا۔ اس روز پہلی بار سارہ نے ناشتا تیار کیا کیونکہ اسے خود بہت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ سالار کا کوئی دوست ملنے آیا تھا۔ لہذا وہ ناشتہ کیے بغیر مصروف ہو گیا۔ بیرونی دروازے پر پڑا اس کا منہ چڑاتا قفل اب وہاں نہیں تھا اور یہ اس کے لیے انتہائی خوشی کی بات تھی۔ سالار کا دوست رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ قفل کی پروا کیے بغیر شاور لینے

واش روم میں گھس چکا تھا۔ سارہ کے لیے یہ موقع کسی غیبی امداد سے کم نہیں تھا۔

وہ کمرے میں آئی اور ایک کاغذ گھسیٹ کر جلدی جلدی اس پر سالار کے نام ایک چھوٹی سی تحریر لکھی جس میں یہ درج کیا کہ وہ اسے باعزت طریقے سے گاؤں سے رخصت کروا کر لاتے تب وہ اس کے ساتھ بھرپور خوش گوار زندگی گزار سکتی ہے، یہ چٹ اس نے بیڈ پر اوپن رکھی اور خود چادر اٹھا کر چھپاک سے باہر نکل گئی۔

کتنے دن ہو گئے تھے اسے باہر کی دنیا دیکھے، روڈ پر آکر ایک عجیب سے احساس نے اسے دبوچ لیا۔ پتا نہیں بھائی اسے اتنے دنوں کے بعد سامنے دیکھ کر اس کا کیا حشر کرتے؟ ماں اور بھابی نے تو ضرور رو رو کر آنکھیں سوجھالی ہوں گی۔ مختلف سوچوں کے حصار میں جکڑی بالآخر وہ اپنے گاؤں کی بڑی سڑک پر گاڑی سے اتر گئی۔

اسی پل ضیاء اور ریاض جو گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے ان کی نگاہ اس پر پڑی اور وہ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے، اس کی طرف بڑھ آئے۔

”سارہ...!“ اپنے بھائی کی پکار پر اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور بھاگ کر ان کے قریب آگئی۔

”ضیاء بھائی... ریاض بھائی... مجھے معاف کر دیں۔“ فوراً آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے ضیاء بھائی کا ہاتھ چوم لیا۔ جس پر انہوں نے بھی نرمی کا مظاہرہ کیا۔

”چل گھر چل... گھر چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ جوڑ رہی تھی ان کی نرمی پر حیران ہوتی کپکپاتے جسم اور لرزتے دل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سالار نے شاور لے کر جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، بھاں بھاں کرتے گھر اور بیڈ پر آنکھوں کے سامنے پڑے کاغذ نے اسے عجیب سے خدشے میں مبتلا کر دیا۔ پلٹ کر فوراً بیرونی دروازے کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لپک کر بیڈ پر پڑے سفید کاغذ پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے اسے لگا جیسے اس کا بدن سُں

ہو گیا ہو۔ سارہ سے اس درجہ بے وفائی و حماقت کی توقع نہیں تھی اسے، کسی انجانے خدشے کے پیش نظر ٹاول بیڈ پر پھینک کر وہ فوراً گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆...☆...☆

اس روز موسم بہت پیارا تھا، رخصت ہوتے ہی دسمبر کی اداس شاموں نے اس کا دل جیسے بے دل کیا ہوا تھا۔ وہ اپنے فیانسی کے بے حد اصرار پر صرف اپنے بھائی اور بھابی کی خوشی کے لیے اس کے ساتھ گھومنے آئی تھی۔ بلاشبہ اس کا فیانسی کسی بھی خوب صورت سمجھ دار لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا مگر اس کا دل جانے کیوں اس کی طرف راغب نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ دونوں آواری سے نکلے تھے جب اچانک حرمین نے اسے دیکھا۔

”آنی...!“ وہ بے حد چونک کر آواز کی طرف متوجہ ہوئی تھی، اس سے کچھ ہی فاصلے پر عظیم، سعد اور حرمین کے ساتھ کھڑا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ سعد کی نگاہ بھی اس پر پڑ گئی تھی اور اب وہ عظیم کی بانہوں میں اس کی طرف آنے کے لیے مچل رہا تھا۔

”ماما... ماما...“ ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے اس نے اپنی ہی رٹ شروع کر دی تھی جس پر وہ بوکھلا کر رہ گئی کیونکہ اس وقت اس کا ہونے والا مجازی خدا اس کے ساتھ تھا۔

”ماما... یہ بچہ تمہیں ماما کہہ رہا ہے...؟“ سعد کی پکار پر وہ چونکا تھا۔ کیفیہ سے وضاحت کرنا مشکل ہو گئی۔

”ہاں... وہ... اصل میں ان بچوں کی ماں کی وفات ہو گئی ہے تو...“

”تو تم نے ان کی ماں بننے کا منصب سنبھال لیا ہے۔“

”تھوڑی دیر قبل پھول برسانے والے لہجے میں اچانک تلخی در آئی تھی وہ اس قطعی غیر متوقع صورت حال پر گڑبڑا گئی۔

”نہیں... اصل میں یہ بچے مجھ سے بہت اٹیچ ہیں اسی لیے...“

”اسی لیے تمہیں اپنی ماں سمجھنے لگے ہیں۔“ ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر

وہ خفگی سے بولا تھا۔ ”یہ غلط ہے کیفیہ! ابھی کچھ روز بعد ہماری شادی ہونے

والی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ان بچوں کے ساتھ اتنی اٹیچ ہو جاؤ کہ پھر ان

کے بغیر خوش نہ رہ سکو۔ اس لیے پلیز... آئندہ ان سے دور ہی رہنے کی

کوشش کرنا۔“ نگاہیں مسلسل عظیم لغاری کی شان دار شخصیت پر جمائے وہ اسے تنبیہ کر رہا تھا۔ کیفیہ کو دفاع میں ایک لفظ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا اس نے۔

”اب چلو پلیز! مجھے بہت ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔“ اس کا ہاتھ حرمین سے چھڑا کر اس نے زبردستی اسے گاڑی کی طرف کھینچا اور اگلے ہی پل خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ سعد اب بھی عظیم کی بانہوں میں مچلتے ہوئے اس کے لیے رو رہا تھا، سڑک پر کھڑی ننھی حرمین اب بھی دکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آنسو پی رہی تھی جب کہ عظیم نے اس شخص کی آنکھوں میں اس لمحے ایک عجیب سا الاؤ دہکتے دیکھا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ پوری رات اس کی بے حد اضطراب کے عالم میں کٹی تھی، اگلی صبح ناشتے کی میز پر بھائی کے آفس روانہ ہونے کے بعد بھابی اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔

”کل خرم بہت غصے ہو رہا تھا کیفیہ! کہہ رہا تھا تمہیں زینب بی کے گھر جانے

سے روکوں، جو ان لڑکا ہے ان کا، اونچ نیچ ہو گئی تو کتنی رسوائی ہو گی۔“



”اس کا دماغ خراب ہے بھابی! میں وہاں زینب بی اور بچوں کی وجہ سے جاتی ہوں، ان کے جوان لڑکے سے ملنے نہیں جاتی۔“ بھابی کی بات پر خرم کا غبار اس نے اب نکالا تھا۔ مگر انہوں نے پروا نہیں کی۔

”بڑا منانے کی بات نہیں ہے کیف! اس کی نظر سے دیکھو تو بات ٹھیک ہے۔ کچھ ہی دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی میں خوا مخواہ لوگوں کو بات کرنے کا موقع کیوں دو، میں جانتی ہوں تم بہت اچھی لڑکی ہو، زینب بی اور ان کا بیٹا بھی بڑا نہیں مگر خرم میری نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا اس لیے پلیز تم اب تھوڑی احتیاط کرنا، میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم...؟“

”جی...!“

گہری سانس بھر کر مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ ناشتا چھوڑ کر دوبارہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ سامنے زینب بی کے لان میں اچھی خاصی دھوپ بکھری تھی، وہ بوجھل دل لیے کتنی دیر ٹیرس پر کھڑی اس لان کی طرف دیکھتی رہی۔

☆...☆...☆

”سارہ کہاں ہے؟“ تین گھنٹے کا سفر دو گھنٹوں میں طے کر کے وہ اب ضیاء بھائی کے سامنے کھڑا ان سے پوچھ رہا تھا۔ جواب میں شاہد نے اٹھ کر اسے آنکھیں دکھائیں۔

”کس حق سے پوچھ رہے ہو اس کا؟ دیکھ لیے ہمارے ہاتھ تیرے جیسے معمولی افسریوں چوٹیوں کی طرح مسل کر پھینک دیئے جاتے ہیں، آیا بڑا فرض شناس کہیں کا۔“

”میں سارہ کا پوچھ رہا ہوں، سارہ کہاں ہے؟“ اس بار وہ دھاڑا تھا جس پر ضیاء بھائی کو جلال آگیا۔

”ہولی بول سالار! یہاں اونچا کوئی نہیں سنتا۔ سارہ اب ہماری پناہ میں ہے، تم کیا سمجھتے ہو زبردستی نکاح پڑھوا کر بڑا تیر مار لیا تم نے۔“

”شٹ اپ! میری بیوی ہے وہ، قانوناً بھی اور اسلام کی رو سے بھی۔ ابھی اور اسی وقت اگر آپ لوگوں نے اسے میرے حوالے نہیں کیا تو بہت بڑا کروں گا میں آپ کے ساتھ۔“

”اوائے جا... بہت دیکھے تیرے جیسے بھڑکیں مارتے افسر! خلع کے نوٹس مل جائیں گے کل۔ جا جو ہوتا ہے کر لے۔“ شاہد کا لہجہ غرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ سالار اس لمحے اپنے تپتے اعصاب کو بمشکل کنٹرول کرتا خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اسے قطعی خبر نہیں تھی کہ ان لوگوں نے سارہ کے ساتھ کیا کیا ہے، وہ جو خوشی خوشی اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر آئی تھی گھر پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ درودیوار سے ٹپکتی عجیب سی وحشت نے اس کا دل جکڑ لیا تھا۔ از حد حیران ہو کر وہ پلٹی تھی۔

”ضیاء بھائی! ماں اور بھابی کہاں ہیں؟“

چٹاخ... اپنے سوال کے جواب میں ضیاء بھائی کے بھرپور تھپڑ نے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

”ضیاء بھائی...“

”مر گیا ضیاء بھائی... بے غیرت... صرف تیری وجہ سے کیا کیا نہیں ہو گیا یہاں، اس لیے شہر جا کر کالجوں کی ہوا کھائی تھی کہ بھائیوں کی عزت پر داغ لگا سکو؟“ ان کا لہجہ قہر برسا رہا تھا وہ پھپک کر رو پڑی۔

”میں بے قصور ہوں بھائی! کبھی خواب میں بھی میں آپ کی عزت پر داغ لگانے کا نہیں سوچ سکتی۔ مم... مجھے تو سالار نے زبردستی اغواء کیا تھا۔“

”سالار نے...؟“ ایک لمحے کے لیے انہیں جھٹکا لگا تھا۔

”جی ہاں... وہاں شہر میں زبردستی اس نے مجھ سے نکاح بھی پڑھوایا اور اتنے دن اپنے گھر میں قید بھی رکھا۔ آج پہلی بار وہ بیرونی دروازے کو لاک کرنا بھول گیا تو میں فوراً نکل آئی، میرا یقین کریں بھائی! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ سارا الزام سالار آفندی کے سر ڈال کر وہ اپنی طرف سے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

ضیاء اور شاہد نے کچھ سوچتی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئے۔

”سارہ کو یہاں رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے، تم ایسا کرو اسے شہر والے بنگلے میں لے جاؤ، میں پیچھے دیکھتا ہوں وہ سالار کا بچہ ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔“ ضیاء نے شاہد کو حکم دیا تھا جس کی فوری تعمیل میں وہ ہکا بکا سی کھڑی سارہ کو بازو سے پکڑ کر باہر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شہر پہنچ کر اسے بنا کچھ بتائے ایک تاریک کمرے میں قید کر دیا گیا تھا جس پر وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

سالار کا خیال آتا تو دھڑکتے دل کے عجیب سے وسوسے بھی دماغ کا گھبراؤ کر لیتے۔ اس پر فائزہ بیگم اور زہرا کی یاد مزید بے قرار کر دیتی۔ یہ بے قراری جانے کب تک باقی رہتی کہ منسٹر کی بیٹی کا ٹکراؤ ہو گیا اس سے۔ وہ فطرتاً رحم دل اور انصاف پسند لڑکی تھی، تمام حقائق جاننے کے بعد لا تعلق بنے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا لہذا اپنے بھائی کے ساتھ اسی کی اطلاع پر وہ سارہ سے ملنے چلی آئی۔ دروازہ اچانک کھلنے سے کمرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی تھی، سارہ جو بیڈ پر پاؤں سمیٹے بے حد پریشان بیٹھی تھی اچانک چونک کر آنے والے کی طرف متوجہ ہوئی۔

منسٹر کی بیٹی چند ثانیے اس کے حال پر غور کرنے کے بعد پھر بیڈ پر اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

”ہیلو! مجھے شگفتہ کہتے ہیں میرے بھائی تمہارے بھائیوں کے بہت اچھے دوست ہیں۔ ان سے ہی پتا چلا کہ تمہارے بھائیوں نے تمہیں یہاں لا کر قید کر دیا ہے تو یونہی ملنے چلی آئی۔ تم یقین نہیں کرو گی مگر مجھے ریسی تمہارے اور تمہاری فیملی کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔“

”کیا مطلب، میں سمجھی نہیں...؟“

”سمجھو گی کیسے، تمہیں تو کچھ پتا ہی نہیں ہو گا شاید یہ بھی پتا نہ ہو کہ تمہاری والدہ اور بھابی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”کیا ہوا ہے؟“ آنکھوں میں تحیر بھرے اب وہ لرزتے دل کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بہت بُرا ہوا ہے یار! تمہاری بھابی کو تمہارے بھائیوں نے گھر کے صحن میں زندہ جلا ڈالا، جس کے صدمے نے تمہاری والدہ کی جان بھی لے لی اور

اب تمہارے بھائی تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس لیے میں چاہتی ہوں تم یہاں سے بھاگ جاؤ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ لوگ کسی بھی وقت تمہیں یہاں سے لے جائیں۔“ اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی وہ لڑکی جانے کیا کیا انکشاف کر رہی تھی اور سارہ کو لگ رہا تھا جیسے زندگی اس کے وجود سے رخصت ہوتی جا رہی ہے، اس کی سماعتیں سن ہو رہی تھیں، جان سے پیارے بھائیوں کا یہ چہرہ، یہ کردار، یہ عزائم اسے لمحوں میں گھائل کر گئے تھے۔

”نہیں... میرے بھائی ایسا نہیں کر سکتے، تم ضرور جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ کیوں ماریں گے میری بھابی کو، میری بھابی تو اتنی اچھی ہیں اور میں... میں نے بھلا کیا بگاڑا ہے ان کا جو وہ مجھے ماریں گے؟“ اسے جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”یہ تو تم اپنے بھائیوں سے ہی پوچھنا، میں تو انسانیت کے ناتے محض اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ جاتے ہوئے باہر سے دروازہ لاک نہ کروں، پوچھا بھی گیا تو کہہ دوں گی کہ بھول گئی تھی۔ تمہارے بھائی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، بہر حال زندگی سے قیمتی کوئی چیز نہیں ہوتی، اب چلتی ہوں میں، باتے...“ وہ جیسے

اچانک آئی تھی ویسے ہی ہاتھ ہلاتی اچانک رخصت ہو گئی مگر سارہ کے اندر اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ وہ اپنے پیروں کو ہی حرکت دے سکتی، کتنی ہی دیر سکتے کے انداز میں غم سے چُور بیٹھنے کے بعد اچانک وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ رشتوں کی اس سے زیادہ بھیانک تصویر اور کیا ہو سکتی تھی؟

گاؤں میں دوبارہ سالار کے گھر جانا بھی کسی صورت خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لہذا بہت سوچ کر وہ کیفیہ کی طرف چلی آئی، روپیہ پیسہ تو پاس تھا نہیں، بس والے کو کرائے کے طور پر اس نے اپنی نتھنی اتار کر دے دی تھی۔

کیفیہ اسے اجڑے حال میں اتنے دنوں کے بعد اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ سارہ نے بھی اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور سارا احوال اس کے گوش گزار کر دیا پھر اسی سے لپٹتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

سالار جو اس کے تینوں بھائیوں پر نیا کیس بنا کر ان کا فوری چالان کروانے کے بعد اپنا ٹرانسفر رکوانے کی تگ و دو میں مصروف تھا اپنے سیل پر کیفیہ



کی ہزار کالز نظر انداز کرنے کے بعد سارہ کے حوالے سے میسج پڑھ کر چونک گیا۔ کیفیہ کے یہ اطلاع دینے پر کہ سارہ اس کے پاس محفوظ ہے اس نے خود فوری طور پر اسے کال کی تھی اور سارہ سے دو منٹ کی بات کرنے کے بعد وہ اپنی پرسنل گاڑی میں فوراً اسے ملنے پہنچ گیا تھا۔

اگلے دو گھنٹوں میں وہ کیفیہ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا سارہ کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا جس سے سامنا ہوتے ہی سالار نے اسے دو تھپڑ رسید کیے تھے۔

”غصے کو جانے دیں سالار بھائی! آپ جانتے تو ہیں یہ کتنی بے وقوف ہے اور زیادتی بھی تو کتنی بڑی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس کے بھائیوں نے یہ سب کیوں کیا اور آپ نے ہر بات طے ہونے کے باوجود اسے کڈنیپ کر کے زبردستی نکاح کیوں کیا؟“ کیفیہ نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے لب کھولنا ضروری سمجھا تھا۔ سالار اس کے سوالوں پر لب بھینچ کر رخ پھیر گیا۔

”گاؤں کے جو قانون اور حالات ہوتے ہیں وہ آپ نہیں سمجھتیں مس کیفیہ! میں سارہ سے محبت ضرور کرتا ہوں مگر زور زبردستی سے اسے حاصل کرنا میری خواہش نہیں تھی، اس اقدام کے لیے مجھے زہرا بھابی اور فائرہ پھوپو نے مجبور کیا تھا کیونکہ وہ ان محترمہ کے معزز بھائیوں کے راز جان گئی تھیں۔ زمین کے تھوڑے سے ٹکڑے کو بچانے کے لیے ان کے تینوں بھائی صاحب انہیں جان سے مارنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے، اسی لیے پھوپو اور بھابی نے گھر بلا کر مجھ سے ریکوئسٹ کی کہ میں اسے ان کے سائے سے بھی دور لے جاؤں، مجھے نہیں معلوم کہ انہیں زہرا بھابی پر شک کیسے ہوا، مگر جب تک میں وہاں ان کی مدد کے لیے پہنچا بہت دیر ہو چکی تھی، اسے کہیں جا کر اپنے گاؤں والوں سے اپنے بھائیوں کی زندگی کا احوال سنے پھر یہ فیصلہ کرے کہ اسے میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے یا نہیں۔“ اس کا موڈ بے حد خراب تھا، سارہ کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

”جو ہو گیا اسے بھول جائیں، اب آگے یہ سوچنا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

کیفیت نے پھر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی جب وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں بہتر طور سے جانتا ہوں کہ آگے کیا کرنا ہے، آپ فکر نہ کریں صرف اپنی دوست کا خیال رکھیں، میرا خیال ہے کہ میں نے پھوپھو کی بات مان کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔“ وہ کسی طور لائن پر نہیں آ رہا تھا۔ کیفیت نے بوکھلا کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو سارہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے کھڑے ہونے اور کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

”نہیں... انہیں جانے دو، تم نے سنا نہیں امی کی بات مان کر انہوں نے مجھ سے شادی نہیں کی غلطی کی ہے، سدھارنے دو اپنی غلطی انہیں، میری قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہوگا۔“ رندھے لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھی جب کہ پیچھے کیفیت سالار کو اس پر گزرنے والی تمام مصیبتوں کا حال سناتی رہی۔

☆...☆...☆

اس کی شادی کے دن تیزی سے قریب آرہے تھے اب سارہ بھی بجھے دل کے ساتھ اس کی شادی کی تیاریوں میں اس کی بھابی کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ ابھی کچھ روز قبل اس کے تینوں بھائیوں پر اس کی بھابی اور اسلم لوہار کی بیٹی کے قتل کا پرچہ عدالت سے آرڈر ہو گیا تھا جس کے بعد تینوں کو گرفتار کر کے ان کا چالان مکمل کر دیا گیا تھا۔ جس زمین اور جائیداد کے لیے وہ انسان سے حیوان بنے پھرتے تھے وہ زمینیں یونہی لاوارث پڑی رہ گئی تھیں۔ کوئی ان کی پیروی کرنے والا نہیں تھا جن دوستوں اور اونچے تعلقات پر انہیں گھمنڈ تھا، ان دوستوں نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی تھی ان کی، پتا نہیں کتنی ماؤں کی آہوں اور بددعاؤں کا جال انہیں گھیرے ہوا تھا۔ پولیس کے جن بے ضمیر افسروں کو انہوں نے پیسے کی طاقت سے خرید کا اپنا غلام بنا رکھا تھا وہ سارے یا معطل ہو گئے تھے یا ان کا ٹرانسفر ہو گیا تھا جب کہ سالار کے ٹرانسفر آرڈر کینسل ہو گئے تھے۔ اسی نے حویلی کو تالا لگوا کر زمینیں ٹھیکے پر مختلف مزارعوں کو دے دی تھیں اور ٹھیکے سے حاصل ہونے والی رقم سارہ کے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر وادی۔

کیفیت سے گاہے بگا ہے اس کی بات ہوتی رہتی تھی وہ اس کی منت کرتی تھی کہ وہ سارہ کو معاف کر دے مگر وہ سنی ان سنی کر کے بات ٹال دیتا۔ اب جیسے جیسے اس کی اپنی شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اس کا دم جیسے گھٹنا جا رہا تھا۔ اس روز سارہ طبیعت کی ناسازی کے باعث جلد سو گئی تھی جب کہ وہ عجیب سی اداسی و بے چینی کی شکار ہو کر سخت ٹھنڈ کے باوجود باہر لان میں آ بیٹھی۔ اندر اتنی گھٹن تھی کہ بار بار پلکیں جھپکنے کے باوجود ٹوٹ کر رونا آرہا تھا۔

اپنے ہی خیالوں اور سوچوں میں مگن بیٹھی، وہ جانے کس جہاں کی سیر کر رہی تھی جب بیرونی گیٹ پر کسی کی مسلسل دستک نے اسے چونکا ڈالا، اپنے تخیل کے جہاں سے باہر نکل کر گرم شال کو اچھی طرح دونوں کندھوں کے گرد پھیلاتی وہ اٹھ کر گیٹ تک آئی اور باہر حرمین کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”آنی! میرے پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے، پلینز جلدی آئیں ناں...“ جیسے ہی اس نے گیٹ کھولا حرمین اس کا ہاتھ تھام کر روتے ہوئے بولی۔ جواب میں اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

”کیا ہوا ہے پاپا کو...“ فوراً اس کے ساتھ گرین پیلیس کی طرف لپکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

”پتا نہیں... میں ان کے کمرے میں گئی تو پاپا بیڈ پر الٹے پڑے تھے ان کی آنکھیں بھی نہیں کھل رہی تھیں اور پیشانی سے خون بھی بہہ رہا تھا۔“ حرمین کی بات نے اسے مزید ڈرا دیا مگر اس کے باوجود وہ اسے تسلی دیتی تقریباً بھاگ کر عظیم کے کمرے کی طرف بڑھی تھی، جہاں وہ حرمین کی اطلاع کے عین مطابق بیڈ پر اوندھا پڑا تھا۔ کیفیت دھڑکتے دل کی رفتار کی پروا کیے بغیر تیزی سے اس پر جھکی تھی۔

”عظیم...“ مگر وہ بے سدھ پڑا رہا۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو اندر کو دھنسی آنکھیں اور بکھرے بالوں نے اس کا حال خاصا افسوس ناک بنا رکھا تھا، وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بے ساختہ رو پڑی۔

”عظیم... عظیم اٹھو ناں پلیز!“ بمشکل اس نے اسے بیڈ پر سیدھا کیا تھا، جواب میں عظیم نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ وہ بڑی مشکل سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نشے کی شدت کے باعث کھول نہیں پارہا تھا۔ کیفیت یہ

بھول گئی کہ اس کے منیگز اور بھابی نے اسے کیا نصیحت کی تھی؟ اسے اس چیز کی پروا بھی نہیں رہی تھی کہ اس کے

سامنے جو شخص ابتر حال میں پڑا تھا وہ اس کا محرم نہیں تھا، اسے صرف اتنی خبر تھی کہ وہ رو رہی تھی اور اس کا دل کسی بھی خدشے سے بے نیاز جیسے ڈوبتا جا رہا تھا۔

”عظیم... عظیم آپ کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے، پلیر آنکھیں کھولیں۔“ اس کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے وہ جھکی تھی اور اسی لمحے عظیم نے عجب سی بے خودی میں اسے جکڑا تھا۔

”منزہ...“ کیفیہ کو لگا اس اچانک افتاد پر اس کا دل دھڑکنا بند ہو جائے گا، قطعی گمان نہ ہونے کے باعث اس کے کھینچنے پر وہ خاصی ان بیلنس ہو کر اس پر گری تھی اور اب اس کا چہرہ جیسے فق ہو رہا تھا۔

”منزہ... میں بھی مر جاؤں گا...“ اپنی گرم بوجھل آواز میں اس کی سماعتوں کے عین قریب چہرہ گھسائے وہ کہہ رہا تھا اور وہ مچل کر رہ گئی تھی۔

”عظیم... ہوش میں آئیں، میں منزہ نہیں ہوں۔“ بڑی دقتوں سے خود کو سنبھالا تھا اس نے، مگر عظیم لغاری نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

”کوئی ایسے بھی کرتا ہے جیسے تم نے کیا، ایسے چھوڑ کر جاتا ہے کوئی...؟“ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اسے مزید خود میں جذب کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ حرمین اس صورت حال پر مزید پریشان ہو گئی تھی۔ کیفیہ کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا، اسے نشے کی اس حالت میں اسے ہر گز چھیڑنا نہیں چاہیے تھا۔

”عظیم چھوڑو مجھے...“ حرمین کو روتے دیکھ کر بھرپور قوت کا استعمال کرتے ہوئے اس نے اس کے بازوؤں کا مضبوط حلقہ توڑا اور ایک بھی پل مزید ضائع کیے بغیر فوراً سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آنی! پاپا کو کیا ہوا ہے؟“ اس کی سانسیں اپنے معمول پر آ بھی نہیں پائی تھیں کہ حرمین آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے پاپا کا اور کچھ نہیں ہوا۔“ اسے خود سے الگ کرتے ہوئے وہ عظیم کے کمرے سے باہر نکل گئی، دل کی تیز دھڑکنیں اب بھی



اس کی سماعتوں میں شور مچا کر رہی تھیں عین اسی پل ”گرین پلیس“ کی ڈور بیل بج اٹھی، کیفیہ کو ٹائم کا اندازہ نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ پھولی سانس کے ساتھ جیسے ہی گیٹ پر آئی اپنے سامنے کھڑے خرم رضا کو دیکھ کر شاکڈ رہ گئی۔

”خرم... آپ...؟“

”مر گیا خرم، سنا تم نے؟ کاش! مجھے پہلے پتا ہوتا کہ تم کس قماش کی لڑکی ہو تو میں کبھی تم سے رشتہ نہ جوڑتا۔ محبت کی پتنگیں کسی سے اور زندگی گزارنے کے خواب کسی اور کے ساتھ، تف ہے تم پر...“ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے دفاع میں خود اعتمادی سے کام نہ لے سکی۔

”یہ جھوٹ ہے خرم! نرا بہتان ہے مجھ پر... مم... میں صرف بچوں کی وجہ سے...“

”بکواس بند کرو، بہت بے وقوف بنالیا تم نے مجھے اب اور نہیں۔ آدھی رات کا وقت اور یہ تمہاری پھولی سانسیں؟ عقل کا اندھا ہوں میں جو کچھ نہیں

سمجھوں گا... بولو...؟“ بے حد غصے سے چنگھاڑتے ہوئے اس نے اس کی ذات کو لمحوں میں دو کوڑی کا کر ڈالا تھا۔ پھر اسی وقت اس کے آنسوؤں کو کسی خاطر میں لائے بغیر وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے تقریباً کھینچتے ہوئے گھر لے آیا تھا۔ جہاں اس کا پیارا بھائی جو اس پر جان دیتا تھا اور بھابی جو کسی طور ماں سے کم نہیں تھی، پریشان سے ٹہلتے ہوئے اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ خرم نے ان کے سامنے پہلے اس کا بازو چھوڑا تھا۔

”کیا بات ہے خرم!“ اسے غصے میں دیکھ کر بھابی نے ہی پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

”اس سے پوچھیے آپا کہ کیا بات ہے؟ جس نے میرے وارن کرنے کے باوجود اس شخص کے گھر جاتے ہوئے یہاں کسی کو بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس کا موبائل ٹرائی کر رہا ہوں مگر یہ گھر میں ہوں تو بات کریں ناں اور مجھ سے بھلا کیوں بات کریں گی یہ، میں لگتا ہی کیا ہوں ان کا، سب کچھ لگتا تو وہ ہے جس کے بچوں کی ماں بننے کا شوق چرایا

ہوا ہے اسے۔“ وہ غصے میں بنا سوچے سمجھے جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔  
جس پر اس کے بھائی کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو خرم! زبان سنبھال کر بات کرو۔“

”میں تو زبان سنبھال ہی لوں گا“ آپ اپنی بہن کو سنبھال کر رکھیے، جو محبت کی پیٹنگیں کہیں اور بڑھا کر شادی کسی اور سے رچانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔“ اس کے لہجے میں سفائی تھی اور پھر اس کے بعد وہ چند لمحوں کے لیے بھی وہاں ٹھہرا نہیں تھا، وہ رشتہ جو ان دونوں کے مابین قائم تھا وہ رشتہ بھی جاتے ہوئے ختم کر دیا تھا اس نے اور اب وہاں گہرا سکوت چھایا تھا۔ بھائی اور بھابی اسے ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکے تھے مگر اس کے باوجود اسے عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔

سارہ کو اگلی صبح ساری بات کا پتا چلا تو وہ بھی پریشان ہو کر رہ گئی مگر ساتھ میں اسے اس شخص پر بھی جی بھر کر غصہ آیا جو اپنی مرحومہ بیوی کے عشق میں پاگل ہونے کے باوجود، نشے میں ہی سہی مگر اس کی دوست کے وقار کو

مجرع کرچکا تھا۔ کیفیہ کو مطلع کیے بغیر وہ خاصے تپے انداز میں گرین پیلس آئی تھی اور زینب بی کے سامنے جو منہ میں آیا اس شخص سے کہتی گئی تھی جو خود ہوش میں آنے کے بعد بہت پریشان تھا۔ پہلی بار اسے اپنے نشے کی کثرت پر شرمندگی ہو رہی تھی، پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ ایک مردہ وجود کی محبت میں تباہ ہوتے ہوئے وہ بہت سے زندہ لوگوں کے ساتھ بہت غلط کر رہا ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ سنبھل گیا تھا۔

پہلی فرصت میں اس نے اپنے کمرے کی ترتیب بدلی تھی پھر پہلی بار خود کیفیہ کے گھر آکر اس کے بھائی اور بھابی سے ایکسیکوز کیا تھا کہ اس کی بے پروائیوں کی وجہ سے کیفیہ کا اتنا اچھا رشتہ ختم ہوا۔ زینب بی کی دیکھ بھال بھی اب پوری توجہ سے کر رہا تھا۔ بھائی اور بھابی دونوں کو ہی اس کی شخصیت بہت اچھی لگی تھی، یہی وجہ تھی کہ بھائی نے اسے اپنے کاروبار میں ہی شریک کر لیا تھا۔ اب اپنے گھر کے لان میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظریں بار بار سامنے والے گھر کے ٹیرس کی طرف اٹھتی تھیں مگر کیفیہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے بس ایک نظر دیکھ کر پلٹ جاتی۔

اس روز جب سارہ اسے عظیم کے حوالے سے بہت تنگ کر رہی تھی جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے سالار کو کال کھڑکا دی، وہ کسی مینٹنگ میں مصروف تھا، صرف اس کا نمبر دیکھ کر کال پک کر گیا۔

”ہیلو السلام علیکم! کیسے ہیں سالار بھائی۔“

”الحمد للہ! بخیر و عافیت ہوں، آپ سنائیں۔“

”میں بھی بخیر و عافیت ہوں، الحمد للہ! لیکن سارہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا اسے...؟“

”پتا نہیں شاید ٹھنڈ لگ گئی ہے، کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہی، بس اداس رہتی ہے، ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاتی میں تو سمجھا سمجھا کے تھک گئی ہوں، تنگ آکر آپ کو فون کیا ہے، آپ ہی کچھ سمجھا دیں۔“

”اوکے! آج تو بہت بڑی ہوں کل چکر لگانے کی کوشش کروں گا۔“ اس

کے چکر میں آئے بغیر اس نے کال ڈسکنکٹ کر دی تو وہ اپنے موبائل کو گھور کر رہ گئی۔ اسی پل سارہ اس کے سر پر چنگھاڑی۔

”کھوتی لڑکی! کیا بکواس کر رہی ہو تم اس فضول انسان سے؟“

”کر نہیں رہی یار! کر رہی تھی اور فضول تو وہ واقعی بہت ہے، مجال ہے جو کبھی چکر میں آجائے۔“

”پاگل ہو تم اور کچھ نہیں، میں بھی کرتی ہوں جا کر وہ عظیم صاحب سے بات...“

”جان لے لوں گی تمہاری اگر اس کا نام بھی لیا تو؟“

”کیوں... اب تو خاصا سدھر چکا ہے بے چارہ! بھابی بہت تعریفیں کر رہی تھیں اس کی اور پھر تم نے جو قسم کھالی ہے شادی نہ کرنے کی، اس کا بھی تو کوئی حل نکالنا ہے کہ نہیں۔“

”اپنی فکر کرو تم میری نہیں اچھا۔“

”نہیں یار! اکلوتی دوست ہو میری، فکر تو کرنی پڑے گی۔ سنا ہے صاحب موصوف خاصے لائن پر آگئے ہیں اور چھپ چھپ کر یہ چاند چہرہ تلاشنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔“

”کوئی نہیں! بڑی خوش فہمی ہے تمہاری“ وہ صرف اپنی مرحومہ بیوی سے پیار کرتا ہے اور بس...”

”زندہ بیوی سے بھی کرنے لگے گا“ تم موقع تو دو۔“ وہ کہاں باز آنے والی تھی، کیفیہ نے چڑ کر اس کی کمر پر کئی مکے ایک ساتھ برسا دیئے۔

☆...☆...☆

عظیم لغاری نے کیفیہ آفندی کو پرپوز کیا اور یہ بات اس کے لیے کسی شاک سے ہر گز کم نہیں تھی۔ وہ شخص جو اپنی مرحومہ بیوی کے لیے پاگل تھا، جسے اس کی استعمال شدہ کسی چیز پر دوسرے کا سایہ پڑنا بھی گوارا نہیں تھا اسی شخص نے اسے پرپوز کیا تھا، وہ یقین نہیں کر پار ہی تھی۔

بھابی نے اس سے اس کی رائے پوچھی تھی لیکن وہ خود اور ان کے شوہر دونوں اس پرپوزل سے بہت خوش تھے لہذا شرماتے، ہچکچاتے ہوئے اس نے بھی ہاں میں جواب دے دیا جس کے بعد چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا حساب ہوا اور وہ عظیم حیدر لغاری کے نام سے منسوب ہو کر اس کے ”گرین پیلس“ میں آگئی۔

کیفیہ نے اپنی شادی میں سالار کو خصوصی طور پر انوائٹ کیا تھا مگر وہ اپنی بے تحاشا مصروفیات کے پیش نظر صرف ولیمے والے دن ہی تھوڑی دیر کے لیے آسکا تھا اور اس وقت بھی اس نے سارہ کو کوئی خاص رسپانس نہیں دیا تھا جس پر وہ جی بھر کر دکھی ہوئی تھی۔

کیفیہ کی رخصتی کے فوری بعد شدید جذباتیت کا شکار ہو کر اس نے بھی فوری حویلی واپسی کی تیاری باندھ لی تھی۔ جس پر بھابی نے خاصا احتجاج کیا تھا مگر اس نے شائستگی سے معذرت کر لی۔ اپنی جان سے پیاری دوست کو خوشیوں کی ہزاروں دعائیں دیتی وہ اپنے گھر واپس لوٹی تو درودیوار سے ٹپکتی عجیب سی وحشت نے اسے پھر رلا دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ارد گرد کے گھروں سے خواتین افسوس کے لیے اس کے پاس آنا شروع ہو گئیں۔ ان خواتین سے جیسے جیسے وہ اپنے بھائیوں کی درندگی کا احوال سنتی جا رہی تھی اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، اپنی محبوب ماں اور بھابی کی موت پر وہ جیسے اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔



اسے ذرا سا گمان بھی ہوتا کہ اس کے حصے کی جائیداد کے لیے اس کے بھائی اتنے ظالم بن جائیں گے تو وہ خود خوشی خوشی اپنا حصہ انہیں سوئپ دیتی۔ اسلم لوہار اور اس کا بیٹا سالار کی کوششوں سے بے گناہ ثابت ہو کر جیل سے باہر آچکے تھے مگر اس کی بیوی اب بھی جھولی پھیلا پھیلا کر اس کے بھائیوں کو بددعائیں دیتی نظر آتی تھی۔

سالار کو اس کی حویلی آمد کا پتا چلا تو فوراً دوڑا آیا۔

”یہاں کیوں آئی ہو؟“ آتے ہی پہلا سوال اس نے یہی پوچھا تھا۔ سارہ نے اس کی آمد پر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”میرا گھر ہے یہ، کوئی روک سکتا ہے مجھے یہاں آنے سے؟“

”روک تو سکتا ہوں مگر روکوں گا نہیں کیونکہ پھوپھو سے وعدہ کرچکا ہوں ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کا۔۔۔“

”مگر مجھے اب خوشیاں نہیں چاہئیں، جب مجھے خوش دیکھ کر خوش ہونے والے ہی نہیں رہے تو یہ خوشیاں کس کام کیں۔“ اس کی پلکیں پھر بھر گئی تھیں۔

سالار جواب میں اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”نہیں سارہ! ایسے نہیں کہتے، اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے اور گناہ گاروں کو ان کے بد اعمالیوں کی سزا دیتا ہے، میں اگر پھوپھو کا حکم نہ مانتا تو وہ لوگ تمہیں جان سے مار دیتے۔“

”تو کیا ہوا مجھے مار دیتے جان سے، میری ماں اور بھابی تو بچ جاتیں۔“

”بھول ہے تمہاری، جن لوگوں کے ضمیر مرجاتے ہیں سارہ! وہ کسی رشتے کو بھی

ڈسنے سے باز نہیں آتے اور ہوتا تو وہی ہے جو کاتب تقدیر نے ہماری قسمتوں میں لکھ دیا ہے، ہو سکتا ہے قدرت تم سے اپنے بہت سے سیدھے

سادے بندوں کی بھلائی کا کام لینا چاہتی ہو۔“

”ہاں۔۔۔“

”تو پھر رونے دھونے میں خود کو ضائع کرنے کے بجائے کوئی بھلائی کا کام

کرنے کا سوچو، باقی جہاں تک میری ذات کا سوال ہے تو اگر تم چاہو گی تو

میں یہ رشتہ جو زبردستی قائم ہوا تھا برقرار رکھوں گا، اگر تم نہیں چاہو گی

تو۔۔۔“

”تو...؟“ اس کے بات ادھورے چھوڑنے پر اس کا دل جیسے زور سے دھڑکا تھا۔

”تو... تو کیا...؟ سیدھی سی بات ہے اگر تم نہیں چاہو گی تو بھی میں تمہاری جان چھوڑنے والا نہیں۔“ ہلکی سی سانس بھر کر وہ مسکرایا تھا جواب میں سارہ ناچاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے رو پڑی۔

”بس جانو! اب رحم کرو مجھ پر اور کتنا ضبط سے کام لوں، اب تو میری بھی بس ہو چکی ہے۔“ اسے نرمی سے تھام کر گلے لگاتے ہوئے وہ بولا تو وہ اس سے لپٹ کر مزید دل کا غبار ہلکا کرنے لگی۔ یہ طے تھا کہ وہ شخص مجتوں کا گھنا سایہ دار درخت تھا، جو اسے اپنے رب کی کرم نوازی کے بعد اپنی ماں کی دعاؤں سے ملا تھا اور اب اس خوب صورت ہم سفر کا ساتھ پا کر اسے اپنے گاؤں کے سیدھے سادے غریب لوگوں کے لیے نہ صرف بنیادی تعلیم کے حصول کا بندوبست کرنا تھا بلکہ اپنی زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اسی گاؤں کی مختلف ضروریات پوری کر کے ان زیادتیوں کا کفارہ ادا کرنا تھا جو

اس کے راہ بھٹکے ہوئے بھائیوں سے جانے انجانے میں سرزد ہوتی رہی تھیں کہ اب ان کے انجام سے بہت اچھی طرح باخبر ہو چکی تھی۔

☆...☆...☆

عظیم اپنی ماں سے ہزاروں دعائیں لے کر انہیں خوش و خرم سلانے کے بعد جونہی اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہاں اپنے بیڈ پر کیفیہ کو دلہن کے روپ میں سعد اور حنین کے ساتھ مگن دیکھ کر رک گیا۔ وہ کتنا حسین اور مکمل نظارہ تھا۔ حنین کی نگاہ اچانک اس پر پڑی تھی اور وہ خوش خوش سی فوراً اس کے قریب دوڑی آئی تھی۔

”پاپا! آپ کو پتا ہے آنی میری ماما بن گئی ہیں، میں انہیں ماما کہہ سکتی ہوں۔“

”ہوں...“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”او پاپا! آج میں بہت خوش ہوں، سعد اور دادی ماں بھی بہت خوش ہیں، آپ دیکھیے گا اب ماما یوں ٹھیک کر دیں گی دادی ماں کو۔“ چٹکی بجاتے ہوئے حنین نے کہا تو وہ مزید مسکرا دیا۔

”جی بیٹے! جادو آتا ہے آپ کی ماما کو“ اسی لیے وہ ہر چیز یوں ٹھیک کر دیتی ہیں۔ “کیفیت باپ بیٹی کی گفتگو کو انجوائے کرتے ہوئے خود بھی مسکرا رہی تھی تبھی وہ اس کے قریب آیا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ اس کے قریب آنے پر دل کی دھڑکنیں پھر منتشر ہو گئی تھیں، جب وہ بولا۔

”بچوں کو ساتھ لے کر سونے کا ارادہ ہے کیا...؟“

”جی ہاں...!“

”کیوں؟“

”کیوں سے کیا مطلب“ میرے بچے ہیں۔“

”اچھا! لیکن ان بچوں کا ایک باپ بھی ہے جسے ابھی تم سے بہت ساری باتیں شیئر کرنی ہیں“ وہ کیا کرے؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ کیفیت نے آنکھیں جھکا لیں۔

”وہ ابھی ویٹ کرے میرے بچوں کے سونے کا۔“

”ہاہا... قطعاً مدہوشی میں سرزد ہونے والی حرکت کی اتنی بڑی سزا؟“ وہ اسے کچھ یاد دلارہا تھا۔ کیفیت کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

”جی ہاں...!“

”نہیں یار! میں نے سنا ہے تم بڑی رحم دل لڑکی ہو اور تمہاری اسی ادا نے مجھے زندگی کی طرف واپس پلٹنے میں مدد دی، ورنہ منزہ کے بعد کسی اور کے سنگ جینے کا تصور بھی نہیں تھا میرے پاس مگر تمہاری قربانیوں نے مجھے احساس دلایا کہ زندگی محض اپنے لیے جینے کا نام نہیں ہے، اس کا مقصد ہی خود کو دوسروں کے لیے وقف کر دینا ہے، اسی سوچ کے تحت دیکھو کیا سے کیا ہو کر رہ گیا میں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی نمی تھی۔ کیفیت سر اٹھا کر بغور اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ ”تم بہت اچھی ہو کیفیت! ہو سکتا ہے منزہ کی یاد مجھے پوری طرح سے تمہیں خوش رکھنے کا موقع نہ دے مگر میں کوشش کروں گا کہ کبھی تمہاری آنکھ میں آنسو نہ آنے دوں، بے خبری میں دانستہ یا نا

دانتہ اگر کوئی بھول ہو بھی جائے تو پلیز مجھے معاف کر کے درگزر کرنے سے  
کام لیتی رہنا، پلیز...”

”او کے ...“

”تھینکس ڈیر! تم واقعی دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو۔“ از حد ممنون ہو کر وہ اب اس کا ہاتھ تھام رہا تھا جب سعد اچانک بولا۔

”نتیں... میری ماماے!“ اس نے کیفیہ کا ہاتھ عظیم کے ہاتھ سے فوراً کھینچ لیا  
تھا جس پر عظیم کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہنس پڑی۔

”لگتا ہے یہ دو ہی رہیں گے۔“

اب وہ سرگوشی میں مسکراتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا جس پر ایک بار پھر ہنستے ہوئے کیفیہ نے سعد کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ سامنے منزہ کی تصویر لگی تھی مگر کیفیہ کو اب اس میں اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آنے والے وقت کے حسین لمحوں کو تصور میں لاتی سعد اور حریین کو اپنے ساتھ لگاتے عظیم

نغاری کے مضبوط کندھے پر سر ٹکا گئی کہ کبھی کبھی قدرت آپ پر یوں مہربان بھی ہو جاتی ہے۔

## بات زندگی کی ہے

ہوا تھی تھی ضرور، لیکن وہ شام جیسے سسک رہی تھی

کہ زرد پتوں کی آندھیوں نے عجب قصہ سنا دیا تھا

وہ جس کو سن کر تمام پتے سسک رہے تھے۔۔۔۔۔ بلکہ رہے تھے

جانے کس سانحے کے غم میں، شجر جڑوں سے اکھڑ چکے تھے

بہت تلاش کرتا تھا ہم نے تم کو

هر ایک رستہ، ہر ایک وادی

ہر ایک پر بت، ہر ایک گھاٹی

کہیں سے تیری خبر نہ آئی تو یہ کہ ہم نے بھی دل کو ٹالا۔

ہوا تھمے گی تو دیکھ لیں گے، ہم اس کو راستوں میں ڈھونڈ لیں گے

مگر ہماری یہ خوش خیالی جو ہم کو برباد کر گئی تھی

ہوا تھی ضرور تھی، لیکن بڑی ہی مدت گزر چکی تھی

ہمارے بالوں کے جگنوؤں میں، سفید چاندی اُتر چکی تھی۔

فلک پہ تارے نہیں رہے تھے



گلاب پیارے نہیں رہے تھے

وہ جس کے دم سے تھی دل کی بستی، وہ لوگ سارے نہیں رہے تھے

یہ المیہ سب سے بالاتر تھا کہ ہم، تمہارے نہیں رہے تھے

کہ تم، ہمارے نہیں رہے تھے

ہوا تھمی تھی ضرور لیکن۔۔۔۔۔ بڑی ہی مدت گزر چکی تھی

تھکن سے بے حال جس وقت اس نے قدم گھر کی دہلیز پر رکھے، تایا کی پاٹ

دار آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”تُو کنویں کا مینڈک ہے غلام محمد!۔۔۔۔۔ کنویں کا مینڈک۔ اسی کنویں میں

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا ایک دن۔ کوئی واہ واہ کرنے نہیں آئے گا تجھ

پر، تیری غلامی پر۔ اپنی عمر تو پوری کر چکا بے وقوف! اولاد کا سوچ اب۔ ساری

عمر پڑی ہے اُن کے سامنے۔ کیا کیا ہے تُو نے ان کے لئے؟۔۔۔۔۔ تین

جوان بیٹیاں ہیں تیری۔ کون اس مفلسی میں رشتے لے گا ان کے؟ اپنے بیٹوں

کا سوچ، باپ کے ہوتے ہوئے کیسی ذلت بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا

قصور ہے ان کا کہ انہیں اچھی، پُر آسائش زندگی نہ ملے۔ بول!“

بنا آہٹ کئے وہ دو قدم آگے آئی تھی۔

نگاہ سے کچھ ہی فاصلے پر صحن کے وسط میں اس کا باپ سر جھکائے بیٹھا تھا

اور اس کے آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

”اولاد، مرد مومن کی سب سے بڑی آزمائش ہے بھائی!۔۔۔۔۔ چاہے تو جنتی بنا

دے، چاہے تو جہنمی۔ میں نے حق حلال کے رزق سے پالا ہے اپنے بچوں کو۔

کبھی بھوکا نہیں سونے دیا۔ پھر کیسی ذلت؟ غلام محمد کے بچے ہیں یہ۔ محمد صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ غلام کے۔ مجھے یقین ہے، یہ کبھی دنیا و آخرت میں

میری رسوائی کا سبب نہیں بنیں گے۔

آپ چاہتے ہیں، میں ان کی چند روزہ بہتر زندگی کے لئے آخرت کی رسوائی

مول لے لوں؟ وہ وقت کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کے جلال کے سامنے

سوائے میرے آقا علیہ السلام کے کسی نبی کا سر نہیں اٹھ سکے گا، اس وقت

نبیوں کے سردار، رحمتہ العالمین، خدا کے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

سفارش سے دستبردار ہو جاؤں؟ چند فانی چیزوں کے لئے ان کی آن و شان

کا سودا کر لوں؟ یہ سب کر لوں تو محشر کے روز کس منہ سے ان کی شفاعت طلب کروں گا؟ کس منہ سے سفارش کی بھیک مانگوں گا ان سے؟ شرم نہیں آئے گی مجھے ان کے سامنے سوا لی بن کر کھڑا ہوتے ہوئے؟“

اسے تایا کی چنگھاڑ کے جواب میں اپنے باپ کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔ تبھی تایا پھر گر جاتا تھا۔

”اوتے چپ کر۔ آخرت کا حال کس نے دیکھا ہے؟ اس وقت جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ اللہ بخشے والا ہے۔ ہم شوق سے تھوڑی کر رہے ہیں یہ سب؟ مجبوری ہے۔ بیس سال ہو گئے حق حلال کی کھاتے ہوئے۔ کیا ملا؟ تو چھوڑ، یہ سب بھرے پیٹ والوں کی باتیں ہیں۔ پیٹ میں آگ لگی ہو تو کیا مذہب، کہاں کا حسب نسب؟۔۔۔۔۔ تو دیکھ تو رہا ہے، کیا کیا نہیں ہو رہا اس ملک میں دولت کے لئے۔ جہاں یہ سب جائیں گے، وہاں ہم بھی چلے جائیں گے۔“

”آپ جا سکتے ہیں بھائی! میں اتنی سہار نہیں رکھتا۔“

”نہیں رکھتے تو جاؤ بھاڑ میں۔ میری بلا سے۔“ غلام محمد کے مختصر جواب پر تایا کو پھر اشتعال آیا تھا۔ ”ساری عمر لوگوں کے بچوں کو نفع و نقصان کے سبق

پڑھائے ہیں، کبھی اپنے ان بچوں کی طرف بھی دیکھ، وہ کیا چاہتے ہیں، ان کی کیا خواہشات ہیں؟ کہیں کا نہیں چھوڑتی یہ غربت انسان کو۔ ہر گناہ اسی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ چار پیسے ہاتھ آجائیں تو ہماری بھی تقدیر بدل جائے۔ وگرنہ کون ایسا شخص ہے یہاں جو اپنا ایمان ہاتھ پر لئے نہ پھرتا ہو۔ موت کے بستر پر پڑا ہے تو۔ جا، جا کر کہہ دے کسی ڈاکٹر سے کہ تیرا مفت علاج کر دے۔ کیونکہ تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عاشق ہے۔ سچا پکا مسلمان ہے۔ کون سنے گا تیری؟ صرف اس حوالے سے سر آنکھوں پر بٹھائے گا تجھے؟۔۔۔۔۔ نہیں۔ جوتیاں ماریں گے تجھے اور دھتکار کر پیسوں کے بغیر نکال باہر کریں گے۔ کوئی نہیں پوچھتا اس دنیا میں پیسوں کے بغیر۔ سب کی دولت کو سلام ہے۔ تجھے اتنا ہی غرور ہے اپنے ایمان پر تو جا کسی ہسپتال میں اور ایمان کا حوالہ دے کر ہو جا بھلا چنگا۔ ہوتا کیوں نہیں؟“

تایا کے اشتعال پر غلام محمد کی آنکھیں مزید شدت سے آنسو لٹانے لگی تھیں جبکہ اُجالا کا دل اس لمحے جیسے کسی نے پاؤں تلے لے کر مسل ڈالا تھا۔

”کسی ڈاکٹر کی کیا مجال ہے بھائی! کہ وہ مجھ سے نمانے کو بھلا چنگا کر دے۔ شفا دینے والی ذات تو میرے سوہنے رب کی ہے۔ وہی بھلا چنگا کرے گا مجھے۔ اسی کے سامنے میرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوالہ سرٹیفکیٹ کی صورت کام آئے گا۔ وہی ہے بھائی! جو دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی۔ مردہ بکری کے بچے سے زیادہ حقیر اس دنیا کے لوگ میرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان و حرمت کو کیا جانیں؟ وہ جن کے ایک اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔ انہیں اپنے ایک ادنیٰ غلام کو بھلا چنگا کرنا مشکل ہے؟ یہ تو صرف آزمائش ہے بھائی! وگرنہ ان کے در پر تو بڑے بڑے بادشاہوں نے اپنی بادشاہی لٹا دی۔ میری تو اوقات ہی کیا ہے۔“

آنسوؤں میں ڈوبا غلام محمد کا ایک ایک لفظ بتایا کو بے چین کر رہا تھا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ غلام محمد کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں چپ کروا دیں۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں بھائی؟ یہ لوگ جو آپ سے آپ کے ایمان کا سودا کر رہے ہیں، انہیں آپ سے ہمدردی ہے؟ نہیں۔ یہ صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہیں۔ ان کا مقصد صرف ہمیں راہِ راست سے

بھٹکانا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دُور کرنا ہے۔ اسی لئے یہ کبھی بم برسا کر اپنے اندر کی آگ ٹھنڈی کرتے ہیں تو کبھی ہماری غربت کو ڈال بنا کر یہ ہم سے ہمارا ایمان خریدنے چلے آتے ہیں۔ یہی تو شان ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے وابستگی کی کہ محض ان سے جڑے ہونے کے باعث یہ ہمیں خریدتے ہیں، ہمارے ایمان کا مول لگاتے ہیں۔ وگرنہ دنیا بھری پڑی ہے رنگ رنگ کے مذہب والے، بے آسرا لوگوں سے۔ ان کے پاس کیوں نہیں جاتے یہ؟ انہیں کیوں ایمان کے بدلتے دولت میں نہیں تولتے؟“

”تیرا دماغ چل گیا ہے غلام محمد! سیدھی بات سمجھ میں نہیں آتی تجھے۔ اپنے حال کی طرف دیکھ ایک نظر۔ کوڑھ زدہ ہے تو۔ لوگوں کو تیری طرف دیکھتے ہوئے بھی گھن آتی

ہے۔۔۔۔۔“

”لوگوں کو گھن آتی ہے بھائی! میرے مالک کو نہیں آتی۔ وہ ابھی بھی مجھے روزی دے رہا ہے۔ اس نے نہیں کہا مجھ سے کہ جا غلام محمد! تجھے کوڑھ لگ گیا ہے۔ اب تو میری عبادت کے قابل نہیں رہا۔ جا آج سے تیرا رزق بند ہے۔“ تایا کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے غلام محمد نے پھر زبان کھولی تھی۔

اُجالا اُکھی اُکھی ویں بیٹھی رہی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر یہی تیری مرضی و منشاء ہے تو خوش رہ۔ میرا فرض تجھے سمجھانا تھا۔ مگر تو خود ہی اپنا دشمن بنا ہوا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو آج سے ہی یہ بوسیدہ گھر، یہ گندا محلہ، یہ لوگ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تجھے عقل آجائے تو بتا دینا۔ آجاؤں گا تجھے لینے۔ نہیں تو پڑا سڑتا رہ یہاں۔ جب تجھے اپنا خیال نہیں تو میں کیوں کروں؟“ تایا خفا ہو گیا تھا۔ اُجالا کی بات بن گئی تھی۔

وہ اس کا صرف تایا نہیں تھا، سر بھی تھا۔ اسجد کا باپ بھی تھا۔ اس ”اسجد“ کا باپ کہ جس کی محبت خون بن کر اُجالا کی رگوں میں سرایت کر رہی تھی۔

وہ ان کے رخصت ہوتے ہی لپک کر اپنے باپ کی طرف آئی تھی۔

”تایا کیوں آیا تھا ابا؟۔۔۔۔۔ اتنا غصہ کیوں کر رہا تھا؟“

غلام محمد نے بیٹی کے سوال پر سر اٹھانے سے پہلے آنکھیں خشک کی تھیں۔

”تیرے ابا کے ایمان کا سودا کرنے آیا تھا بیٹی! دنیا اور آخرت میں سے ایک چیز چن لینے کا سوال لے کر آیا تھا۔ میں نے آخرت چن لی۔“

”میں سمجھی نہیں ابا!“ وہ پریشان ہوئی تھی تو وہ بولے۔

”ہر کوئی کہاں سمجھ پاتا ہے میری دھی! ہر کسی کو کہاں سمجھ میں آتی ہیں یہ باتیں؟ اسی لئے تو نفسیاتی خواہشات غلبہ پالیتی ہیں اور انسان بھٹک کر اس راستے پر چل پڑتا ہے، جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔“

ان کی پلکیں اب بھی نم تھیں۔ اُجالا حیران حیران سی اُنہیں دیکھے گئی۔

”تیرا تایا کہتا ہے، میں اپنے دین سے پھر جاؤں۔ نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت سے منکر ہو جاؤں۔ تم لوگوں کی چند روزہ عیش و عشرت کے لئے اپنے ایمان کا سودا کر لوں۔ وہ دین کہ جس میں سکون و نجات ہے، اس میں ترمیم کر لوں۔ تو بتا اُجالا! کیا میں نے ساری زندگی تم



لوگوں کو پیٹ بھر کر کھلانے کے لئے کڑی محنت نہیں کی؟ کیا میرے رب نے تم لوگوں کو فاقے کی تکلیف دکھائی؟ کسی کڑے امتحان کی بھینٹ چڑھایا؟ اپنی ہزار نعمتوں کے ساتھ کبھی کوئی معمولی سی آفت میں بھی بے یار و مددگار چھوڑا؟ نہیں نا۔ پھر بھی۔۔۔۔۔ پھر بھی، تیرا تایا کہتا ہے کہ میں اپنے دین و ایمان سے پھر جاؤں۔ کیا میں کر سکتا ہوں ایسا؟ نہیں۔۔۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میرے رب کا احسان ہے مجھ پر کہ اس نے مجھے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت سے پیدا فرمایا۔ اس کا حق ہے مجھ پر کہ وہ مجھے جیسے چاہے، جس حال میں رکھ کر آزمائے۔ میری اوقات نہیں ہے کہ میں اس رحیم و رحمن کو آزماؤں، اس سے اپنی مشکلات کا گلہ کروں یا ان مصائب سے ہار مان کر اس کے نافرمان بندوں کی لسٹ میں شامل ہو جاؤں۔ کیا گارنٹی ہے ان لوگوں کے پاس کہ یہ ہمیشہ یونہی جیتے رہیں گے، انہیں کبھی موت نہیں آئے گی؟“ دبا دبا سا جوش لئے غلام محمد کی آواز کانپ رہی تھی۔ اُجالا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے ابا؟ تایا اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتا ہے؟“

”وہ کہہ گیا ہے بیٹی! اُس نے دنیا و آخرت میں سے دنیا چن لی ہے۔“ ابا کے الفاظ پر اُجالا کو لگا جیسے اُس کا دماغ سُن ہو گیا ہو۔ اگر تایا اپنے دین سے پھر رہا تھا تو اسجد؟۔۔۔۔۔ اور یہاں آ کر اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔

”میں اسجد سے بات کروں گی ابا! وہ تایا کو سمجھا دے گا۔ تو پریشان نہ ہو۔“ باپ سے زیادہ خود کو تسلی دے کر وہ وہاں سے اُٹھ آئی تھی۔ مگر سکون و قرار جیسے اس کا بھی رخصت ہو چکا تھا۔ غلام محمد نے اس کی تسلی پر چپ چاپ آنکھیں موند لی تھیں۔ یوں جیسے وہ کہیں محو ہو گئے ہوں۔

ان کے دماغ میں اس وقت ایک ہی شعر بار بار گونج رہا تھا۔

گنہگاروں کو جب جنت کے دروازے پہ روکیں گے

آواز آئے گی، جانے دو یہ اُمت ہے محمد ﷺ کی

اور آنسو تھے کہ بناؤ کے بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔

☆...☆...☆

بارش مزید تیز ہو رہی تھی۔

بھاگتے بھاگتے، پھولی سانسوں کے ساتھ اچانک اسے زور کی ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔

”اللہ!“ تکلیف کی شدت سے اس کی سسکاری نکل گئی تھی۔ جبکہ آنکھوں میں جیسے ریت گھس آئی۔ اس کا دوپٹہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ تیز ہوتی بارش کی ہر بوند کے ساتھ اس کے حوصلے جیسے دم توڑ رہے تھے۔ مگر پھر بھی وہ اُٹھی تھی اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے پھر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ آبادی اب زیادہ دُور نہیں رہ گئی تھی۔ پیروں میں پڑے آبلوں کی تکلیف کا احساس اسے اب ہونا شروع ہوا تھا۔

بارش کے پانی میں پڑتے قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی۔ اس نے اپنی رفتار مزید تیز کر لی۔

”مصحف!۔۔۔۔۔ بس کر یار!۔۔۔۔۔ اور کتنی پیئے گا تُو؟“

وہ سب مصحف علی میر کے گھر پر جمع ”موج مستی“ کر رہے تھے۔ جب اسے وہسکی کا چھٹا پیگ تیار کرتے دیکھ کر شہریار نے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ مصحف کی آنکھیں خوب سرخ ہو رہی تھیں۔

”آج نانو گھر نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو ساری حدود و قیود ہی پھلانگ جائے۔ تھوڑا بہت ہوش قائم رکھ۔ آفٹر آل اس وقت ہمارے جانے کے بعد تجھے سارا کام بھی سنبھالنا ہے۔“ وہ اسے ڈانٹ رہا تھا۔

مصحف بے نیازی سے مسکرا دیا۔

”کام سنبھالتی ہے میری جوتی۔ تم سارے بندر کس مرض کی دوا ہو؟ جو گند بکھرا ہے، اسے سمیٹ کر بھی جاؤ۔“

”تم بھول رہے ہو شہزادے! کہ یہ دعوت خالصتاً تمہاری طرف سے تھی۔“

”سو واٹ۔۔۔۔۔ چلو سمیٹو شاباش! نانو کو ذرا بھی پتہ چل گیا تو نکال باہر کریں گی گھر سے۔“

ہاتھ چھٹے پیگ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عین اسی لمحے گیٹ پر زوردار دستک ہوئی۔

”مارے گئے۔ لگتا ہے نانو واپس آ گئیں۔“

صرف ایک لمحے میں اس کا حال دیکھنے والا تھا۔ باقی سب جیسے اپنی جگہ فریز ہو گئے۔

”اب کیا ہو گا یار؟“ شاہ میر نے لپک کر ٹی وی آف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ جبکہ حمزہ نے میز پر پڑے لوازمات جلدی جلدی سمیٹنے شروع کر دیئے تھے۔ دستک زور و شور سے جاری تھی۔

”لگتا ہے، کسی نے مجبری کر دی ہے ہماری۔ وگرنہ نانو اتنی جلدی نہیں لوٹ سکتیں۔“ وہ بھی متفکر تھا۔

”خیر، میں دیکھتا ہوں۔ تم لوگ ذرا ادھر ادھر ہو جاؤ، شاباش!“ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ سے لباس کی شکنیں درست کیں، پھر جل تو جلال تو کا ورد کرتا گیٹ کی طرف بڑھ آیا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ چوکیدار آج چھٹی پر تھا وگرنہ جانے کیا ہوتا۔

گیٹ تک آتے آتے کوئی دسویں بار پھر دستک ہوئی تھی۔ مصحف نے مزید تاخیر کئے بنا جلدی سے گیٹ وا کر دیا۔ نانو کے ڈر سے اُسے باہر موجود ہستی کی تصدیق کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اور ادھر بارش تھی کہ پل میں اسے اچھا خاصا بھگو گئی تھی۔

گیٹ کھلتے ہی کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا تھا اور پھر جس تیزی سے وہ اندر داخل ہوا تھا، اسی تیزی سے اس نے گیٹ کو لاک بھی کیا تھا۔

”کون ہو تم؟“ جونہی وہ پلٹی، مصحف کی آنکھوں میں حیرانی اُتر آئی۔ جبکہ وہ بے ترتیب سانس درست کرتی وہیں گیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔۔۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے آپ کو، اُنہیں اندر آنے مت دینا۔“

وہ نہ صرف رو رہی تھی بلکہ کانپ بھی رہی تھی۔ مصحف الجھ کر رہ گیا۔

”کون مار ڈالیں گے تمہیں؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ میرے پیچھے آرہے ہیں۔ انہوں نے۔۔۔۔۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔“ وہ اب بھی رو رہی تھی۔

مصحف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے گیٹ کھولنے پر کسی ایسی صورتِ حال کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

لڑکی کے خدشے کے عین مطابق گیٹ پر اب ایک بار پھر دستک ہو رہی تھی۔ مصحف نے دیکھا، لڑکی کا چہرہ خوف سے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔

اسی لمحے شہریار، حمزہ اور شاہ میر اُس کے پیچھے آئے تھے۔

”مصحف!۔۔۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ تم ذرا گیٹ کھولو اور باہر جو بھی ہو، اُسے یہاں سے دفعتاً کرنے کی کوشش کرو۔ میں ذرا اس لڑکی سے نمٹ لوں۔“

فی الحال کچھ بھی بتانے سے گریز کرتے ہوئے اس نے لڑکی کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور اندر ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی شکستہ قدموں سے اس کے پیچھے آئی تھی، جبکہ وہ تینوں ہونقوں کی طرح منہ اٹھاتے یہ سب دیکھتے رہے۔

دستک ایک مرتبہ پھر دی جا رہی تھی۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔

”جی فرمائیے۔“ باہر کھڑے دو صحت مند، چست و چالاک لڑکوں کو دیکھتے ہوئے اس نے تیوری چڑھائی تھی، جب ایک لڑکا آگے بڑھا۔

”ابھی جو لڑکی اس گھر میں داخل ہوئی تھی، اسے باہر نکالو۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، یہاں کوئی نہیں آیا۔“

”ہم نے خود دیکھا ہے اُسے۔ زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ دوسرا لڑکا پیچھے سے چلایا تھا۔

شہریار کو غصہ آ گیا۔

”تم سائیڈ پر آؤ شاہ میر! میں نمٹتا ہوں ان سے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ فضول میں کسی کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ نرمی سے کہتے ہوئے اس نے گیٹ بند کرنے کی کوشش کی تھی، جب آگے کھڑے لڑکے نے گیٹ کو زوردار ٹھوکر ماری اور شاہ میر لڑکھڑا گیا۔



”تم ہمارا شکار ہڑپ نہیں کر سکتے، سمجھے؟“ وہ دونوں وارنگ دیتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ پیچھے کھڑے لڑکے کے ہاتھ میں پستل تھی۔ مصحف لڑکی سے پوچھ گچھ کا ارادہ ترک کرتا خود بھی تیزی سے باہر دوڑ آیا۔

”کیا بد تمیزی ہے؟“ اسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ سارا نشہ اس لمحے جیسے ہوا ہو گیا۔ تب ہی وہ چلایا تھا۔ شاہ میر اور حمزہ اب لڑکوں سے گتھم گتھا ہو رہے تھے، جبکہ شہریار ان کے بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا۔

”کتنے چوہے گھسار کھے ہیں یہاں؟“ پستل والے لڑکے نے حمزہ کے سر پر وار کیا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، مصحف نے اسے قابو کر لیا۔

”چوہے نہیں، شیر ہیں یہ۔۔۔۔۔۔ شیر۔۔۔۔۔۔ چوہے تو تم لوگ ہو، جو بزدلوں کی طرح گھس آئے ہو۔“

”شٹ اپ!“ لڑکا چلایا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی پستل چھیننے کی کوشش میں فائر ہو گیا جو کہ سیدھا مصحف کے دائیں بازو میں لگا وہاں فضا میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ شہریار اور حمزہ ان لڑکوں پر جیسے بھوکے شیروں کی طرح پل پڑے تھے۔ جبکہ شاہ میر، مصحف کو سنبھال رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ دایاں بازو لٹک جانے کے باوجود اس نے اپنے دوست کو تسلی دی تھی کہ ان چاروں کی جان تھی ایک دوسرے میں۔ لڑکے اچھی خاصی درگت کے بعد وہاں سے بھاگ گئے۔ تاہم حمزہ اور شہریار کو معمولی سا زخمی بھی کر گئے۔

”سوری یار!“ مصحف ان تینوں سے شرمندہ تھا کہ اسی کی وجہ سے اس کے دوستوں کو یہ مشکل فیس کرنا پڑی۔ تاہم وہ تینوں اسے گھور رہے تھے۔

”ایک نمبر کے احمق ہو تم۔ کیا ضرورت تھی اس شر کو گھر میں پنا دے کر پرایا پھڑا مول لینے کی؟ پتہ تو ہے ان لڑکیوں کا، پہلے چکر چلا لیتی ہیں، ماں باپ کی عزت کا سودا کر لیتی ہیں، پھر گھروں سے بھاگ کر ایسے اوباشوں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں تو چیختی ہیں۔ ہم چاروں کو مروا دینا تھا اس فتنے نے۔“ حمزہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ لڑکی کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دیتا۔ مصحف خود بھی پچھتا رہا تھا۔ اگر نانو وہاں ہوتیں تو اس کی اچھی خاصی کلاس یقینی تھی۔

”چل اب۔۔۔۔۔۔ اس بازو کا کچھ کروا۔ دیکھ کیسے خون رس رہا ہے۔“ شاہ میر کی نظر اس کے زخمی ہاتھ پر تھی۔ شہریار تیزی سے گیراج کی طرف بڑھ گیا۔

”تم ذرا اس لڑکی کا دھیان رکھنا حمزہ! ہم ابھی واپس آ کر خبر لیتے ہیں اس کی۔“ گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے شہریار، حمزہ کو ہدایت کرنا نہیں بھولا تھا۔ حمزہ چپ چاپ اثبات میں سر ہلا کر گیٹ بند کرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں پلٹ آیا، جہاں وہ ایک کونے میں دبکی بیٹھی شدت سے رو رہی تھی۔

”اب کیا مصیبت پڑ گئی ہے تمہیں جو یوں رو رہی ہو۔ میرے یار کو تو فائر لگوا دیا ہے، اب کیا چاہتی ہو، وہ کسی دن آ کر یہاں سب کا کام تمام کر جائیں؟“ اسے غصہ آیا تھا۔ لڑکی نے منہ گھٹنوں میں چھپا کر اپنی سکیوں کا گلا گھونٹ دیا۔

”ہونہہ۔۔۔۔۔ پہلے جوانی قابو میں نہیں آتی۔ کوئی آگے سے ہوشیار نکل آئے تو جان بچانے کے لئے بھاگتی پھرتی ہیں اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالتی ہیں۔ میرا بس چلے تو تم جیسی ساری لڑکیوں کو سولی پر لٹکا دوں۔“ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ لڑکی نے سر گھٹنوں سے نہیں اٹھایا۔

اگلے پون گھنٹے میں مصحف لوگ واپس آ گئے۔ شہریار اور شاہ میر دونوں ہی اس کے لئے متفکر تھے۔

”یہ مصیبت ابھی تک یہیں موجود ہے۔ نکال باہر کیوں نہیں کیا اسے؟“ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے شہریار کی چنگھاڑ پر لڑکی نے سر گھٹنوں سے اٹھایا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اسے پکڑ کر دھکے دیتے ہوئے گھر سے نکالنے کے لئے۔

”اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس کے سمٹنے پر وہ رک گیا تھا۔ لڑکی چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سفید چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

”کہاں جاؤں اس اندھیری طوفانی رات میں؟ جبکہ باہر لیٹرے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اگر میں آپ کی بہن ہوتی تو کیا تب بھی آپ۔۔۔۔۔“

”تم جیسی بہن ہوتی میری تو یہاں تک نوبت ہی نہیں آتی۔ میں پہلے ہی گلابا کر کام تمام کر دیتا تمہارا۔“ وہ چلایا تھا۔ مصحف ایک نظر لڑکی کے سستے ہوئے چہرے پر ڈالتا

خاموشی سے صوفے پر ٹک گیا۔

”تو پھر گلا دبا کر کام تمام کر دیجئے میرا۔ ذلت کی موت سے عزت کی موت ہزار بار قبول ہے مجھے۔“ لڑکی کا اعتماد شاید بحال ہو چکا تھا۔ شہریار اس کی ہٹ دھرمی پر نتنٹا اٹھا۔

”بہت ہوشیار سمجھتی ہو اپنے آپ کو۔ میں کیوں تم جیسی دو ٹکے کی لڑکی کا خون اپنے سر لوں؟“

”دو ٹکے کی بھی نہیں ہوں۔“ اس کی نفرت پر وہ چلائی تھی۔ ”ایک ٹکے کی حیثیت بھی نہیں ہے میری۔ آپ میری طرف دیکھئے۔ آپ کتنے ٹکوں کے ہیں؟“ وہ اب خوف کا شکار نہیں تھی۔ شہریار کے ساتھ ساتھ باقی تینوں بھی اس کی جرأت پر دنگ رہ گئے۔

”صرف ایک رات پناہ دے دیجئے اس چار دیواری میں۔ صبح کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔“ اگلے ہی پل ٹون بدلی تھی اور وہ ایک نظر ان چاروں پر ڈالتی ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل گئی تھی۔

”یار! یہ لڑکی ہے یا کوئی بلا ہے؟“ شاہ میر متفکر ہوا تھا۔ مصحف مسکرا دیا تھا۔

”مجھے تو بلا ہی لگتی ہے کوئی۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔“

”محم بخت نے سارے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ صبح نانو کی واپسی سے پہلے اسے یہاں سے دفعان کر دینا، نہیں تو ہم چاروں کی خیر نہیں ہے۔“ شہریار تھکا تھکا سا مصحف کے برابر جم گیا تھا۔ تب ہی حمزہ ہونٹ دباتے ہوئے بولا۔

”دفعان ہی کرنا ہے تو کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ شراب موجود ہے، شباب کا انتظام قدرت نے کر دیا۔ دیکھا نہیں، کیسا غضب کا سراپا ہے اس کا۔“ اُس کی تجویز پر ان تینوں کو جیسے سانپ سو نگھ گیا تھا۔

”وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“ مصحف نے نظریں چرائی تھیں۔

”تمہیں کیسے پتہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے؟“ حمزہ کو اس کی فیور بری لگی تھی۔

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔ بس اُسے دیکھ کر لگتا ہے، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

”واہ۔۔۔۔۔ سبحان اللہ!۔۔۔۔۔ ایک ہی رات میں بڑے نظر شناس ہو گئے ہو۔ جتنی مصیبت اس نے ہمیں ڈالی ہے، اس کے بعد ہمارا یہ حق بنتا ہے کہ ہم اس سے لطف اٹھائیں۔“

”شٹ اپ حمزہ!۔۔۔۔۔ وہ کسی مشکل کا شکار بھی ہو سکتی ہے۔ ہم لاکھ عیاش سہی، مگر اتنے بھی گرے ہوئے نہیں ہیں کہ پناہ دے کر کسی کو لوٹ لیں۔“

”یاروں سے غداری، غیروں سے وفاداری، واہ!“ شاہ میر کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ مصحف جھنجلا گیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم لوگ میری بلا سے۔“

”اوکے یار!۔۔۔۔۔ فی الحال تو گھر جا رہے ہیں۔ وگرنہ میرے تو ہٹلر فادر شام کے بعد گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دیں گے۔ تو گرم نہ ہو۔۔۔۔۔ عیش کر۔“ شاہ میر سب سے پہلے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ حمزہ اور شہریار بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جانے کو دل تو نہیں چاہتا، پھر بھی مجبوری ہے یار!۔۔۔۔۔ کسی بھی قسم کی کوئی گڑبڑ ہو تو فوری اطلاع دینا۔ میرا آج رات سونے کا موڈ نہیں۔“ حمزہ نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ مصحف پلکیں موندے بے نیاز بیٹھا رہا۔

”چل اٹھ اب۔۔۔۔۔ گیٹ لاک کر لے۔۔۔۔۔ جا رہے ہیں ہم۔“

اس بار شہریار نے صدا دی تھی۔ مصحف قطعی دل نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر بارش اب تھم چکی تھی۔ اس کا دماغ جیسے رفتہ رفتہ سن ہو رہا تھا۔ کچھ تو نشے کا اثر تھا اور کچھ

دوا کا۔

وہ گیٹ لاک کر کے واپس پلٹا تو لڑکی گھٹنوں میں سر دیئے وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی دکھائی دی۔ وہ اسے یکسر نظر انداز کرتا اندر چلا آیا اور کچھ ہی دیر میں شدت سے طاری ہوتی غنودگی نے اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

☆...☆...☆

”کون ہو تم۔۔۔۔۔؟“ ہٹلر نانو کی سواری باد بہاری اگلے روز مصحف کی بے داری سے قبل ہی پہنچ گئی تھی۔ گیٹ بخار میں جلتی پھنکتی لڑکی کو کھولنا پڑا تھا، تب ہی وہ ٹھنکی تھیں۔

”جی میں۔۔۔۔۔ میں ایمان۔۔۔۔۔“ گڑبڑا کر وہ محض یہ ہی جواب دے سکی۔ نانو ٹیکسی والے کو فارغ کرنے کے بعد اسے سائیڈ پر کرتی ہوئی اندر چلی آئیں۔



”کون ایمان؟۔۔۔۔۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟“ رات وہ لڑکے جس نانو کا ذکر کرتے ہوئے ڈر رہے تھے، وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ وہی نانو ہیں اور انہیں دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں تھا کہ اب اس کی شامت آیا ہی چاہتی ہے۔ تب ہی وہ سر جھکا کر کھڑی رہی۔

”بولتی کیوں نہیں ہو؟ مجھے تو پہلے ہی شک تھا، اس لڑکے نے ضرور کہیں کوئی چکر چلا رکھا ہے، تب ہی شادی کی ہامی نہیں بھرتا۔ آج آنکھوں دیکھ کر ثبوت بھی مل گیا۔ تم لوگ کیا سمجھے، میں اچانک نہیں آ سکتی؟ یہ ہے کہاں صحفی کا بچہ۔۔۔۔۔ ذرا میں درگت بناؤں اس کی۔“ تیز لہجے میں بولتے بولتے وہ اس کی خاموشی پر اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ مگر مصحف کے کمرے کی کھلی دہلیز پر قدم رکھتے ہی انہیں ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ نظر کے سامنے ہی وہ بے ترتیب سائیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے دائیں بازو پر پٹی بندھی تھی، جس پر لگا خون صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ جیسے دہل ہی گئیں۔

”مصحف۔۔۔۔۔!“ سارا غصہ ساری خفگی بھولتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکی تھیں۔ گہری نیند میں سوئے مصحف کی آنکھ بمشکل ہی کھل سکی۔

”نانو! آپ کب آئیں؟“

”ابھی آئی ہوں۔ تو بتا، یہ بازو پر کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں نانو!۔۔۔۔۔ ذرا سی چوٹ آئی ہے۔ آپ اندر کیسے آئیں؟۔۔۔۔۔ کیا دیوار پھلانگ کر؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

نانو سلگ گئیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اس عمر میں دیواریں ہی پھلانگوائے گا تو مجھ سے۔۔۔۔۔ نکمے!“ ایک دھموکا پڑا تھا بازو پر اور وہ کراہ کر رہ گیا۔

”ہائے!“

”ہائے کے بچے!۔۔۔۔۔ وہ لڑکی بتا کون ہے جو باہر کھڑی ہے؟“

”مجھ کیا پتہ کون ہے۔ ہو گی کوئی آپ کی ہوتی سوتی۔“ ابھی اس کا دماغ روشن نہیں ہوا تھا۔ اچانک رات کا خیال آیا تو آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

”وہ گئی نہیں ابھی تک؟“ بے خیالی میں وہ اونچا بڑبڑا گیا تھا۔ نانو کے ہاتھ سرا لگ گیا۔

”دیکھا، میں کہتی تھی نا، کوئی چکر ہے۔ ہائے اب کیا جواب دوں گی اقصیٰ کو میں؟ وہ بے چاری تو میری آس پر ہی چار سال سے جوان بیٹی کو لے کر بیٹھی ہے۔“ ان کے افسوس بھرے بیانات جاری ہونا شروع ہو گئے تھے۔

مصحف بوکھلا کر رہ گیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے نانو!۔۔۔۔۔ آپ کی قسم، میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔ آپ اہیں تو ابھی بلا کر پوچھ لیں اس سے۔“ اقصیٰ خالہ کی جان بیٹی سے ہاتھ دھونے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا، تب ہی فوراً صفائی پیش کی تھی۔ مگر نانو نے اس کا قطعی یقین نہیں کیا۔

”بکواس بند کر۔۔۔۔۔ تو جانتا نہیں تو، وہ ہمارے گھر میں کیا کر رہی ہے؟“

”مجھے کیا پتہ کیا کر رہی ہے۔ میں تو ابھی اٹھا ہوں۔ اسی سے پوچھئے نا، وہ کیا کر رہی ہے۔“ وہ چاہتا تھا، لڑکی اپنی کہانی اپنی زبانی نانو کو سنا کر اپنی اور اس کی پوزیشن کلیئر کرے۔ تب ہی اس نے انہیں کچھ بھی بتانے سے احتراز کیا

تھا۔ نانو اب کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اے لڑکی!۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔“ جارحانہ تیوروں کے ساتھ نانو کی توپوں کا رخ اس اجنبی لڑکی کی جانب مڑ چکا تھا، جو ابھی بھی اپنا وجود سمیٹے بیٹھی تھی۔

مصحف کو بے ساختہ ہی عجیب سی شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ ساری رات سرد موسم میں بنا کسی آنچل کے کیسے باہر بیٹھی رہی ہو گی؟

”جی۔“ لڑکی کے چہرے سے ہی اس کی طبیعت کی خرابی کا پتہ چل رہا تھا۔

”کون ہو تم؟ اور یہاں اس گھر میں کیا کر رہی ہو؟“

نانو خود چل کر اس لڑکی تک آئی تھیں۔ جبکہ مصحف شرمندہ سا وہیں کھڑا رہا۔

”بتایا تو ہے، میرا نام ایمان ہے۔ اور میں۔۔۔۔۔ یہاں کیا کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ تو یہ ان سے پوچھئے۔ اپنے نواسے سے، جس نے اپنا نام تو دے دیا مگر کوئی مقام نہیں دیا۔“

کوئی بم ہی تھا، جو مصحف اور نانو کو اپنی سماعتوں میں بلاسٹ ہوتا سنائی دیا تھا۔ نانو نہیں جانتی تھیں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس اجنبی لڑکی کے سامنے

اپنے نواسے پر جس شک اور بد اعتمادی کا اظہار وہ کر کے گئی تھیں، اسی نے اس اجنبی لڑکی کو پناہ اور تحفظ کے لئے جھوٹ کی یہ راہ دکھائی تھی۔

”واٹ۔۔۔۔۔؟“ مصحف اس کے سفید جھوٹ پر شکاؤ رہ گیا تھا۔ تبھی وہ اس کی طرف لپکا تھا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟ میں تو جانتا بھی نہیں تمہیں۔ صاف صاف بتاؤ نانو کو کہ کون ہو تم؟ اور رات کن لڑکوں کے خوف سے یہاں اس گھر میں پناہ لی تھی تم نے؟“

وہ نانو کی شکی طبیعت سے بخوبی واقف تھا، تبھی گھبرا گیا تھا۔ مگر لڑکی نے پروا نہیں کی۔ عجیب بے نیازی سے وہ اب بھی کہہ رہی تھی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے بزدل نکلو گے۔ وگرنہ ماں باپ کے گھر کی دیواریں کبھی پھلانگ کر نہ آتی تمہارے لئے۔ مجھے کیا پتہ تھا، نکاح کے بعد بھی کسی کچرے کی طرح چھپاتے پھرو گے تم مجھے۔ ورنہ کبھی تمہارے ساتھ یہاں نہ آتی۔“ اس کی آنکھیں اب آنسوؤں سے جھلملائی تھیں۔ نانو کا دل اس کی حالت پر پگھل گیا۔

”نری بکواس ہے یہ۔ تم نانو کے سامنے میرا میج خراب کر رہی ہو۔ یہ صلہ دیا ہے میرے احسان کا۔ اس سے تو بہتر تھا، میں رات ہی دھکے دے کر یہاں سے نکال باہر کرتا تمہیں۔“

”ہاں۔ مجھ غریب، لاوارث سے نکاح کر کے احسان ہی تو کیا ہے آپ نے۔ مگ کب تک یہ بات سب سے چھپائیں گے آپ؟ ایک نہ ایک دن تو کسی کو پتہ لگنا ہی تھا، تو پھر آج کیوں نہیں؟ نانو بھی ایک عورت ہیں۔ یہ میرے ساتھ کبھی ظلم نہیں کریں گی، مجھے یقین ہے۔“ بلا کی خود اعتمادی تھی اس کے لہجے میں۔ مصحف کی عقل جواب دے گئی۔

”بند کرو یہ ڈرامہ۔ خوب سمجھ گیا ہوں میں تم جیسی آوارہ، بد چلن لڑکی کی چال۔ تم یہ ساری بکواس کر کے میری نانو کو بے وقوف بنانا چاہتی ہو، تاکہ جتنا مال یہاں اس گھر سے ہاتھ لگ سکتا ہے، اڑا کر ان رات والے عاشقوں کی مدد کر سکو۔ صحیح کہتا تھا حمزہ۔ تم شر ہو۔ تم لڑکیوں سے بھلائی کی اُمید رکھنا ہی بے وقوفی ہے۔“

وہ جلا تھا اور جی بھر کر جلا تھا۔ لڑکی کے آنسوؤں کی روانی میں مزید شدت آ گئی۔ تبھی نانو بولی تھیں۔

”بکواس بند کرو مصحف! بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں میں تمہیں۔ یہ بچی جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ تم ہو جو جھوٹے ہو۔“

”نانو!۔۔۔۔۔ نانو! آپ اس دو ٹکے کی آوارہ، بد چلن، اجنبی لڑکی کو اپنے نواسے پر ترجیح دے رہی ہیں؟“ وہ شدتِ غم سے جیسے گنگ ہی تو ہو گیا تھا۔

”ہاں۔ کوئی بھی لڑکی اپنی عزت کے لئے اتنی بڑی بات یونہی نہیں کہہ سکتی۔ نہ تو اتنا اچھا ہے کہ یونہی کسی کو گھر میں گھسنے دے۔“ نانو بھی اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔ وہ سر پیٹ

کر رہ گیا۔

”ایک منٹ رکیں۔ میں ابھی حمزہ، شہریار، شاہ میر وغیرہ کو بلاتا ہوں۔ وہی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کریں گے آپ کے سامنے۔“

”بس رہنے دے۔ بڑے آئے وہ جادوگر کہیں کے۔ جیسے تم، ویسے تمہارے دوست۔ میں اس بچی کو بے آسرا نہیں چھوڑ سکتی۔“

وہ واقعی رحم دل خاتون تھیں۔ ایمان نامی لڑکی کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”اچھا بیٹی! اندر چلو۔“ لڑکی کے حال پر دل گرفتہ ہوتی وہ بنا مصحف کی پروا کئے اسے اندر لے گئی تھیں۔ پیچھے مصحف اپنا درد، اپنا زخم بھول کر ان تینوں کے نمبر ٹرائی کر رہا تھا جو رات بھر جاگنے کے بعد اب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

☆...☆...☆

ان کا گھر اگرچہ پرانی طرز کا بنا ہوا تھا مگر وہ ان کے سر چھپانے کے لئے ایک بہترین ٹھکانہ تھا۔ عبداللہ صاحب نے اپنی زندگی میں ہی دونوں بیٹیوں کے حصے الگ کر دیئے تھے۔ غلام عباس صاحب بڑے تھے اور ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ جبکہ غلام محمد صاحب ان سے چھ برس چھوٹے تھے اور انہوں نے باپ کی خواہش پر دس جماعت پاس کر کے مقامی اسکول میں درس و تدریس کا پیشہ اپنا لیا تھا۔



عبداللہ صاحب مقامی مسجد کے امام تھے اور ان کی زندگی کے بہت سے سال لوگوں کی اچھائی و بھلائی کی تبلیغ کرنے میں بسر ہوئے تھے۔ یوں تو دونوں بیٹوں پر ہی ان کا رعب تھا، تاہم غلام محمد صاحب اپنے اچھے اوصاف کی بنا پر ان کے زیادہ قریب تھے اور ان کا زیادہ وقت عبداللہ صاحب کے ساتھ ہی مسجد میں بسر ہوتا تھا۔

ان کی ماں ایک نیک اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ جن کے وجود کی ایک انوکھی سی خوشبو سے سارا گھر مہکتا تھا۔ عبداللہ صاحب اکثر انہیں بتاتے تھے کہ ان کی زندگی اور جوانی شادی سے پہلے بہت فضول تھی۔ زندگی میں ”بھاگ بھری“ کی آمد کے بعد، وہ جیسے جادوئی طریقے سے بدلتے چلے گئے۔ ایک نیک مومن عورت نے اپنی محبت اور کوششوں سے انہیں اللہ کے بہت قریب کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد وہ بہت زیادہ عاجز ہو گئے تھے۔ ساری ساری رات مسجد میں ایک کونے میں بیٹھے اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے اور پُر سکون، خوش رہتے۔

عبداللہ صاحب کی غلام محمد صاحب سے خصوصی انسیت کے باعث، غلام محمد صاحب کی کبھی اپنے چھوٹے بھائی سے نہیں بنی تھی۔ وہ اپنی من مانی کرنے والے ضدی انسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی اٹھارہ سال کے ہوئے تھے کہ ایک روز بغیر کسی کو بتائے اپنی دکان پر آنے والی ایک خوب صورت دوشیزہ سے چوری چھپے شادی کر لی۔ بات زیادہ دن چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ محلے میں بے پناہ اچھی شہرت رکھنے والے عبداللہ صاحب نے بیٹے کی اس شرم ناک حرکت کو ایسا دل پر لیا کہ پھر سنبھل ہی نہ سکے اور پندرہ روز کے اندر اندر دل کے دورے کا شکار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

باپ کی وفات کے بعد غلام محمد صاحب دنیا سے مزید کنارہ کش ہو کر اللہ رب العزت کی پاک و بے نیاز ذات سے اور قریب ہو گئے۔ ادھر غلام عباس کی شادی کو ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ قدرت نے انہیں بے حد خوب صورت بیٹے سے نواز دیا۔ تاہم یہ شادی زیادہ عرصے نہیں چل سکی تھی۔ گھر میں روز کا معمول بنتے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کا انجام بالآخر طلاق پر ہوا تھا اور یوں غلام

عباس صاحب شادی کے محض دو سال بعد بیوی کے ساتھ ساتھ بچے سے بھی محروم ہو گئے۔

غلام محمد صاحب کی شادی ان کی مرضی کے قطعی خلاف غلام عباس صاحب نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ کیونکہ دوسری بار وہ جس خاتون سے شادی کے خواہش مند تھے، ان کے گھر والے اپنی دونوں بیٹیاں ایک ہی گھر میں بیاہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یوں بھائی کی پسند و خوشی کو قطعی اہمیت نہ دیتے ہوئے غلام عباس صاحب نے اپنا گھر بسانے کے لئے ان کی خالص ذاتی زندگی کا فیصلہ بھی خود کر لیا اور شہناز بیگم کے ساتھ ساتھ شمشاد بیگم بھی پورے چاؤ کے ساتھ بیاہ کر اس گھر میں چلی آئیں۔

غلام محمد صاحب نے دل ٹوٹنے کے باوجود صرف اپنے بھائی کا مانا رکھنے کے لئے اپنی تیکھے مزاج کی گمراہ بیوی کے ساتھ نباہنے کی پوری کوشش کی اور اس کے بطن سے جنم

لینے والے اپنے بچوں اُجالا، عباد، ندا، حمند اور سعد کی بہترین پرورش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ مقامی سکول میں درمیانے درجے کے استاد تھے اور اپنی پوری تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر لا کر رکھتے تھے۔ اس کے باوجود گھر میں لڑائی تھی کہ کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔

غلام عباس صاحب کے دوسری بیوی سے دو بیٹے اسجد اور ولید تھے جبکہ ایک بیٹی ماریہ تھی۔ غلام محمد صاحب کی نسبت ان کے گھر میں امن تھا کیونکہ وہ بیوی اور بچوں کے حکم کے غلام تھے اور ان کی خوشی و خواہشات کے لئے جائز و ناجائز حدود ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔

غلام محمد صاحب کے بچوں میں اُجالا اپنے نام کی طرح بے حد صاف رنگت کی حامل نہایت خوب صورت لڑکی تھی، اسی لئے اس کی پیدائش پر شہناز بیگم نے اسے اپنے بڑے بیٹے اسجد کے لئے مانگ لیا تھا۔ وہ ابھی میٹرک میں تھی کہ غلام محمد صاحب ایک چھوٹے سے ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر ٹانگ پر چوٹ لگوا بیٹھے۔ مناسب علاج نہ ہونے کے سبب زخم بگڑتا گیا اور آہستہ آہستہ کوڑھ میں بدل گیا۔

بچے بڑے ہو رہے تھے اور حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ گھر میں فاقوں نے ڈیرے ڈالے تو ان کی بیوی شمشاد بیگم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور زبردستی طلاق لے کر اپنا علیحدہ گھر بسا لیا۔

ماں کے اس اقدام نے بچوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ سب باپ سے متنفر تھے۔ کیونکہ شہناز بیگم اور غلام عباس صاحب نے رشتے کی اس ناکامی کا سارا ملبہ انہی پر ڈالا تھا۔ اجالا کے سوا ان کے سبھی بچے، شہناز بیگم کی مٹھی میں تھے اور انہوں نے ان کے ذہن خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

زندگی کے ایسے کٹھن حالات میں صرف ”اسجد“ کی ذات تھی، جو اجالا کے لئے زندگی کی واحد دلچسپی کا مرکز تھی۔ اس نے پرائیویٹ ایف اے کے بعد ایک فیکٹری میں سلائی کا شعبہ جوائن کر لیا تھا۔ جبکہ غلام محمد صاحب نے بھی سکول والوں کی طرف سے معذرت کے بعد اپنے گھر میں ہی بیٹھک کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تھا اور وہاں روزمرہ استعمال کی چیزیں رکھ کر سارا سارا دن بیٹھے رہتے۔

اجالا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے باپ کو بے حد پرہیزگار پایا۔ اکثر راتوں میں اس کی آنکھ کھلتی تو وہ جائے نماز پر بیٹھے سسکیاں بھر رہے ہوتے تھے۔ اس نے کبھی انہیں حالات سے دل برداشتہ نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اللہ رب العزت کی پاک و بے نیاز ذات سے لو لگانے کے بعد دنیا ان کے لئے گھاس کے تنکے سے بھی زیادہ حقیر ہو کر رہ گئی تھی۔

بڑے سے بڑے نقصان پر بھی اس نے کبھی انہیں پریشان نہیں دیکھا تھا۔ اور یہی بات شہناز بیگم و شمشاد بیگم کو چڑاتی تھی۔ حالات ابھی ٹھیک سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک روز غلام عباس صاحب کی کپڑے کی دکان میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اسجد شہر سے باہر پڑھ رہا تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا۔ پیچھے غلام عباس صاحب اور ان کے ملازم ہی ہوتے تھے۔ تقدیر کی طرف سے اس آفت پر صبر کرنے کا حوصلہ غلام عباس صاحب اور ان کی بیوی میں نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ راہِ راست سے بھٹکنے لگے تھے۔

اسجد کا کالج میں آخری سال تھا اور اجالا اسے پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے گھریلو حالات خراب ہونے کے بعد وہ اس کی مدد کر رہی

تھی۔ اپنی ہر ضرورت سے نظریں چرا کر جتنے پیسے بھی وہ جمع کرتی، سب اسجد پر وار دیتی۔ اس کی اولین خواہش تھی کہ اسجد کا ہر خواب پورا ہو۔ وہ کبھی کسی مشکل کا سامنا نہ کرے۔ آخر اسجد بھی تو بچپن سے اس کا بہت خیال رکھتا آیا تھا۔

اگر اُجالا کی آنکھوں میں اس کے خواب تھے تو اس کی بھی جان تھی اُجالا میں۔ کوئی بھی خوشی یا غم ہوتا، اُجالا سے جب تک شیر نہ کر لیتا، اسے قرار نہیں ملتا تھا۔ گھر سے دور رہ کر بھی اسے ہر بات کی خبر تھی۔

عباد جو اُجالا سے چھوٹا، اُس کی امیدوں کا واحد مرکز تھا، میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ بیٹھا تھا۔ گھر کے ماحول میں ٹینشن کے ساتھ ساتھ عجیب سا بدلاؤ بھی آ رہا تھا۔ تایا اور ان کی فیملی کی سرگرمیاں مشکوک ہو گئی تھیں۔ اسجد کا نمبر قسمت سے ہی آن ملتا۔ حمنہ اور ندا سارا سارا دن تائی کے گھر گھسی رہتیں۔ عباد بھی اکثر گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ ایسے میں

اسجد ایگزیم دے کر گھر لوٹ آیا تو اُجالا خود کو مضبوط محسوس کرنے لگی۔ وہ اب ملازمت کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اور یہاں اس موڑ پر بھی اُجالا کی رہنمائی اس کے ساتھ تھی۔

☆...☆...☆

اسجد اس رات معمول سے کہیں زیادہ تاخیر سے گھر لوٹا تھا۔ اُجالا جو بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی فوراً اس کے کمرے کی طرف لپکی۔

”اسجد!“ وہ شرٹ اتار رہا تھا، جب اس کی پکار پر رک گیا۔

”ہوں۔“ واپس پلٹتے ہوئے اس نے بہت سرسری سی نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔

”وہ۔۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔“

”ٹھیک ہے، کرو۔“

”تمہیں پتہ ہے، آج تایا نے ابا سے بہت عجیب بات کی ہے۔“

”کیا عجیب بات کی ہے؟“

”تمہیں نہیں پتہ؟“



”نہیں۔“

”اسجد! بتایا چاہتا ہے کہ ابا پیسے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت سے منکر ہو جائیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ابا ان لوگوں میں شامل ہو جائیں، جو اللہ کے سخت عتاب کا شکار ہوں گے۔“

”پھر؟“

”پھر تم انہیں سمجھاؤ۔ انہیں اس کبیرہ گناہ سے روکو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”پہلے کیا ٹھیک ہو رہا ہے اس ملک میں۔ بولو؟ کون ہے جو اپنا ایمان ہاتھ پر لئے نہیں پھر رہا؟ یہ لوگ جو اسلام دشمنوں سے پیسے لے کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بندوں کو ناگہانی اموات کے سمندر میں دھکیل رہے ہیں، یہ ٹھیک ہیں؟“

”ہر شخص کے اپنے اعمال ہیں اسجد! کوئی کسی دوسرے کی قبر میں نہیں جائے گا۔ جب تک یہ زندگی ہے، تب تک بچت ہے۔ ادھر آنکھ بند ہوئی، ادھر حساب شروع ہو گیا۔ وہ لوگ ہمارے سگے نہیں ہیں کہ ہم ان کے انجام کی فکر میں گھلتے رہیں۔ مگر بتایا ہمارا اپنا ہے۔“

”اُس اوکے اُجالا! اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ابھی تم جاؤ یہاں سے پلیز۔“ اچانک اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تھا۔ وہ شکڑ سی کھڑی رہ گئی۔

”ہر شخص کی اپنی زندگی ہے۔ وہ جیسے چاہے گزارے۔ ابا نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ لے لئے ہیں انہوں نے پیسے۔ ذرا سے رد و بدل سے بہت کچھ پاک وہ کسی کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔“ وہ خود بھی اضطراب کا شکار تھا۔

اُجالا کو لگا، اُس کا دل پھٹ گیا ہو۔

”ذرا سے رد و بدل سے؟ دین و دنیا کی بربادی کو ذرا سا رد و بدل کہہ رہے ہو تم؟“

”میرا دماغ خراب مت کرو اُجالا! ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ صرف بات طے ہے ہماری۔ تم چاہو تو اپنا راستہ بدل سکتی ہو۔“

”چپ کر جاؤ اسجد!۔۔۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں، چپ کر جاؤ۔ کیا سارے آسمان ایک ساتھ گرا دو گے؟ اتنے ظالم تو نہیں تھے تم۔“ وہ ٹوٹی تھی اور آنسو ایک لمحے میں اس کا چہرہ بھگو گئے تھے۔

اسجد عباس لب بھینچے کمرے سے نکل گیا تھا۔

کیا واقعی اب اس کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی؟ کیا واقعی اسے اپنے باپ کی گمراہی سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا؟

وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی اس کا سر درد سے بھٹ رہا تھا۔ پوری رات جاگ کر بسر کرنے کے بعد صبح جب وہ فجر کی نماز کے لئے اٹھی تو سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ تایا کے پورشن کی طرف مکمل خاموشی تھی۔ وہ بے دلی سے وضو کرنے کے بعد مصلے پر کھڑی ہوئی تو رُکے ہوئے آنسوؤں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ کتنی بے شمار دعائیں تھیں جو اس وقت اس نے روتے ہوئے اپنے اللہ سے کی تھیں۔

☆...☆...☆

سنو لوگو! میری آنکھیں خریدو گے؟

مجھے اک خواب کا تاوان بھرنا ہے

اک ایسا خواب تھا، جو جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا

بہت ہی چاؤ اور کتنے ارمانوں سے دیکھا تھا

مگر دیکھے ہوئے اس خواب کی تعبیر اُلٹی تھی

نہیں شکوہ کسی سے، اپنی ہی تقدیر اُلٹی تھی

جو اب تک ہو چکا ہے، مجھ کو وہ نقصان بھرنا ہے

اب آنکھیں بیچ کر ہی خواب کا تاوان بھرنا ہے

وہ بیڈ پر اداس بیٹھی تھی، جب نانوں نے گرم کمبل اس کے گرد لپیٹ دیا۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ بیٹی! اور پھر بتاؤ، کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ مصحف

کہاں ملا تم سے؟“ وہ بے چین تھیں۔

ایمان نے ایک نظر اُن کے پُر نور چہرے پر ڈالنے کے بعد سر جھکا لیا۔

”وہ میرے آفس میں ملے تھے۔ جس دفتر میں، میں کام کرتی تھی، وہاں تین

اور لڑکے بھی تھے ان کے ساتھ۔ میں بے یارو مددگار تھی، جب انہوں نے

میرے بارے میں جان کر مجھے پُرپوز کیا اور یہ بتایا کہ اپنی بوڑھی نانوں کے

ساتھ تنہا رہتے ہیں تو میں انکار نہ کر سکی۔ مجھے گھر اور تحفظ چاہئے تھا نانوں! اسی

لئے میں نے خوشی خوشی ان سے کورٹ میرج کر لی۔ بعد میں یہ اسی شام

جانے کیسے کیسے خواب دکھا کر واپس لوٹ آئے اور میں ان کا انتظار ہی کرتی

”پتہ نہیں نانو! شاید یہ آپ سے کچھ چھپانا چاہ رہے تھے۔“

نانو کو جوش آیا تھا، پھر فوراً نرم پڑتے ہوئے بولیں۔ ”تم نے بتایا نہیں، کس شہر سے تعلق ہے؟ ماں باپ کیا کرتے ہیں؟“

348

”تم دل پر مت لو بیٹی! اسے تو عادت ہے جگہ جگہ منہ مار کر اپنی نانو کا نام خوب روشن کرنے کی۔ مگر میں ظلم نہیں کروں گی کسی بے آسرا پر۔ تم یہیں اسی گھر میں رہو گی، میری بہو بن کر۔ دیکھتی ہوں، یہ کیسے لفٹ نہیں کرواتا تمہیں۔“

نانو اس کے دام میں آ چکی تھیں۔ اس نے بے ساختہ سُکھ کا سانس لیا۔

”شکریہ نانو! آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت نیک دل۔ پتہ نہیں، آپ یہاں نہ آتیں تو یہ اور ان کے دوست میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔ کل رات بھی ان کی لڑائی ہو گئی تھی اپنے دوستوں سے۔“

”اللہ رحم کرے، انکیلی کیوں ہو؟ میں ہوں نا، تمہاری نانو، تمہاری ماں۔ اور میرا مصحف ہے نا۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ تم بہت خوش رہو گی اس کے ساتھ۔“

فوراً ہی وہ اسے تسلیاں دیتے ہوئے بولیں اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اب کچھ آرام کر لو۔ بخار بہت تیز ہو رہا ہے۔ مصحف سے کہتی ہوں، ڈاکٹر کو بلا لائے۔ کچھ بنا بھی دیتی ہوں۔ باورچی تو دن چڑھے ہی آئے گا۔“

”جی نانو!“ اسے خود بھی آرام کی اشد ضرورت تھی سو جلتی آنکھوں اور ہزار وسوسوں کے ساتھ بالآخر پلکیں موند گئی۔ نانو اُجھی اُجھی سی، قدرے متفکر اس کے کمرے سے باہر چلی آئیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد حمزہ، شہریار اور شاہ میر وہاں موجود تھے۔

”نانو! وہ قسم سے ایک نمبر کی فراڈ لڑکی ہے۔ رات اس کی وجہ سے مصحف کو فائر لگا۔ پتہ نہیں کن لوگوں کو پیچھے لگا کر لے آئی تھی۔ آپ کچھ تو سوچیں۔ بھلا کہاں مصحف، کہاں وہ آوارہ بد چلن لڑکی۔“

حمزہ نے سب سے پہلے دہائی دی تھی۔ جواب میں نانو نے اسے ڈپٹ کر رکھ دیا۔

”بکو اس بند کرو حمزہ! تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم کسی لاچار، مصیبت کی ماری لڑکی پر اتنا بڑا الزام رکھو۔“

”مگر نانو! وہ مصیبت کی ماری نہیں ہے۔ وہ خود بہت بڑی مصیبت ہے۔“

”یہ تمہیں مصحف سے اس کا نکاح کروانے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔“

”نکاح۔۔۔۔۔ کون سا نکاح؟“ شہریار نے بھنویں اچکائی تھیں۔ اسی پل وہ خود چل کر وہاں آ گئی۔

”میں بتاتی ہوں کون سا نکاح۔ تنی جلدی بھول گئے آپ کہ آپ میرے بھائی بنے تھے، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر آپ نے کہا تھا کہ آپ کا دوست مجھے ہمیشہ خوش رکھے گا۔ اور یہ کہ میں آپ کی زبان کا اعتبار کروں۔ میں نے اعتبار کیا۔ آپ نے کیا کیا میرے ساتھ؟۔۔۔۔۔ مجھ غریب، لاوارث کو پہچاننے سے ہی انکاری ہو گئے؟“

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔

”شٹ اپ! یہ نرا جھوٹ اور ڈرامہ ہے۔“



”ہاں، اب تو آپ یہی کہیں گے۔ بات کھل جو گئی ہے۔“ وہ کہاں ہار مارنے والی تھی۔ مصحف کا بس نہ چلتا تھا کہ اس کا منہ تھپڑوں سے سرخ کر دیتا۔ نانو کو بالآخر مداخلت کرنی پڑی تھی۔

”چپ ہو جاؤ تم لوگ۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ وقت کرے گا۔“

”مگر نانو! یہ۔۔۔۔۔۔“

”بس چپ۔ ایک لفظ بھی مزید نہیں سننا ہے۔ جاؤ بیٹی! تم جا کر آرام کرو۔ مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔ واپسی پر ڈاکٹر کو کال کروں گی۔“

ایمان ان کی ہدایت پر سر ہلا کر وہاں سے چلی آئی جبکہ مصحف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس روز پہلی بار وہ خاصی دیر تک گھر سے باہر رہا تھا۔ حمزہ، شہریار اور شاہ میر اسے مختلف ٹپس دیتے رہے کہ وہ کیسے لڑکی کے منہ سے سچ اُگلا کر اپنی پوزیشن کلیئر کر سکتا ہے۔ جبکہ ایمان خرابی طبیعت کے باوجود نانو سے دنیا جہان کی باتیں کرتی، ان کا اعتماد جیتنے کی کوشش میں لگی رہی تھی۔

☆ . . . ☆ . . . ☆

نانو! مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ یہ لڑکی واقعی ٹھیک کہہ رہی ہے۔  
ہمارا نکاح ہوا ہے۔“

ایمان رات نانو کے ساتھ انہی کے کمرے میں سوئی تھی اور اس کا آئندہ بھی یہی ارادہ تھا۔ مصحف کا اس سے کسی بھی تعلق سے انکار اس کے لئے فائدہ مند ہی تھا۔ تاہم اگلی صبح ہی ناشتے کی میز پر اس نے جیسے یہ اعتراف کرتے ہوئے اس کے سر پر بم ہی پھوڑ دیا۔ اس کے ہاتھ سے چائے چھلکی تھی اور کپڑوں پر گر پڑی تھی۔

”مجھے تو پہلے ہی یقین تھا، یہ بچی جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ تم ہو جو جھوٹے ہو۔ مگر میں اس کے لئے تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”سوری بولا ہے نا، نانوا! غلطی ہو گئی۔ پلیز معاف کر دیں۔“

لجابت سے کہتا وہ نانو کی ساتھ والی کرسی پر ٹک گیا تھا۔ ایمان شاکڑ سی اسے دیکھتی رہی۔ وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔

”میں اپنی ذمہ داریاں نبھاؤں گا۔ بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ ایمان سے کہیں، آج سے میرے کمرے میں سویا کرے۔“

وہ دیکھنا چاہتا تھا، اس بات پر لڑکی کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ اور واقعی اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ وہ بہت پریشان نگاہوں سے مصحف کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ابھی نہیں۔ پہلے میں تمہاری شادی کا باقاعدہ اعلان کروں گی۔ دھوم دھام سے اپنی ساری خواہش پوری کروں گی۔ پھر ایمان تمہارے کمرے میں جائے گی۔“

اب چہرے کا رنگ اُڑنے کی باری مصحف کی تھی۔

”مگر نانو! یہ تو زیادتی ہے۔ میں جب اسے اپنی بیوی تسلیم کر رہا ہوں تو دنیا میں ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی خالہ اقصیٰ کو پتہ چل گیا تو۔۔۔۔۔“

”تو ہو جائے پتہ۔ یہ بات اب چھپنے والی تھوڑی ہے۔ ویسے بھی اس کی بیٹیوں کو کمی نہیں ہے رشتوں کی۔“

”اچھے رشتوں کی کمی تو ہے نا۔ کتنا دکھ ہو گا انہیں جب ان کی آس ٹوٹے گی۔ آپ خود ہی تو کہتی ہیں، ہماری آس پر بیٹھی ہیں وہ۔“

”یہ بات پہلے سوچنی چاہئے تھی تمہیں۔ اب بھول جاؤ سب۔“

”نہیں نانو! کم از کم خالہ اقصیٰ کی بیٹیوں کو نہیں بھول سکتا میں۔“ وہ رونے والا تھا۔ نانو کا پارا چڑھ گیا۔

”تم چاہتے ہو، تمہاری بیوی کے سامنے درگت بناؤ تمہاری؟“

”یہی امید ہے مجھے آپ سے۔“ دل جلے انداز میں کہتا وہ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایمان نے بے ساختہ سکون کی سانس لی۔ مصحف سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور حمزہ کا نمبر پریس کر ڈالا۔

”ہیلو۔ بنی کچھ بات؟“ دوسری طرف اس نے پہلی ہی بیل پر کال پک کر کے بنا دعا سلام کئے پوچھا تھا۔

”نہیں بنی۔ نانو کے اصولوں اور خواہشوں نے پانی پھیر کر رکھ دیا۔ کچھ اور بتا۔“

”چل آ جا پھر یہاں۔ مل کر کچھ اور پلان کرتے ہیں۔“

وہ عجلت میں تھا۔ مصحف نے کال کاٹ کر گاڑی کی چابی اٹھا لی۔

☆...☆...☆

اگلی صبح کے طلوع ہوتے سورج سے قبل ہی اسجد گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ آفس کے لئے تیار ہو رہی تھی، جب تایا اور تائی خاموش سے پھر ان کے پورشن کی طرف چلے آئے۔ غلام محمد صاحب اس وقت ذکرِ الہی میں مشغول تھے۔ تایا آکر ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئے۔

”پھر کیا سوچا ہے تُو نے غلام محمد؟“

”کس بارے میں؟“

تایا کے سوال پر اس کے ابا کا سریوں اٹھا تھا، جیسے وہ کل ہونے والی ہر بات بھلا چکے ہوں۔ تائی نے ان کے جواب پر ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔

”دو دن سے کس بات پر سر کھپا رہے ہیں تیرے ساتھ؟“

”کہا تو ہے۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ مرنے کے بعد بھی نہیں۔ کاش میرے

بازوؤں میں طاقت ہوتی تو مجھ سے ایسا مطالبہ کرنے والے کا سر تن سے جدا

کر دیتا۔“

”دیکھا، آپ بھائی کی محبت میں پاگل ہو رہے ہیں اور یہ آپ کا سر تن سے جدا کرنے کی بات کر رہا ہے۔ یہی سننا تھا یا ابھی کچھ اور بھی سننا باقی ہے؟“

تائی ان کے جواب پر بجلی کی طرح چمکی تھیں۔ تایا کا غصہ ان کا چہرہ سرخ کر گیا۔

”تُو نے کیا سر تن سے جدا کرنا ہے میرا۔ میں خود ہی دفعتاً کرتا ہوں تجھے۔ مر یہاں سڑ سڑ کر۔ مجھے کیا؟ میں تو جا رہا ہوں یہاں سے۔ دیکھوں گا، آج کے بعد کون پوچھتا ہے تجھے؟“

پہلی بار اُجالا نے تایا کا ایسا غضب ناک روپ دیکھا تھا۔ اس کا دل پہلو میں شدت سے کانپ اُٹھا۔ بات سنبھالنے کے لئے وہ جلدی سے آگے بڑھی تھی۔

”تایا! میری بات سنیں۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ۔۔۔۔۔“

”بھاڑ میں جائے ہماری طرف سے تیرا ابا اور تُو، سمجھی۔“

تائی نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔ وہ لپک کر ان کے پورشن تک ان کے پیچھے آئی مگر وہاں کوئی اس کی بات سننے والا نہیں تھا۔ وہاں اس

گھر کے در و دیوار کے اندر تبدیلی آرہی تھی۔ وہ بے بسی سے شکستہ قدم گھسیٹتی واپس چلی آئی۔

تایا اور ان کی فیملی اس روز اپنا گھر چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف پورشن خالی کر دیا تھا، بلکہ اسے ایک اوباش بزنس مین کے ہاتھوں فروخت بھی کر دیا۔ عباد، حمزہ، ندا اور سعد چاروں اپنے باپ سے خفا تھے کہ وہ تایا کے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ اُجالا کو لگتا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ شدید نامساعد حالات اور ڈپریشن نے اس کے ایمان کی چولیس بلا دی تھیں۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ اسجد غلام عباس کی وہاں سے رخصتی نے اسے اندر سے کاٹ ہی تو ڈالا تھا۔ اس وقت جب وہ بنا اس سے کچھ کہے گھر واپسی پر اپنا سامان پیک کر رہا تھا تو وہ اس کے سامنے رو پڑی تھی۔

”اسجد! کیا تمہارے لئے بھی دولت، میرے پیار سے بڑھ کر انمول ہے؟“

”نہیں۔“ وہ خود بھی ڈپریشن تھا۔ اُجالا تڑپ اُٹھی۔

”نہیں تو میرا ساتھ چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟ تم جانتے ہو نا، مجھے تمہارے بغیر جینے کا سلیقہ نہیں ہے۔ تم جانتے ہو اسجد! میرے لئے زندگی کا اگر کوئی معنی ہے تو وہ تم ہو۔ میں نہیں چل سکتی ایک قدم بھی تمہارے بغیر۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ اب بھی کمرے کی کھڑکی کے اس پار سڑک پر پھیلنے اندھیروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُجالا نے اس کا بازو تھام لیا۔

”جانتے ہو تو تماشا کیوں بنا رہے ہو میرا؟ کیوں ضبط آزما رہے ہو؟“

”میں مجبور ہوں اُجالا! اپنے والدین کا مقروض ہوں۔ میری ذات پر پہلا حق ان کا ہے۔“

”اللہ کا نہیں ہے؟ جس نے تمہیں پیدا کیا تم پر بے پناہ احسانات کئے۔“

”کیوں نہیں ہے۔ میں نے کب اقرار نہیں کیا اس کے احسانات کا؟ میں اپنے مذہب کو سستے داموں فروخت نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے بھی پتہ ہے، یہ چند لاکھ، یہ کروڑ، جنت کی قیمت نہیں ہیں۔“

”پھر؟“



”پھر کچھ نہیں۔ ذرا سے صبر اور حوصلے سے کام لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ جانے کیا سوچے ہوئے تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ آئی۔

اسجد غلام عباس اسی رات اپنے والدین کے ساتھ وہاں سے چلا گیا تھا۔ تاہم اُجالا کی محبت اور دعائیں اس کے لئے کم نہیں ہوئیں۔ اپنی ہر نماز میں ایمان کی سلامتی اور باپ کی صحت مندی کے بعد اس کی تیسری دعا اسجد غلام عباس کے لئے ہی ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اللہ اس کی دعائیں کبھی رد نہیں کرے گا۔ وہ اگر بہت نیک نہیں تھی تو اتنی گناہ گار بھی نہیں تھی کہ اللہ اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔

بعض اوقات اسجد کے لئے اُس کی دعا، دعا نہیں رہتی تھی، ضد بن جاتی تھی۔ ایک چھوٹی سی، ننھی بچی کی ضد۔ جسے ہر قیمت پر اپنی پسندیدہ چیز کو پانا تھا۔ خواہ وہ اس کے لئے مناسب ہوتی یا نہیں۔ پچھلے کچھ روز سے اس کی دعاؤں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ اس کا خیال تھا، اللہ کے حضور سب سے پہلے کی جانے والی دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔ لہذا اب ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہی وہ اللہ سے اسجد کا ساتھ بھی مانگتی تھی۔ بقیہ دعائیں تو جیسے رٹے رٹائے مفہوم کے

ساتھ لبوں پر آتیں۔ آج کل فیکٹری میں کام پر اس کی توجہ بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ایک ایک سوٹ کی سلائی میں دو دو گھنٹے لگ جاتے پھر بھی کام میں صفائی مفقود ہوتی تھی۔

اس روز فیکٹری انچارج نے اسے اپنے آفس بلوایا تھا۔ وہ پریشان سی مشین سے اُٹھ آئی۔

”السلام علیکم!“ اپنے انچارج کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نظریں جھکا کر سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ آؤ بیٹھو۔“

انچارج سیف اللہ ہاشمی صاحب نے سامنے پڑی فائل سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور فائل بند کر دی۔

”جی، آپ نے بلایا سر؟“

”ہوں۔ بلانا پڑا۔ اصل میں آج کل آپ کی توجہ کام پر نہیں ہے۔ جتنے سوٹ بھی آپ نے سلائی کئے ہیں، سب واپس آ گئے۔ آپ کے علم میں ہے بی بی! کہ صرف اور صرف یہاں آپ کے والد صاحب کی عزت کی وجہ سے میں نے

آپ کو کام پر رکھا۔ دوسروں کی نسبت زیادہ ریلیف دیا۔ مگر پچھلے پندرہ بیس روز سے آپ نے تو قسم کھالی ہے مجھے شرمندہ کروانے کی۔“

ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرنے والے سیف اللہ ہاشمی صاحب کا رویہ اس وقت بے حد روڈ تھا۔ اجالا کا سر مزید جھک گیا۔

”معافی چاہتی ہوں سر! اصل میں آج کل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو چھٹی لے کر گھر بیٹھ جائیں۔ کپنی کو تو خسارے میں نہ ڈالیں۔ میں مالکوں کو کیا جواب دوں گا؟ مارکیٹ میں اس وقت اس کپنی کا ایک نام ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار لوگ اور یہاں رکھ لئے تو بس ہو گیا ہمارا کام تو۔“

”مجھے ایک موقع اور دیں سر! میں پوری کوشش کروں گی کہ دوبارہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”ٹھیک ہے۔ دوبارہ شکایت ہوئی تو خود کو فارغ سمجھئے گا یہاں سے۔“

حتیٰ لہجے میں کہتے ہوئے اس شخص نے اس وقت اسے بھرپور ذلت کا احساس دلایا تھا۔ وہ آنسو پیتی وہاں سے چلی آئی۔

غلام محمد صاحب کی بیماری تھی کہ کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ادھر تایا کے پورشن میں آباد ہونے والے بزنس مین نے وہ حصہ گرا کر وہاں نئی عمارت کی تعمیر شرع کروا دی تھی۔ عباد پڑھائی چھوڑ بیٹھا تھا اور اجالا کے گھر سے نکلنے کے بعد ندا اور بسمہ کی تمام تر دلچسپی کا محور بننے لگا تھا۔ گھر میں آنے والے وہ ”ہیرو ٹائپ“ لڑکے ہوتے تھے جنہیں جانے کون سی مصیبت وہاں بزنس مین کے پاس کھینچ لاتی تھی۔

اس کا دماغ جیسے کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔ گھر کے اندر سکون رہا تھا، نہ گھر کے باہر۔ اب تو نماز میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اوپر سے ابتر حالات نے رہی سہی ہمت و حوصلہ بھی ختم کر چھوڑا۔

اس رات شدید تکلیف کے باوجود اس نے آنکھ کھلنے پر تہجد کی نماز کے بعد غلام محمد صاحب کو رو کر بچوں کی طرح گڑ گڑاتے ہوئے اللہ کے حضور دعا مانگتے دیکھا تو چپ نہ رہ سکی۔

”بس کرو ابا! اللہ کے پاس تجھ جیسے مفلس، معذور شخص کی دعائیں سننے کا وقت نہیں ہے۔ وہ انہی کی دعائیں سنتا ہے اور قبول کرتا ہے، جو اس کی راہ میں روپیہ لٹاتے ہیں۔ تیرے پاس کیا ہے جو وہ تجھ پر توجہ کرے؟“

”میرا ایمان۔“ جواب میں غلام محمد صاحب کے الفاظ نے اسے چپ کروا دیا۔

”کفر اور مایوسی دونوں تباہی کا نام ہیں اُجالا! شدید غم اور مصیبت میں بھی انسان کو اپنی اوقات اور اپنے رب کا مقام نہیں بھولنا چاہئے۔ کیونکہ اس در کے سوا دوسرا کوئی در نہیں جو کچھ دے سکے۔ ایک وہی ذات تو ہے بیٹا! جو بندے کو اس کے ظاہر سے نہیں، باطن سے پرکھتی ہے۔ وہ پاک و بے نیاز ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا کہ کون سوٹڈ بوٹڈ ہے اور کون کچڑ میں لپٹا ہے۔ وہاں اس کے حضور تو صرف عاجزی چلتی ہے۔“

دعا مکمل کرنے کے بعد نرم لفظوں میں اسے ڈپٹتے ہوئے انہوں نے اصلاح کی تھی۔ اُجالا دکھی دل کے ساتھ بنا مزید کچھ کہے چپ چاپ سو گئی۔

☆...☆...☆

”لائیں، پٹی بدل دوں آپ کی۔“ نانو، مصحف کے ساتھ ابھی مارکیٹ سے ایمان کے لئے ڈھیر ساری شاپنگ کر کے لوٹی تھیں جب وہ انہی کے سامنے، جلتی پر مزید تیل کا کام کرتے ہوئے مصحف کے قریب آکھڑی ہوئی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“ وہ جلا بیٹھا تھا۔ برسوں کے بعد ایمان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ضرورت کیوں نہیں ہے۔ آپ کی خدمت اور راحت تو میرا فرض ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر نانو سے کہو، آج سے تمہیں میرے کمرے میں سونے کی اجازت دیں۔“ وہ کہاں مات کھانے والا تھا۔

ایمان کی مسکراہٹ ایک پل میں معدوم ہو گئی۔

”نانو! چائے لاؤں آپ کے لئے؟“

”لے آؤ بیٹی! اگر چاہت سے بنائی ہے تو۔ میرا تو تھکن سے برا حال ہے۔“ وہ ساری چیزیں بکھیر کر بیٹھی تھیں۔ مصحف فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”سوچ سمجھ کر پیجئے گا۔ چائے پی کر اگلے جہاں پہنچ گئیں تو مجھے دوش مت

دیتے گا۔“

”لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ کبھی تو کوئی اچھی بات منہ سے نکال لیا کرو۔“  
 نانوں نے ڈرنے کے بجائے اسے ڈپٹا تھا۔ وہ منہ بنا کر کمرے میں چلا آیا۔  
 ”عجیب مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، اس مکار لڑکی کا کیا  
 کروں؟“ اُسے غصہ آ رہا تھا۔

اسی پل شہریار کی کال آ گئی۔

”صحفی یار! جلدی سے حمزہ کی طرف آ جا۔ ہم لوگ سینما جا رہے ہیں۔“

”میرا موڈ نہیں ہے یار!“

”موڈ بنتے دیر نہیں لگتی۔ تو آ تو سہی۔ آج بڑے مزے کا پروگرام طے کیا ہے  
 ہم نے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہاں آنے پر سمجھائیں گے۔ بس سمجھ لے، آج چاروں کے مزے  
 ہونے والے ہیں۔“

”پورے خلیث ہو تم لوگ۔“ وہ مسکرایا تھا۔ شہریار نے قہقہہ لگا کر کال کاٹ  
 دی تھی۔ نانو چائے پی رہی تھیں، جب وہ دوبارہ لاؤنج میں چلا آیا۔

”نانو! میں ذرا شہریار کی طرف جا رہا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔ لیٹ ہو  
 جاؤں گا۔ کوئی مسئلہ ہو جائے تو آپ فوری مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔“  
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔ آفس تو جا نہیں سکتے، اور کون سے  
 ضروری کام آن پڑے ہیں تمہاری جان پر؟“

”آ کر بتاؤں گا۔ ابھی لیٹ ہو رہا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا پلیز۔“ نانو کے  
 غصے کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے وہ رخصت ہو گیا تھا۔ ایمان اس کے جانے  
 کے بعد نانو کے پہلو میں ٹپک گئی۔

”مصحف کی باتوں کا برا نہ ماننا بیٹی! یہ ایسا ہی ہے، لا ابالی سا۔ تمہیں بنا دیکھے  
 بھالے نکاح نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خیر۔۔۔۔۔ اللہ خوش رکھے۔ اب یہاں تمہیں  
 کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔“ وہ ان کی تسلی کے جواب میں خاموش ہی بیٹھی رہی۔  
 کہتی بھی تو کیا، کچھ کہنے کے لئے تھا ہی نہیں۔

”آہستہ آہستہ تم یہاں کی ہر چیز سے آشنا ہو جاؤ گی، پھر زیادہ مسئلہ نہیں رہے  
 گا۔“

”میں اب بھی بہت خوش ہوں نانو!“ بالآخر اُسے لب کھولنے پڑے تھے۔



”اللہ اور خوش رکھے۔ یہ سب چیزیں سنبھال لو، میں اب ذرا آرام کروں گی۔“  
اسے دعا سے نوازتی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ایمان خالی نگاہوں سے صوفے پر پڑی چیزوں کو دیکھتی جانے کتنی دیر وہیں بیٹھی رہی۔ اگر اُس روز مصحف گیت نہ کھولتا تو کیا ہوتا؟۔۔۔۔۔ اگر اُسے گیت کھولنے میں مزید تاخیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

یہ تصور ہی ایسا تھا کہ وہ جی جان سے کانپ کر رہ جاتی تھی۔ بے شک اس کے رب نے اس کی عزت کی حفاظت کی تھی۔ صرف ایک انسان کے لئے اس نے پاگل پن کی ہر حد کو عبور کرتے ہوئے اپنے مہربان خدا کی خدائی سے منہ موڑ لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے اسے بے آسرا نہیں چھوڑا تھا۔  
آنسو تھے کہ تنہائی پاتے ہی اُمڈے چلے آرہے تھے۔ وہ وہیں بیٹھی جیسے پھر سے پتھر ہو گئی تھی۔

☆...☆...☆

”ابا! اُجالا کل سے فیکٹری نہیں جائے گی۔“

وہ اس وقت غلام محمد صاحب کے زخموں کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اب ان پر دوا لگا رہی تھی، جب عباد کمرے میں داخل ہو کر بگڑے تیوروں کے ساتھ بولا۔ اُجالا کے ہاتھ میں موجود پانی کا برتن ذرا سا لرزا تھا۔

”کیوں؟“ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا، جب وہ بولا۔  
”اپنے آپ سے پوچھ یہ سوال۔۔۔۔۔ جسے عیاشی کرتے حیا نہیں آئی۔“  
”کیسی عیاشی؟“ کوئی پہاڑ تھا جو اس لمحے اس پر گرا تھا۔  
”تجھے پتہ ہے، کس عیاشی کی بات کر رہا ہوں میں۔ کس کے ساتھ آئی تھی کل فیکٹری سے گھر؟“ وہ اس سے چھوٹا تھا، مگر اس کا لہجہ انتہائی گستاخانہ تھا۔  
اُجالا کو لگا، جیسے کسی نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہو۔ وہ اسے انتہائی حیران نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”میری دوست کا بھائی تھا۔ تم میں اس میں کوئی فرق نہیں ہے میرے لئے۔ کل میلاد تھا اس کے گھر، اس لئے زبردستی لے گئی تھی ساتھ۔ اللہ کے ذکر کا معاملہ تھا، کیا انکار کر دیتی میں اُسے، بول؟“ وہ چلائی تھی۔ ”روز دفتر

سے پیدل گھر آتی ہوں۔ تمہیں کبھی لانے کی توفیق ہوئی؟۔۔۔۔۔ اس کا گھر بھی دس میل دور نہ ہوتا تو اکیلی پیدل ہی آتی، سمجھے تم؟“

”بس کرو، یہ جھوٹے بہانے۔“

”جھوٹے پر اللہ کی لعنت۔ اور تم ہوتے کون ہو جسے میں اپنے ایمان اور کردار کی صفائیاں دیتی پھروں؟ اتنے ہی غیرت مند ہو تو کماؤ چار پیسے۔ کیوں سارا سارا دن آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں جب میں تم لوگوں کے لئے سارا سارا دن دھکے کھاتی، فیکٹریوں میں خوار ہوتی پھرتی ہوں اور تم یہاں آرام سے بیٹھے مفت کی روٹیاں دوڑتے ہو۔ آتے بڑے غیرت مند کہیں کے۔ روز پیدل دھکے کھاتی ہوں تو غیرت نہیں جاگتی۔ آج کسی نے ذرا سا احساس کر لیا تو خون رگوں میں اُبلنے لگا تمہارے۔ جب خود چار پیسے کمانے لگو، تب آکر رعب جمانا۔ دوبارہ ایسے لہجے میں بات کی تو زبان کھینچ لوں گی تمہاری۔“

وہ گرجی تھی اور جھوٹے الزام پر خوب برسی تھی۔ عباد بنا شرمندہ ہوئے راستے میں پڑی پیڑھی کو ٹھوکر مارتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

غلام محمد صاحب جو اب تک خاموش تھے، اُجالا کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ وہ بول اُٹھی۔

”کچھ مت کہنا ابا!۔۔۔۔۔ اللہ پاک کی ذات نہ چاہے تو پوری دنیا میں کوئی مجھے میرے بد ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ آپ تو جانتے ہیں، عورت شر پر اُتر آئے تو سیمنٹ پتھر سے بنی دیواریں بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ باپ، بھائیوں کی تو وقعت ہی کیا ہے۔“ وہ تلخ ہو رہی تھی۔

غلام محمد صاحب نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

گھر کا ماحول آج کل اس کی سمجھ سے باہر ہو رہا تھا۔ عباد کے ساتھ ساتھ باقی چاروں بہن بھائیوں کا رویہ بھی اس سے بدل گیا تھا۔ وہ سب ”آزادی“ کے متوالے تھے۔ مگر اُجالا ہر ممکن حد تک ان پر رعب جمائے ہوئے تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نفس کا بے لگام گھوڑا ایک بار قابو سے باہر ہو جائے تو بڑے بڑے ایمان والے قلابازیاں کھانے لگتے ہیں۔ پھر وہ چاروں تو ماں کی اچھی تربیت سے محروم، آزاد ماحول میں، خالہ کی پوری پوری حوصلہ افزائی کے

ساتھ پروان چڑھے تھے۔ وہ کیسے قابو آتے؟ نتیجتاً اُجالا کے ساتھ ان کی بول چال نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

وہ فیکٹری سے تھکی ہاری گھر آتی تو دونوں چھوٹی بہنیں سر جوڑے بیٹھی کھسر پھسر کرتی دکھائی دیتیں۔ جبکہ غلام محمد صاحب بیٹھک میں کرسی پر بیٹھے گاہکوں کے انتظار میں اکڑ جاتے۔ وہ جانتی تھیں، باپ بستر سے اٹھنے لائق نہیں ہے اور دونوں بھائیوں کو اپنی آوارگی سے فرصت نہیں تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنے باپ کے ان الفاظ پر رونا آ جاتا، جو انہوں نے بڑے فخر سے اپنے بچوں کے متعلق اپنے بڑے بھائی سے کہے تھے۔

حق حلال کے رزق سے پلنے کے باوجود وہ ”ہدایت“ کھو رہے تھے۔ اور ادھر اُجالا کے لئے منہ چڑھے دریا کے پانی کو روکنا محال ہو رہا تھا۔ ساتھ والے گھر میں ڈیرہ ڈالنے والے بزنس مین کی سرگرمیاں الگ سے پریشان کئے ہوئے تھیں۔ ایسے میں اسجد کا ساتھ بھی نہیں رہا تھا۔ پریشانی ہی پریشانی تھی۔

عباس اس رات گھر نہیں آیا تھا۔ شاید اس نے کمائی کے طعنے کو زیادہ ہی محسوس کر لیا تھا۔ اُجالا اب پچھتاوے کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے اتنا مشتعل نہیں ہونا چاہئے تھا۔

غلام محمد صاحب کو دوا دے کر سلانے کے بعد وہ پوری رات اس کے انتظار میں جاگتی رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ عباد کو اب کبھی لوٹ کر اس گھر میں آنا ہی نہیں تھا۔

☆...☆...☆

یار! یہ گھی سیدھی اُنکی سے نکلنے والا نہیں ہے۔“

تھکن سے چور بھرپور ”تفریح“ کے بعد وہ چاروں ہوٹل میں بیٹھے تھے، جب ایمان کے ذکر پر شہریار نے اپنی رائے پیش کی۔

”مجھے تو انتہائی ہوشیار اور کسی خطرناک گروپ سے تعلق رکھنے والی لڑکی لگتی ہے۔ تمہیں یوں گھر اور نانو کو اس کے سپرد چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”تم ہی نے مجبور کیا تھا مجھے۔ اب سوچو، اُس بلا کا کیا کرنا ہے؟“

”میرے دماغ میں ایک آئیڈیا ہے۔ اگر تم لوگ قبول کرو تو۔“ حمزہ اچانک بولا تھا۔

”کہو۔“ باقی تینوں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی۔

”یار! اس سے پہلے کہ یہ لڑکی تمہیں کسی بڑے نقصان سے دوچار کرے، تمہیں اس سے پیچھا چھڑا لینا چاہئے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ دیکھو، کل سڈے ہے۔ تم بہانے سے نانو کو لے کر گھر سے نکل جانا۔ پیچھے وہ اکیلی ہو گی تو میں، شہریار اور شاہ میر وہاں چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے اس کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہے گی کہ وہاں ٹھہر سکے۔ تمہارا نام بھی نہیں آئے گا اور مصیبت سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔“

”ہوں۔ آئیڈیا تو بہت زبردست ہے۔“ شہریار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ شاہ میر البتہ خاموش تھا۔

”میرا خیال ہے، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

”بھاڑ میں جھونکو ایسے خیال کو۔ کوئی بھی شریف گھرانے کی پاک باز لڑکی یوں دھڑلے سے کسی اجنبی کے گھر میں نہیں رہ سکتی، جبکہ اس گھر میں ایک عدد

جوان مرد بھی موجود ہو۔ وہ جس حالت میں ہم تک پہنچی تھی، اس کے بعد تو اس کی پارسائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ بالآخر اُسے حمزہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا تھا۔ شاہ میر البتہ کل کے لئے ایکسکیوز کرتا، مصروفیت کا بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ مصحف رات گئے گھر آیا تو وہ کچن میں مصروف تھی۔ شاید کچن سمیٹ رہی تھی۔ وہ کمرے میں جانے کے بجائے وہیں چلا آیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ ایمان نے قدموں کی آہٹ پر اس کی ہیلو سے قبل ہی پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ خانساماں کی چھٹی ہو گئی تھی اور ایمان نے پچھلے پانچ روز میں صرف نانو کے دل پر ہی نہیں، پورے گھر پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ سرد، سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ کتنی پُر اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔ مصحف مسکرا دیا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔۔۔“ کچھ ہاتھ لگا کہ نہیں اب تک؟“ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایمان اسے دیکھ کر رہ گئی۔



”آپ کے اس شاندار محل میں کوئی چیز اتنی قیمتی ہے ہی نہیں کہ جس کے لئے میں اپنے ایمان کا سودا کروں۔“ سمجھ میں نہ آنے والا جواب سننے کو ملا تھا۔

”او۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کسی بہت بڑی چیز پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ ہے آپ کا۔“

”جی ہاں۔“ وہ اب بھی لب بھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔ مصحف اس قدر صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔

”پھر تو ذلیل ہو کر ہی نکلنا پڑے گا یہاں سے۔ کیونکہ اس گھر کی ساری قیمتی چیزیں میں نے لا کر میں رکھوا دی ہیں۔“

”اچھا کیا۔ عزت اور ذلت تو صرف میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے سمیٹ لے اور جسے چاہے بکھیر کر رکھ دے۔“ یاسیت سے کہتی وہ سر جھکا کر آنسو چھپا گئی

تھی۔

”ماننا پڑے گا محترمہ! کہ آپ بہت بڑی فنکارہ ہیں۔“ پہلی بار وہ اسے فرصت سے دیکھ رہا تھا۔ ایمان کام سے ہاتھ روک کر عجیب پھسکی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلانے ہوئے کچن سے نکل آئی۔

”آپ کی ممنون ہوں کہ آپ کی مدد نے اللہ رب العزت کے کرم کے بعد مجھے بے مول ہونے سے بچا لیا۔“

”ہونہ۔۔۔۔۔ اتنی پارسا ہوتیں تو اپنے گھر بیٹھی ہوتیں۔ یہاں زبردستی گھس کر میری مجبوری سے فائدہ نہ اٹھاتیں۔“ وہ اس کی خود اعتمادی پر جل اٹھا۔ ایمان کے قدم نانو کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے رک گئے۔ وہ پلٹی تھی اور آنسوؤں سے بھری نگاہیں اس کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے عین اس کے مقابل آرکی تھی۔

”جن کے گھر نہ ہوں، کوئی رشتہ باقی نہ ہو، تقدیر، زمانہ، حالات، کچھ بھی مہربان نہ ہو، تو کیا وہ پارسا نہیں ہو سکتے؟“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ تم لاوارث ہو؟“

”ہاں۔“ مصحف کے طنز پر بڑی بے بسی سے سر جھکایا تھا اس نے۔ وہ ہنس دیا۔

”بہت خوب۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری اس جھوٹی کہانی میں آ جاؤں گا تو یہ تمہاری بہت بڑی بے وقوفی ہے۔“

”ٹھیک ہے، شب بخیر۔“ وہ بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔ مصحف نے زور سے دیوار پر مکا رسید کر کے اپنے اندر کا غصہ نکالا۔

☆...☆...☆

اگلے روز سنڈے تھا۔ اور وہ کل رات کی تھکن کے باعث خاصی تاخیر سے بیدار ہوا تھا۔ شاور لینے کے بعد فریش ہو کر نیچے آیا تو ایمان ناشتے کے بعد نانو کے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے مساج کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ کسی دینی مسئلے پر گفتگو بھی جاری تھی۔

”السلام علیکم!“ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ نانو کے بجائے جواب اس کی طرف سے آیا تھا۔ وہ وہیں صوفے پر ٹک گیا۔

”نانو! جلدی سے تیار ہو جائیں۔ اقصیٰ آنٹی کے گھر جانا ہے۔ کل سے فن پر فون آرہے ہیں ان کے۔“

”آنے دو۔ مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”او کم آن نانو! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں۔ میں خود ساری بات سنبھال لوں گا۔“

”اور پیچھے ایمان کے پاس کون رہے گا؟“

”اللہ ہے نا۔“ برجستگی میں اس نے کہا تھا۔ پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”ہم جلدی آ جائیں گے۔۔۔۔۔ ساتھ والی آنٹی بھی دو چکر تو ضرور لگائیں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ پھر یہ مرحلہ بھی سر کر ہی لیتے ہیں۔“ نانو کا اپنا ارادہ بھی تھا اقصیٰ کی طرف جانے کا لہذا وہ تیار ہو گئیں۔ مصحف نے گھر سے روانہ ہوتے وقت حمزہ کو کال کر کے پیچھے میدان خالی ہونے کا عندیہ دے دیا تھا۔

ایمان جو ان کے رخصت ہونے کے بعد، وضو کر کے قرآن پاک لے کر بیٹھ گئی تھی تھوڑی ہی دیر کے بعد گیٹ پر دستک کی آواز سن کر، ناچار اُٹھ گئی۔

ہر سنڈے کو گھر کے تمام ملازمین چھٹی کرتے تھے۔ لہذا گیٹ کھولنے کے لئے اسے ہی آنا پڑا۔

”کون۔۔۔۔؟“ اس روز کے بعد پہلی بار وہ گیٹ کے قریب آئی تھی، لہذا اطمینان ضروری تھا۔

”حمزہ۔ مصحف نے بھیجا ہے۔ اس کا موبائل یہیں کمرے میں رہ گیا ہے۔“  
جواب میں حمزہ کی آواز اور ”کی ہول“ سے اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے گیٹ کھولا تھا۔

”میں یہیں لا دیتی ہوں آپ کو۔۔۔۔۔ اس وقت گھر پر کوئی نہیں ہے۔“

”آپ تو ہیں۔“ حمزہ کی مسکراہٹ اُس کا دل دھڑکا گئی تھی۔ وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ شہریار بھی اسے سائیڈ پر ہٹا کر گھر کے اندر گھس آیا اور گیٹ لاک کر دیا۔

”ہم نے سوچا، اگر بنا نکاح کے آپ مصحف پر مہربان ہو سکتی ہیں تو ہم کیا برے ہیں۔“

کہنے کو وہ اس کے اسلامی بھائی تھے مگر ان کے چہروں پر رقصاں شیطانی مسکراہٹ لیٹروں کی سی تھی۔ وہ ان کے الفاظ پر ششدر ہی تو رہ گئی تھی۔  
”یہ کیا بکواس ہے؟“

”اندر کمرے میں چلو، پھر بتاتے ہیں۔“ حمزہ نے مزے سے کہتے ہوئے اس کا بازو پکڑا تھا۔ جواب میں وہ چلا اُٹھی۔

”ڈونٹ ٹچ می۔ اللہ کا قہر نازل ہو گا تم پر اگر تم برے ارادے سے میری طرف بڑھے تو۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ کیا ہو گا؟ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔“

وہ بے علم بھی تھے بے ہدایت بھی۔ ایمان رو پڑی۔ اس کی مشکلات اور آزمائشوں کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

☆...☆...☆

عباد گھر سے چلا گیا تھا اور ادھر اُجالا کے پچھتاوے تھے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ غلام عباس صاحب نے ایمان کے بدلے دنیا کی آسائشات حاصل کر لی تھیں۔ ایک شاندار گھر، گاڑی، بچوں کے لئے بہترین کالجوں میں تعلیم۔ سب کچھ ہی تو پا لیا تھا انہوں نے۔ اسجد کا خواب باہر جانے کا تھا۔ یہ خواب بھی اب پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ خوش تھے۔ زمین پر اکڑ کر چلنے لگے تھے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناموس کے بدلے، دس لاکھ روپے کی خطیر رقم نے رہا سہا پچھتاوا اور اُجھن بھی ختم کر ڈالی تھی۔ واقعی مذہب کیا دے رہا تھا اُنہیں؟۔۔۔۔۔ صرف سکون۔ اور بس؟

جیسے حالات سے وہ گزر رہے تھے، ان حالات میں انہیں ”سکون“ سے گزارہ ممکن نہیں تھا۔ لہذا حالات بدلے تو بتایا اور بتائی کے خیالات بھی بدل گئے۔

اب اسجد کے لئے اُجالا کا ساتھ اُنہیں کسی صورت منظور نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی وہ باہر جا رہا تھا۔ بیٹی الگ اعلیٰ کالج کی ”زینت“ بن گئی تھی۔ قمیض شلوار، دوپٹے کی جگہ اسکرٹ اور جینز نے لے لی تھی۔ چھوٹا ولید جو ابھی بمشکل اٹھارہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا، بری صحبت کا شکار ہو کر اس راستے کا ہمراہی ہو گیا کہ جس کی منزل سوائے دنیا اور آخرت کی تباہی کے اور کچھ نہیں تھی۔

حق اور ہدایت کے راستے سے گمراہی کے بعد وہ صرف ذلت سمیٹ رہے تھے۔ مگر ان کی آنکھوں پر بندھی گمراہی کی پٹی کے باعث یہ ذلت بھی انہیں کسی نعمت سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ تایا کے روابط بڑھ رہے تھے اور بتائی کی مصروفیات۔ اپنی دانست میں وہ پیتل پر سونے کا پانی چڑھا کر ہائی سوسائٹی کا حصہ بن گئے تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان سے کیسا عظیم نقصان سرزد ہو گیا تھا۔

ادھر اُجالا سے چھوٹی بسمہ اور ندا کے چکر، بتائی کے گھر بڑھ گئے تھے۔ غلام محمد صاحب تھے کہ بس خاموشی اور صبر سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ عباد کے بعد انہوں نے کئی بار اپنی دونوں چھوٹی بیٹیوں اور بیٹے کو سمجھانے اور آخرت کے



عذاب سے ڈرانے کی کوشش کی تھی، مگر دوسری نوجوان نسل کی طرح ان کے لئے بھی یہ سب کتابی باتیں تھیں۔ باپ کے دکھاوے کو وہ کسی وقت کی نماز پڑھ بھی لیتی تو دماغ میں دنیاوی نفع و نقصان کے خیالات ہی گردش کرتے تھے۔ وہاں نہ آخرت کی کوئی پروا تھی، نہ اللہ کی ناراضی کا خوف، نہ ہی معاشرے میں رسوائی کا کوئی خدشہ۔

ہر شے سے بے خبری و بے نیازی کی اس دنیا میں صرف راج تھا تو دل اور اس کی خواہشوں کا۔ باقی ہر چیز ان کے لئے جیسے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ تائی آج کل ندا کو اسجد کے خواب دکھا رہی تھیں۔ کیونکہ ندا ایک تو اس کی جانشین تھی، دوسرا وہ غلام محمد صاحب اور اُجالا کو رُلانا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اسجد باہر جانے کے

لاپچ میں کبھی بھی ان کے کسی فیصلے سے انحراف نہیں کرے گا، اس کے باوجود اس عورت نے ندا کی مدد سے ان دونوں کے لئے بڑا مضبوط جال تیار کر لیا تھا۔

بسمہ کے روابط ساتھ والے گھر میں مقیم چالیس سالہ عیاش بزنس مین سے بڑھ گئے تھے۔ اُجالا کی غیر موجودگی میں ندا کو بتا کر وہ سارا سارا دن وہیں گزارتی تھی۔ غلام محمد صاحب کو اُجالا خود صبح فیکٹری جانے سے پہلے بیٹھک میں بٹھا کر جاتی۔ اور گھر واپسی کے بعد وہی انہیں وہاں سے اٹھا کر لاتی۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ ان کی ناک تلے کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

اس دن اسجد کی انگلیڈ کے لئے روانگی تھی اور اُجالا کو فیکٹری سے جواب مل گیا تھا۔ اعصاب پہلے ہی قابو میں نہیں تھے کہ دل پر ایک اور بوجھ آ پڑا۔ بسمہ حسبِ معمول ساتھ والوں کے گھر پہنچی ہوئی تھی جبکہ ندا اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود تائی کے گھر سدھار گئی تھی۔ سعد کی کیا سرگرمیاں تھیں، اُجالا اس سے باخبر نہیں تھی۔

اس وقت غلام محمد صاحب کی طبیعت بگڑنے پر وہ شدید اشتعال میں ساتھ والے گھر آئی تھی تاکہ بسمہ کو تھپڑ لگاتے ہوئے وہاں سے واپس لاسکے۔ پچھلی پوری رات کی جاگی ہوئی تھی، اسی لئے سر بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کیسا منظر دیکھنے جا رہی ہے۔

ساتھ والے گھر کے اس شاندار کمرے میں بسمہ، بزنس مین سے چپک کر بیٹھی تھی اور وہ اس کے گال سہلاتے ہوئے اس پر اپنا پیار لٹا رہا تھا۔ وہ وہیں دہلیز پر ٹھٹک گئی۔ تبھی بزنس مین کی نظر اُس پر پڑی تھی۔

”ارے بڑی سالی صاحبہ آئی ہیں۔ خوش آمدید بھتی۔“ بسمہ کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔ جبکہ بزنس مین کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔ اُجالا کو لگا، وہ ہل بھی نہیں سکے گی۔

”اندر آئیں اُجالا صاحبہ! رُک کیوں گئیں؟“ وہ بچھا جا رہا تھا۔ بسمہ موقع سے فائدہ اٹھا کر چھپاک سے نکل آئی۔

”کتے، بے غیرت انسان! تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری بہن کے ساتھ اس حد تک جانے کی؟“ وہ آگ بگولا ہوئی تھی۔ بس نہ چلتا تھا کہ تھپڑ مار مار کر اس شخص کا چہرہ سرخ کر دیتی۔ تاہم وہ اس کی گالی پر بھی مسکرایا تھا۔

”بیوی ہے میری۔ ایک ہفتہ پہلے ہی رو رو کر نکاح کیا ہے اس نے میرے ساتھ۔ یقین نہ آئے تو جا کر پوچھ لیجئے۔“

”اس سے تو پوچھ ہی لوں گی، لیکن پہلے تمہارا بندوبست کروں گی جو تم نے گند بجھیر رکھا ہے یہاں پر۔“

”گند کہاں بکھیر رکھا ہے؟ میں تو دُکھی انسانیت کی خدمت کرتا ہوں۔ ٹوٹے دلوں کو ملاتا ہوں۔ نوجوان دلوں کو سرور حاصل کرنے کے لئے ماحول فراہم کرتا ہوں۔ خیر، آپ چاہیں تو آپ کے لئے بھی۔۔۔۔۔“

اس سے پہلے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی گستاخی کرتا، اُجالا کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا۔

ادھر اسجد، ندا کو چھوڑنے آیا تو بسمہ نے ندا کو ساری بات بتا دی اور وہ اسے تسلی دیتی، اسجد کا بازو تھام کر اسے برابر والے گھر میں لے آئی۔

اجالا کے لئے جو بدگمانی اس نے اور بتائی نے اسجد کے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، اس پر مہر لگانے کا موقع وقت سے پہلے ہی مل گیا تھا۔ اسجد کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ساری دنیا کے بھکنے کا یقین کر سکتا تھا مگر اُجالا کا نہیں۔ اور وہاں اس وقت اس کا یقین ٹوٹا تھا۔

تھپڑ کھا کر انگارہ بننے والے بزنس مین کی گرفت میں پھڑپھڑاتی اُجالا اُسے حقیقی معنوں میں بے موت مار گئی تھی۔ نہ کوئی سوال ہوا تھا، نہ کوئی وضاحت۔

چند لمحوں پہلے جس دہلیز پر وہ ٹھٹھکی تھی، اب اسی دہلیز پر اسجد پتھر بنا کھڑا تھا۔ وہ اسجد جو اس کی دنیا تھا، اس کا ایمان یقین تھا۔ اگلے چند لمحے جیسے طوفان کی نذر ہوئے تھے۔ اسجد کی وہاں آمد کے بعد بزنس مین نے اُجالا کی کلائی چھوڑ دی تھی، مگر تب تک وہ پلٹ گیا تھا۔ ٹوٹے مان، ٹوٹی خواہشوں کی کرچیوں کے ساتھ۔

وہ دن شاید اپنے آغاز سے اختتام تک اس کے لئے دکھ ہی دکھ سمیٹ کر لایا تھا۔ ایسے دکھ کہ جن کا سایہ شاید آنے والے اگلے کئی برسوں تک اس کی ہستی پر چھایا رہنا تھا۔ کتنی

کوشش کی تھی اس روز اس نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی، مگر اس کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے خوابوں کے ساتھ ساتھ ندا اور تانی ماں کے خواب بھی ادھورے رہ گئے تھے۔ کیونکہ اسجد نے اس روز کے بعد کسی کا سامنا ہی نہیں کیا تھا۔ وہ چپ چاپ خاموشی سے سمندر

پار سدھار گیا تھا۔ اجالا کے لئے اس کے بعد جیسے زندگی کا ہر منظر ہی پھیکا پڑ گیا۔

بسمہ نے اپنا راستہ خود چن لیا اور ندا کی شادی تانی نے زبردستی ولید سے کرا دی تھی، جو اس سے پورے تین سال چھوٹا تھا۔ شادی کے بعد اس کی عیاشیوں میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ صرف سعد تھا، جسے چپ لگ گئی تھی اور اُس نے درس جانا شروع کر دیا تھا۔

عباد، ندا اور بسمہ کے بعد غلام محمد صاحب ہر وقت روتے ہی رہتے تھے۔ ان کا کوڑھ آرام پا رہا تھا۔ بنا کسی علاج، کسی دوا کے وہ صحت یاب ہو گئے تھے۔ مگر دل کے اندر جو زخم لگ گئے تھے، اب وہ رس رہے تھے۔ گو اللہ نے ان کے بچوں کے ایمان کی حفاظت کی تھی، وہ بھٹک گئے تھے مگر دنیا و آخرت کی نجات ان پر حرام نہیں ہوئی تھی۔ وہ اللہ کی قائم کردہ حدود کے دائرے سے باہر نہیں نکلے تھے، اس کے باوجود غلام محمد صاحب کی شرمندگی تھی کہ اپنے مالک کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہوئے کم نہیں ہوتی تھی۔

اُجالا خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھتی اور رو پڑتی۔ اس کا اپنا ہی دکھ تھا۔  
فیکٹری سے جواب کے بعد اسے ایک سیٹھ کے گھر پر باورچی کی جاب مل گئی  
تھی۔ بھرا پرا گھرانہ تھا اور لوگ قدر دان تھے۔ لہذا خود کو بہلانے کے لئے یہ  
مصروفیت اس کی ضرورت بن گئی تھی۔

چار سال اس نے اللہ سے دُور سکون کی تلاش میں گزار دیئے تھے مگر سکون  
تھا کہ ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ چار سال بعد بھی اسے عباد کا پتہ چلا تھا، نہ اسجد کا۔ تایا  
کے دیگر گھرانے سے اس کا رابطہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ سعد کی  
شادی ہو گئی اور اس نے مقامی مسجد میں اپنے دادا، عبداللہ صاحب کے منصب  
پر امامت شروع کر دی۔ اُجالا کا زیادہ وقت غلام محمد صاحب کے ساتھ ہی بسر  
ہونے لگا تھا۔

انہی دنوں عباد کا سراغ لگ گیا۔ وہ سعودیہ میں تھا اور بہت اچھی زندگی گزار  
رہا تھا۔ پاکستان میں اپنے گھر کے تمام حالات سے بے خبر۔ اس نے بڑی چاہ  
سے اپنے باپ کو اپنے پاس بلایا تھا اور انہیں عمرہ کے ساتھ ساتھ حج کروانے  
کے عزم کا اظہار کیا تھا۔

غلام محمد صاحب کے ساتھ ساتھ اُجالا بھی بے حد خوش تھی۔ کیونکہ اس نے اُجالا  
کے لئے بہت اچھے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تمام تر کامیابیوں کا  
سہرا اس کے سر باندھا تھا۔ وہی تھی، جس نے اسے کچھ کرنے پر اُکسایا تھا۔  
ورنہ پاکستان میں رہتے ہوئے وہ جن سرگرمیوں میں پڑا تھا، وہ سرگرمیاں  
اُسے تباہ و برباد کر ڈالتیں۔

بیٹے کی خواہش پر اپنے مالک کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے غلام محمد  
صاحب سعودیہ روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے ویزے اور ٹکٹ کے تمام پیسے عباد  
پہلے ہی بھجوا چکا تھا۔ یہ اس سے اگلے ہی روز کی بات تھی کہ اُجالا کے ساتھ وہ  
حادثہ پیش آ گیا۔ وہ بھیانک حادثہ کہ جس نے اس کے لئے زندگی کے معنی ہی  
بدل کر رکھ دیئے تھے۔

☆...☆...☆

وہ نانو کے ساتھ گھر سے نکل تو آیا تھا، مگر اب اس کا ضمیر اسے بے چین کر  
رہا تھا۔ یہ محبت تھی، نہ کسی قسم کا کوئی احساس۔ بس ایک عجیب سی بے چینی  
تھی کہ شاید اسے اس لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ جو بھی تھی،



جیسی بھی تھی، یا اس کے جو بھی عزائم تھی، اسے پناہ دے کر پھر خود ہی اس کی عزت پر حملے کے لئے اپنے دوستوں کو اجازت نہیں دینی چاہئے تھی۔

نانو، اقصیٰ آنٹی سے مصروف تھیں اور اس کے ذہن میں مختلف تصورات آ رہے تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس سے رہا نہ گیا تو بے قرار سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

”اوکے نانو! میں چلتا ہوں۔ بازار میں کچھ کام ہے۔ آپ کو جب جانا ہو، کال کر کے بلوا لیجئے گا۔ میں آ جاؤں گا۔“

”ارے بیٹھو نا بیٹا! میں کھانا لگوا رہی ہوں۔“ اقصیٰ آنٹی فوراً اُٹھی تھیں۔ وہ ایکسکیوز کر گیا۔

”نہیں آنٹی! پھر سہی۔ ابھی بہت ضروری کام ہے۔“

کہتے ہی اس نے پاکٹ سے سیل نکال کر حمزہ کا نمبر ملایا مگر وہ رسپانڈ نہیں دے رہا تھا۔ تبھی اس نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے شہریار کو کال ملائی مگر

دوسری طرف بیل جاتی رہی، کسی نے کال ریسیدو نہیں کی۔ اس کا اضطراب اور پریشانی مزید بڑھی تھی۔

دوسری جانب شہریار نے ایمان کا دوپٹہ کھینچ لیا تھا۔

”اتنی پارسا نہیں ہو تم، جتنا خود کو پوز کر رہی ہو۔“ وہ طنز کر رہا تھا۔

ایمان کی نگاہیں اوپر چھت کی طرف اُٹھیں اور وہ رو پڑی۔ ایک مرتبہ پھر اُس کا کردار داؤ پر لگ رہا تھا۔ ایک امرتبہ پھر اسے عام سی گناہ گار لڑکی ہوتے ہوئے اپنی پارسائی کے لئے اپنے رب کو پکارنا پڑا تھا۔ اس رب کو کہ جس کے حقوق صرف ایک بدبودار مٹی سے بنے عام سے انسان کی محبت اور چاہ میں پاگل ہو کر وہ کب کے پس پشت ڈال چکی تھی۔

وہ بھاگی تھی اور حمزہ کے پاؤں اڑانے کے باعث اُلجھ کر اوندھے منہ زمین پر آ پڑی تھی۔

”بہت ہو گیا ڈرامہ۔ اب دیکھتے ہیں، کیسے نہیں نکلتیں تم یہاں سے۔“ غرا کر کہتے ہوئے حمزہ نے اس کے بال کھینچ لئے تھے جبکہ شہریار کا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر جما تھا۔ دو طاقت ور مردوں کے مقابلے میں اس کی رہی سہی ہمت

بھی جواب دے گئی تھی۔ قریب تھا کہ اس کا دل غم کی شدت سے پھٹ جاتا کہ اسی پل گیٹ پر زوردار دستک ہوئی۔ شہریار اور حمزہ دونوں ہی اس غیر متوقع دستک پر چونکے تھے۔ پھر شہریار، حمزہ کو تسلی دیتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھ آیا۔ یہی وہ موقع تھا، جب ایمان نے حمزہ کو ذرا سا غافل پا کر دھکا دیا اور اس کے سنبھلنے سے قبل ہی وہاں لاؤنج میں رکھا ڈیکوریشن پیس اٹھا کر اسے دے مارا۔ حمزہ کے سر پر ضرب پڑی اور وہ تڑپ اٹھا تھا۔

ایمان بنا ایک لمحے کی تاخیر کئے بھاگی اور خود کو مصحف کے کمرے میں قید کر لیا۔ اس کا دل اس وقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مصحف نے مذاق میں کہا تھا۔ ”اللہ ہے نا۔“ اور اللہ نے حقیقت میں اس کی مدد کر کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ہے۔ اپنے پکارنے والوں کے لئے ان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ صرف ایک لمحے میں بازی پلٹ گئی تھی۔

شہریار نے گیٹ کھول کر باہر دیکھا تو وہاں دور دور تک کسی ذی روح کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ہوا بھی نہ چل رہی تھی کہ وہ اسے ہوا کی دستک ہی

سمجھ لیتا۔ حیران و پریشان وہ گیٹ بند کر کے واپس آیا تو سامنے حمزہ اپنا پھٹا سر پکڑے ایمان کو گالیاں دے رہا تھا۔

مصحف فل اسپید کے ساتھ گاڑی دوڑا کر گھر تک پہنچا تو شکست خوردہ سا شہریار، حمزہ کو سہارا دے کر اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا رہا تھا۔ ”کیا ہوا؟“ وہ متوحش سا گاڑی سے باہر نکل آیا۔

”کچھ نہیں یار! بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں۔“

شہریار کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اندر چلا آیا۔ لاؤنج میں ٹیلی فون سیٹ کے قریب ایمان کا دوپٹہ پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اس کا دوپٹہ اٹھایا اور پھر اسے تلاشاً شرع کر دیا۔ وہ نیچے کہیں نہیں تھی۔ تب وہ اسے صدا دیتا اوپر کے پورشن کی طرف آیا تھا۔ اور سب سے پہلے اپنے ہی کمرے کے دروازے کو چیک کیا تھا۔ وہ اندر سے لاک تھا۔ اسے قدرے تسلی ہوئی۔

”ایمان!“ صدا لگانے کے ساتھ ہی اس نے دروازہ ناک بھی کیا تھا۔ تاہم اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

”ایمان پلیر! دروازہ کھولو۔ میں مصحف ہوں۔ مصحف۔“ وہ بار بار صدا لگا رہا تھا۔  
مگر وہاں ہنوز کوئی جواب نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تو پھر میں دروازہ توڑ رہا ہوں۔“

اس بار دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ روتی ہوئی باہر آئی تھی۔ مصحف نے ایک شرمندہ سی نگاہ اس پر ڈالی، پھر رخ پھیر گیا۔

”سب ٹھیک ہے نا؟“ جانے کس منہ سے اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ منہ چھپائے روتی رہی۔

”یہ دوپٹہ پکڑو۔ میں پانی لے کر آتا ہوں۔“ وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ ایمان نے روتے ہوئے دوپٹہ خود پر پھیلا لیا۔ وہ پانی لے کر آیا تو وہ بمشکل دو گھونٹ بھر سکی۔

”تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہوں۔“

”تھینک گاڈ!“ جانے کیوں بے ساختہ اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”آئی ایم سوری۔ شاید مجھے تمہاری طرف سے لاپرواہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ بہر حال

نانو سے اس بات کا ذکر مت کرنا، پلیز۔“ وہ التجا کر رہا تھا۔ ایمان جیسے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ساری کہانی جان گئی۔

”آپ اچھے ہیں مصحف صاحب!۔۔۔۔۔ مگر آپ کے دوست اچھے نہیں ہیں۔“

اگلے ہی پل وہ اسے دیکھتے ہوئے آنسو پونچھ گئی۔ مصحف سر اٹھا کر اسے دیکھ

بھی نہ سکا۔

”مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مگر۔۔۔۔۔ میں  
یہاں قطعی کسی خاص مقصد کے لئے نہیں آئی۔ میں تو مشکل میں پھنسی تھی اور  
اللہ نے اپنی رحمت سے آپ کو میرا مددگار بنا دیا۔ آپ نہ ہوتے تو شاید وہ  
پاک و بے نیاز کسی اور وسیلے سے میری حفاظت فرما دیتا، جیسے آج اس نے  
اپنی رحمت سے میری گناہ گار ذات کو محفوظ رکھا۔ بہر حال میں آپ کی احسان  
مند ہوں۔ مگر۔۔۔۔۔ آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوں۔“ وہ آج پہلی بار اس  
پر کچھ واضح کر رہی تھی۔ مصحف اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

”فی الحال میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کچھ وقت کے بعد ہو سکتا ہے، میں یہاں سے چلی جاؤں۔ تب تک نانو جو بھی سمجھیں، آپ کے لئے میں اس گھر کی معمولی ملازمہ کی حیثیت سے رہوں گی۔ اتنا اعتبار تو آپ کر ہی سکتے ہیں مجھ پر۔“

اسے پانی میں بھگو بھگو کر مارنا آتا تھا۔ مصحف لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلا کر واپس پلٹ گیا۔ اس رات نہ جانے کیوں وہ پوری رات نہیں سو سکا تھا۔ دل و اعصاب پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔

اگلے روز وہ حمزہ اور شہریار سے اُلجھ پڑا۔

”میں نے کہا تھا نا، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اب ہو گیا شوق پورا؟“

”نہیں۔ اُس مکار اسٹوڈنٹ لڑکی کو سبق سکھا کر رہوں گا میں۔“ سر پر پیٹی باندھے وہ مشتعل ہوا تھا۔ مصحف کا پارہ چڑھ گیا۔

”خبردار! اب دوبارہ تمہارے دماغ میں ایسا کوئی شیطانی خیال آیا تو۔ پہلے ہی نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے تم لوگوں نے مجھے۔“

”کیوں، تمہارا کیا معاشرہ چل پڑا ہے اس سے جو نظریں ملانے کی نوبت آ گئی؟“

”جسٹ شٹ اپ حمزہ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”واہ۔۔۔ نو سو چوہے کھا کر بلی کو انسانیت یاد آئے گی۔ اس وقت کہاں تھی یہ انسانیت جب تجھے خوش کرانے کے لئے ہم گھنٹوں خوار ہو کر کالجز اور یونیورسٹیز کے دھکے کھاتے تھے۔“ وہ جلا بیٹھا تھا۔ مصحف مشتعل سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جتانے کا بہت شکریہ۔ آج کے بعد تمہیں میرے لئے ایسی خواری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بہر حال، دوبارہ میرے گھر آؤ تو اس لڑکی کو اپنی بہن سمجھ کر آنا، وگرنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ شہریار نے بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹکتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

پچھلے چھبیس سالوں میں پہلی بار وہ اپنے دوستوں سے لڑا تھا۔ اور ایک ایسی لڑکی کے لئے لڑا تھا جسے وہ ٹھیک سے جانتا بھی نہیں تھا۔ اسے یاد نہیں تھا، مگر نانو بتاتی تھیں کہ وہ



صرف ایک سال کا تھا، جب اس کی ماں اسے نانو کی گود میں ڈال کر چلی گئی تھی۔ نانو بزنس وین تھیں، اکلوتی لاڈلی بیٹی کی ہٹ دھرمی پر اس کی شادی کے بعد قطع تعلق کے باوجود، جب وہ طلاق لے کر ان کے پاس آئی تو وہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال نہ سکیں۔ بعد ازاں ان کی بیٹی نے دوسری شادی کر لی اور ملک سے باہر اپنی نئی زندگی میں کھو گئی۔

چھوٹا مصحف، نانو کی ذمہ داری بن گیا۔ پہلے پہل انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعد ازاں وہ اس کے ننھے سے وجود کی عادی ہوتی چلی گئیں۔ کہتے ہیں، اصل مال سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ انہیں بھی نواسہ پا کر بیٹی بھول گئی تھی۔ وہ بیٹی کہ جسے صرف اپنی زندگی، اپنی خوشیوں سے غرض تھی۔ مصحف پانچ سال کا ہوا تو وہ اسے اپنے ساتھ فیکٹری لے جانا شروع ہو گئیں۔ بی اے تک وہ ان کے ساتھ کالج کے بعد فیکٹری جاتا رہا۔ بعد ازاں ہائی اسٹڈی کے لئے وہ باہر گیا تو اس نے فیکٹری جانا چھوڑ دیا۔ پھر نانو کا بھی دل نہ لگا اور یوں وہ سب کچھ مینجر پر ڈال کر گھر کی ہو رہیں۔ مصحف دو سال کے بعد واپس آیا تو جیسے وہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔

ان کے گھر میں مصحف اور اس کے بچپن کے تین دوستوں حمزہ، شہریار اور شاہ میر کے دم سے ہی رونق تھی۔ چاروں بلا کے شریر، نکتے تھے۔ شہریار کا ذاتی بزنس تھا، جبکہ حمزہ کہیں جاب کرتا تھا۔ البتہ شاہ میر ابھی بے روزگار ہی تھا۔ ادھر مصحف ساری ذمہ داری نانو اور ان کے پُر اعتماد ملازمین پر ڈال کر خود عیش کر رہا تھا۔

زندگی میں کسی بھی رشتے کو قریب نہ پا کر اس کی ذت اس آزاد بیل کی مانند پروان چڑھی تھی، جس کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ اسے بھی رشتوں کی نزاکت و حرمت کا پتہ تھا، نہ زندگی کے صحیح چال چلن کا۔ نماز، قرآن سے اس کا واسطہ اتنا ہی تھا جتنا کسی بھی آزاد گھرانے کے بچوں یا افراد کا ہوتا ہے۔ دو سال لندن میں قیام کے دوران اس نے جی بھر کر آزادی کے مزے لوٹے تھے۔ کوئی ایسا گناہ نہیں تھا، جو اس نے دو سالوں میں کھلم کھلم نہ کیا ہو۔ تاہم پاکستان واپسی کے بعد وہ ذرا سا محتاط ہو گیا تھا۔ اپنی خوشی یا عیاشی کے لئے پنی بے حد پیاری نانو کو کسی بھی دکھ سے دوچار کرنا اسے کسی صورت گوارا نہیں

تھا۔ عجیب بے خود سی زندگی تھی، جس میں کہیں کسی نفع و نقصان کا خیال  
تک نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

نانو، اقصیٰ آٹٹی کا دل صاف کرنے کے بعد ان دونوں کی شادی کا باقاعدہ اعلان کرنے کی تیاری کر رہی تھیں اور ایمان یہاں آ کر بری پھنسی تھی۔ اسے مصحف سے بات کرنی تھی۔ اس روز وہ تمھکن سے چور، اُلجھا اُلجھا سا گھر پہنچا تو ایمان، نانو کو کھانا کھلا رہی تھی۔ وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرتا، اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہیں لاؤنج میں صوفے پر ٹی وی چلا کر لیٹ گیا۔

وہ چونکا تھا۔ پھر گردن پھیر کر ایمان کو دیکھتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

”جی فرمائیے۔“

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو چائے لے آؤں؟“

”نہیں شکریہ۔“

“دودھ؟”

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ پلیر، سو جائیں آپ جا کر۔ مجھے جو چیز چاہئے ہو گی، میں خود لے لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔“ بالآخر وہ اصل مدعا ہونٹوں پر لے آئی تھی۔ مصحف پاؤں زمین پر ٹکا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”کہئے۔“

”وہ۔۔۔۔۔۔ نانو ایک دو روز میں ہماری۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی اور  
میری شادی کا باقاعدہ اعلان کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ آپ پلیز ان سے  
بات کر کے

انہیں روک دیں۔“

”کیوں روک دوں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کی گھڑی ہوئی کہانی  
سچ ہونے جا رہی ہے۔“

”میں نے آپ کو پس منظر بتا دیا تھا۔“

”سو واٹ؟ پلاٹ آپ کا تھا، اس کی وضاحت بھی آپ ہی کریں گی۔ نانو کو میری کسی بات کا اعتبار نہیں ہے اب۔“ وہ اس کی مدد کرنے سے صاف مکر گیا تھا۔ ایمان بے بسی سے لب کچل کر رہ گئی۔

فی الحال اُس میں نانو کو سچ بتا کر ان کی ناراضی مول لینے کی ہمت نہیں تھی۔ اور ادھر وہ جیسے ہتھیلی پر سروسوں جمائے بیٹھی تھیں۔ بنا ایمان سے مشورہ کئے، وہ اس کی فرضی کہانی کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے بے تاب تھیں۔ ایمان کا دل چاہا، وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ مگر بھاگ کر جاتی تو کہاں جاتی؟ اب تو کوئی در بھی ایسا نہیں رہ گیا تھا، جو اسے پناہ دے دیتا۔

عجیب بے بسی اور خاموش دعائیں تھیں۔ ادھر مصحف یوں چپ سادھے ہوئے تھا، جیسے یہ اس کا نہیں کسی اور کا معاملہ ہو۔ اسے اب اس پر غصہ آ رہا تھا۔ جبکہ وہ بے نیاز تھا، اپنے دوستوں کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کی ٹینشن ذہن سے جھٹکنے کے لئے بنا نانو کے مجبور کئے، فیکٹری جانا شروع ہو گیا تھا۔ ایمان چاہنے کے باوجود اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع دوبارہ نہ پاسکی۔

☆...☆...☆

اس روز نانو نے اسے زبردستی مصحف کے ساتھ شاپنگ کے لئے مارکیٹ بھیجا تھا۔ تقریباً آدھا راستہ دونوں خاموش رہے تھے۔ تب ایمان نے ہی بولنے میں پہل کی۔

”آپ اپنے دوستوں سے ناراضی کی وجہ سے اپ سیٹ ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کر رہا تھا۔

”مگر۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دوستوں کی وجہ سے اپ سیٹ ہیں۔ اور آپ یقین کیجئے، میں اس کے لئے بہت افسردہ ہوں، میری وجہ سے آپ کو۔۔۔۔۔“

”اس موضوع کے علاوہ کوئی بات نہیں کر سکتیں تم؟“ اس کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے وہ اس پر برہم ہوا تھا۔ ایمان اسے دیکھ کر رہ گئی۔

باقی کا راستہ پھر خاموشی کی نذر ہو گیا۔ اگلے دس منٹ میں گاڑی ایک شان دار جیولر شاپ کے سامنے رکی تھی۔

”آؤ۔“ گاڑی سائیڈ پر کھڑی کرنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں خریدنا۔ نانو حقیقت سے بے خبر ہیں، آپ تو نہیں۔“ وہ جھجکی تھی۔ تب ہی وہ پھر الٹ پڑا۔

”تم آتی ہو کہ میں کھینچ کر باہر نکالوں؟“ اور وہ اس کے انداز پر حیران رہ گئی تھی تاہم بولی کچھ نہیں۔

وہ اس کے لئے اپنی مرضی سے جیولری پسند کر رہا تھا۔ ڈائمنگ رنگ، بریسلٹ، ایئر رینگز، لاکٹ سیٹ، جانے کیا کیا۔ وہ بس خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے بہانے اپنی کسی گرل فرینڈ کے لئے وہ سب خرید رہا ہے۔ تاہم اسے اس کے ارادوں کی خبر نہیں تھی۔

”اپنا بایاں ہاتھ ادھر کرو۔“ ڈائمنڈ رنگ پر نظریں جمائے نیا حکم جاری کیا تھا اس نے۔ ایمان نہ چاہتے ہوئے بھی حکم کی تعمیل کر گئی۔ تب اس نے رنگ اسے پہنا کے چیک کی، پھر بل پے کر کے اس سے یکسر لا تعلق نظر آتا شاپ سے باہر نکل آیا۔ وہ آج کل اتنا مصروف اور سنجیدہ ہو گیا تھا کہ ایمان لاکھ کوشش کے باوجود اس سے کوئی بات نہ کر پاتی تھی۔ اس روز اس نے باتوں ہی باتوں میں نانو کو اپنا بیک گراؤنڈ بتایا تھا اور وہ چونک گئی تھیں۔

”کیا ہوا نانو؟“

”کچھ نہیں۔“ اُس کی حیرانی پر وہ اپنی پریشانی چھپا گئی تھیں۔ اور رات میں جب مصحف گھر واپس آیا تو اس نے نانو کو اُٹھ کر اس کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ شاید وہ اس کے بارے میں جان کر پریشان ہو گئی تھیں اور اب مصحف سے اس فرضی تعلق کا اختتام چاہتی تھیں۔ کتنی خوشگوار سوچ تھی یہ کہ وہ کسی نئے امتحان میں نہیں پڑے گی۔ آج نہیں تو کل ضرور اس کی واپسی کا کوئی راستہ نکل آئے گا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وہاں مصحف کیا طے کئے بیٹھا تھا۔ اس کے ارادوں کی خبر اسے عین تقریب والے روز ہوئی تھی، جب اس کے بخار کی پروا کئے بغیر اسے نہ صرف باقاعدہ دُلوہن بنایا گیا بلکہ مصحف نے چالاکئی سے دوبارہ نکاح کی پیخ بھی اڑا دی۔ نانو سے اس نے یہ ہی کہا تھا کہ وہ شادی کی پوری رسم کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ پہلے نکاح کی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رہی۔



وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی، نانو کو سب کچھ سچ سچ بتا کر اس جھنجٹ سے نکلنا چاہتی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔ اتنے مہمانوں کے بیچ وہ جیسے پنجرے میں قید چڑیا کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ لوگوں کے بیچ پھر تماشا لگا تھا اس کا اور۔۔۔۔۔ وہ پھر ہار گئی تھی۔

نانو خوش تھیں، مصحف کا اسے پتہ نہیں تھا۔ تاہم نکاح کے بعد یوں ہی اچانک اس کی نظر اٹھی تو وہ اسے حمزہ، شہریار اور شاہ میر کے درمیان خوشگوار موڈ میں کھڑے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ یہ کیسا کھیل کھیلا تھا اس نے کہ اپنا نام دے کر اس کی عزت کے لیٹروں کے ساتھ صلح کر لی تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ کاش! اس موقع پر اس کے بابا اس کے پاس ہوتے تو وہ ان سے ضرور کہتی۔

”ابا! دیکھئے۔۔۔۔۔ اللہ نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے۔“

مگر وہ اس کے پاس ہی تو نہیں تھے۔ اس کا کوئی بھی اپنا اس کے پاس نہیں تھا۔ تب ہی وہ بلک بلک کر رونا شروع ہو گئی تھی۔ نانو جو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں، اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر رہ گئیں۔ خود مصحف گھبرا کر اس

کے پاس چلا آیا تھا۔ دونوں کو ہی اس کے یوں شدت سے رونے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے، بچی گھبرا گئی ہے۔“ نانو روہانسی ہو رہی تھیں۔ مصحف نے اس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔

”آپ اسے کمرے میں لے جائیں نانو!۔۔۔ میں کھانے وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔“ وہ شاید اس کے یوں اچانک رونے کی وجہ سمجھ گیا تھا۔

نانو، رشتہ دار خواتین کی مدد سے اسے مصحف کے فل ڈیکوریٹڈ کمرے میں لے آئیں، جسے تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے دوست سجا کر گئے تھے۔

”میرا خیال ہے، وہ ہمیں یہاں دیکھ کر ہرٹ ہوئی ہیں۔“ حمزہ نے اس کے جانے کے بعد سب سے پہلے رائے پیش کی تھی۔ شہریار اور شاہ میر نے بھی اس کی تائید کی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ ابھی وہ جانتی نہیں ہے نا کہ تم لوگ سالے بن گئے ہو۔“ وہ مسکرایا تھا۔ جواب میں تینوں نے مسکرا کر اُسے ایک ایک مکا رسید کیا۔

رات گئے تمھن سے چور وہ کمرے میں آیا تو ایمان چپ چپ سی گلاس ونڈو میں کھڑی جانے باہر کیا تلاش کر رہی تھی۔ وہ کمرہ لاک کرتا کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

”السلام علیکم!“

وہ چونکی تھی اور پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے پھر آزدہ ہو گئی۔

”میرا خیال ہے، تم وہاں آسمان پر وہ ستارہ تلاش کر رہی ہو، جسے مجھے توڑ کر لانا ہو گا۔“ وہ مسکرایا تھا۔ سچی خوشی اس کے خوب صورت چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ تب ہی وہ پھر رو پڑی۔

”کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا؟“ آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

”کیا، کیا میں نے؟ پوری عزت اور مان کے ساتھ اپنا نام ہی تو دیا ہے۔“

”یہ جانے بغیر کہ میں کون ہوں، کیا ہوں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ سب کچھ جان کر ہی کیا ہے، البتہ تم نہیں جانتیں کہ جس فیکٹری میں تم کئی سال کام کرتی رہی تھیں، وہ میری ہی ہے۔“

”واٹ؟“ وہ واقعی حیران رہ گئی تھی۔ وہ اسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر لے آیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ یقین نہ آئے تو صبح ساتھ چلنا۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ ایمان نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیئے۔

”میں یہ سب نہیں چاہتی تھی۔“ وہ اب اضطراب کا شکار تھی۔

”کیوں؟۔۔۔۔۔ تم یہ چاہتی تھیں کہ نانو نکاح کے بغیر ہمیں ایک کمرے میں گھسا دیتیں اور پھر۔۔۔۔۔“ اُس نے دانستہ لب دبائے تھے۔ وہ بے قرار سی اس کے پہلو سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایسا کچھ نہیں چاہا میں نے۔ صرف پناہ چاہتی تھی آپ سے۔ اور کچھ نہیں۔“

”چلو، پناہ کے ساتھ ساتھ پیار، محبت، عزت، تحفظ اور بہت کچھ بھی مل گیا تو کیا ہوا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔“

”مگر میں خوش نہیں ہوں۔“ فوراً وہ دھاڑی تھی۔ ”کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتی

میں آپ کے ساتھ۔ کیونکہ میں۔۔۔۔۔ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔“ اس نے

کہتے ہی رخ پھیر لیا تھا۔ ادھر مصحف کا چہرہ پل میں تاریک ہو گیا۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“

”بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ میں اسجد کو چاہتی ہوں۔ اس اسجد کو، جو میرا بچپن کا ساتھی ہے۔ جس سے میرے دکھ اور سکھ سانجھے ہیں، جو صرف میرے لئے ہے، صرف میرے لئے۔“ وہ بول رہی تھی، مگر مصحف کو لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر رہا ہے۔ اس میں مزید کچھ سننے کی ہمت نہیں تھی۔ لہذا لب بھیج کر ضبط کا مظاہرہ کرتا وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

ایمان اس کے جانے کے بعد تھکی تھکی سی بیڈ پر آ بیٹھی۔ اسے وہ سب ایک خواب لگ رہا تھا۔ بھیانک خواب۔ جانے اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا تھا۔ اُجالا سے ایمان بن کر بھی وہ زندگی کی آزمائشوں سے دامن نہیں چھڑا سکی تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا، اس روز خرابی طبیعت کے باوجود وہ کام پر جانے کے لئے اُٹھی تھی۔ کیونکہ سیٹھ کے گھر مہمان آنے تھے اور اسے ان کے لئے بہت سی ڈشز کا اہتمام کرنا تھا۔ بھابی نے اسے منع کیا تھا۔ خود سعد بھی اس کی جاب

کے حق میں نہیں تھا۔ مگر وہ اس کی تسلی کے لئے پردے میں آتی جاتی تھی۔ محلے والوں کی اس کے لئے مختلف رائے تھی۔

کوئی اس کی تعریف کرتا تھا کہ اس نے مشکل وقت میں گھر کو سہارا دیا تو کوئی اس کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتا کہ اس کا کردار صحیح نہیں۔ حالانکہ اس نے ہمیشہ محتاط زندگی گزاری تھی۔ فیکٹری جانے کے علاوہ کبھی بلا ضرورت گھر سے باہر قدم نہ نکالا۔ فیکٹری میں کام کے دوران بھی سب کے ساتھ اس کا رویہ لیا دیا سا ہی ہوتا تھا۔ اس کے باوجود دنیا اس سے خوش نہیں تھی۔ مگر اسے اب دنیا کے خوش ہونے نہ ہونے سے فرق بھی کہاں پڑتا تھا۔

اسجد کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد اس کے لئے جیسے ہر چیز بے معنی ہو گئی تھی۔ اس روز خراب طبیعت کے باوجود وہ گھر سے نکل آئی تھی۔ سیٹھ کی بیوی اور ماں گھر پر نہیں تھی، صرف ملازمین تھے۔ وہ آ کر پچھتائی، مگر اللہ کا نام لے کر کام میں لگی رہی۔ دوپہر تک اس کا بخار مزید بڑھ گیا۔ کچن میں مزید کھڑے رہنا اب اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ لہذا دوپٹے سے پسینہ

پونجھتی وہ اجازت لینے کے لئے سیٹھ کے پاس آئی تھی، جو شراب کے نشے میں دھت بیٹھا مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔

”آصف صاحب!۔۔۔۔۔ میں نے کھانا تیار کر دیا ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جا رہی ہوں۔“

”ابھی نہیں جا سکتیں آپ۔“ فوراً وہ بولا تھا۔ اُجالا کا دل دھڑک اٹھا۔

”کس نے فری کیا ہے آپ کو؟“ اچانک وہ بدلے تیوروں کے ساتھ بولا تھا اور اُجالا جیسے فریز ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اٹھا تھا اور اس نے سب سے پہلے اُجالا کے منہ پر ہاتھ جمایا

تھا۔ یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

سیٹھ نے اسے اوپر والے فلور پر اپنے کمرے میں قید کر دیا تھا۔ ساؤنڈ پروف اس کمرے میں اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آتی رہی اور وہ اسے بد ارادے سے قید کر کے اسی پل کمرے سے نکل گیا۔

صبح سے دوپہر ہوئی اور دوپہر سے شام۔۔۔۔۔ اُس نے رو کر اپنی آنکھیں سُجا لی تھیں۔ مگر وہاں کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں آیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ سیٹھ کے ارادے کیا ہیں اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ کیا کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ بھوک پیاس اور بخار نے الگ نڈھال کر چھوڑا تھا۔ اس میں اتنی سی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ونڈو کے شیشے توڑ کر ہی وہاں سے فرار کی کوئی کوشش کر سکتی، اس لئے وہ صرف کمرہ اندر سے لاک کر سکتی تھی اور وہ اس نے کر لیا تھا۔ مگر کب تک؟

ایک روز۔۔۔۔۔ دو روز۔۔۔۔۔ تین روز۔۔۔۔۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تین دن گھر واپس نہ جانے پر اس کے بھائی اور بھابی کا کیا حال ہوا ہو گا۔ انہوں نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟ کتنا غلط سمجھا ہو گا اسے؟ سب ختم ہو گیا تھا جیسے۔۔۔۔۔ سب کچھ۔۔۔۔۔ وہ قدرت کی اس آزمائش پر صرف رو سکتی تھی اور رو رہی تھی۔

اسے اس اجنبی کمرے میں قید ہوئے تیسرا دن تھا، جب سیٹھ اس رات اپنے ساتھ دو اور لوگوں کو بھی لے آیا۔ شاید اس میں مزید برداشت کی ہمت نہیں



رہی تھی۔ وہ لوگ دروازہ توڑنے کے درپے تھے۔ اور ادھر بھوک و بیماری سے  
نڈھال اُجالا کی جان جیسے حلق میں اٹک آئی تھی۔ عزت گنوانے کے بعد موت  
کا تصور اُس کے لئے بے حد بھیانک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چار سال بعد اسے  
پھر اللہ یاد آیا تھا۔

وہ جانتی تھی، اس لمحے اللہ کی پاک ذات کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں  
بچا سکتی تھی۔ عزت گنوانے کے بعد زندہ بچ جانا کوئی معنی بھی نہیں رکھتا تھا  
لہذا اللہ سے اپنی عزت کی حفاظت کی دعا مانگتی، آخری کوشش کے طور پر  
لڑکھڑاتی اُٹھی تھی اور طاقت سے جو چیز بھی ہاتھ لگی اس نے ونڈو پر دے  
ماری۔ باہر گھپ اندھیرے میں صرف لان کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ نہ کچھ  
دکھائی دے رہا تھا، نہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ ونڈو کا شیشہ صرف اتنا ٹوٹا تھا کہ وہ  
زخمی ہو کر ہی سہی، مگر باہر نکل سکتی۔ اگر سیٹھ کا کمرہ سیکنڈ یا تھرڈ فلور پر  
ہوتا تو شاید وہ کبھی وہاں سے زندہ بچ کر نہ جا سکتی۔

ونڈو سے باہر کودنے کے بعد وہ زخموں کی پروا کئے بغیر بھاگ کر گیٹ کے  
قریب آئی تھی جہاں موجود کتے نے بندھا ہونے کے باوجود اسے دیکھ کر

بھونکنے کے ساتھ ساتھ اُچھلنا کودنا شروع کر دیا تھا۔ گیٹ لاک نہیں تھا۔ پھر  
بھی وہ اسے کھول کر باہر نکلتے ہوئے ہانپ گئی تھی۔ سب کچھ جیسے ڈرامائی ہو  
رہا تھا۔ اللہ کی مدد شامل حال ہو تو وہ کیسے اپنے بندوں کو بھنور سے سلامت  
نکال لیتا ہے، اس وقت وہ جان پائی تھی۔

کتے کے بھونکنے کی تیز آواز پر وہ لوگ جو اسے شکستہ عمارت کی مانند مسمار کر  
دینا چاہتے تھے، بھاگ کر باہر آئے تھے۔ مگر تب تک وہ کافی دور نکل آئی  
تھی۔ پھر بھی انہوں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ عزت چانے کے لئے سیٹھ کے  
گھر سے بھاگ آئی تھی۔ مگر دل بچانے کے لئے مصحف علی میر کے گھر سے  
نہ بھاگ سکی۔ جانے ابھی اس کی تقدیر میں اور کس کس سے بھاگنا لکھا تھا۔  
☆...☆...☆

شدید تنہا، بخار اور اُجھن کے باوجود وہ بیڈ پر بیٹھی بنا لباس تبدیل کئے سو  
گئی۔ اُسے خبر ہی نہ ہوئی۔ مصحف دوبارہ کمرے میں آیا تو وہ سمٹ کر سو رہی  
تھی۔ وہ ایک نظر اُس پر ڈالتا، گہری سانس بھر کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر آ  
بیٹھا۔

اُجالا کی آنکھ کھلی تو وہ اسے قریب بیٹھا دیکھ کر فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا خیال تھا، وہ اب اسے بستر چھوڑنے کو کہے گا اور کہے گا کہ اسے نیند آرہی ہے۔ لہذا وہ اس کے بستر سے اُٹھ جائے۔ مگر اُس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ خوب صورت آنکھوں کی سرخی اس کے اندر کا حال خوب واضح کر رہی تھی۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ اس وقت تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا اور تم کیوں بھاگ کر آئی تھیں؟“ کچھ دیر خاموشی کے بعد کمرے میں اس کی آواز گونجی تھی۔ اُجالا کے ہاتھ اپنے

گلے پر رُک گئے۔ وہ زیور اُتارنے کی کوشش میں تھی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ سب بتاؤں گی۔۔۔۔۔ مگر کیا آپ میرا یقین کریں گے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ کروں گا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اُجالا اپنے ہاتھوں کے ناخن سے کھیلتی، اسے شروع سے آخر تک تمام حالات و واقعات سے آگاہ کرتی گئی۔ یہاں تک کہ اپنے تایا غلام عباس کے اپنے مذہب سے پھر جانے کے حوالے سے بھی۔ مصحف اس دوران بالکل خاموش رہا تھا۔

”اب کہاں ہوتے ہیں وہ؟ اور جس بیوی کو وہ شخص چھوڑ چکا ہے، اس کا کیا بنا؟“

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔ بتایا سے علیحدگی کے بعد انہوں نے دوبارہ کسی سے رابطہ ہی نہیں رکھا اپنا بیٹا بھی وہ ساتھ ہی لے گئی تھیں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ یعنی اسجد غلام عباس کا بھائی؟“

”جی۔ تایا کا بڑا بیٹا اور اسجد کا بڑا بھائی۔“

”تمہیں پتہ ہے اس کا نام کیا ہے؟“ اب اس نے رخ پھیرا تھا۔ اُجالا سر نفی میں ہلا گئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اس لئے تاکہ تم اس ایمر جنسی شادی کی وجہ جان جاؤ۔ جاننا چاہو گی، اسجد غلام عباس کا بڑا بھائی کون ہے؟۔۔۔۔۔ میں ہوں۔۔۔۔۔ میں، تمہارا شوہر، مصحف علی میر۔“ ایک دم وہ جذباتی ہوا تھا۔ اُجالا حیرانی سے گنگ بنا پلک جھپکاتے اسے دیکھتی رہی۔

”مجرم ہے وہ شخص میرا، جس نے زندہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ باپ کی شفقت سے محروم رکھا مجھے۔ اور اب۔۔۔۔۔ اب اس کا بیٹا بھی میرا مجرم ہے، جس نے بیوی ہوتے ہوئے بھی مجھے اس کی سچی محبت سے محروم کر دیا۔“ وہ اس کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا، تب ہی اُٹھ گیا تھا۔ اُجالا کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”تم اُجالا ہو یا ایمان، جو بھی ہو، دونوں ہی نام بہت سوٹ کرتے ہیں تم پر۔ کچھ روز پہلے جانے کیوں مجھے لگا کہ اگر میں تمہارے جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزاروں گا تو میری زندگی تاریک نہیں ہوگی۔ جو مضبوطی میں نے تمہارے کردار کے حوالے سے دیکھی، فیکٹری مینجر سے جانی، اس کے بعد مجھ پر واضح ہوا کہ عورت کی اصل خوب صورتی ایمان کی، کردار کی حفاظت ہی تو ہے۔ کچرا تو کسی بھی شخص کو گھر میں اچھا نہیں لگتا۔ مگر۔۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں نا کہ نیک مرد کے لئے نیک عورت اور بد مرد کے لئے بد عورت ہوتی ہے، تو پھر تم مجھے کیسے مل سکتی ہو؟ زبردست بھی کبھی کوئی تعلق بن پایا ہے کسی سے؟“

گلاس ونڈو سے پردے ہٹا کر باہر یاسیت سے دیکھتا وہ بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔ اُجالا شرمندہ سی اُٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”آپ بہت اچھے ہیں، کوئی بھی اچھی لڑکی۔۔۔۔۔“

”ہر موڑ، ہر قدم پر اچھی لڑکیاں نہیں ملتیں۔ اپنے اصول، اپنے رنگ ہوتے ہیں زندگی کے۔۔۔۔۔ جس طرح کتاب میں ہر باب ایک جیسا نہیں ہوتا، اسی طرح زندگی کے اسٹیج پر ہر کردار ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ لوگ، جن کے حصے میں صرف پیاس آتی ہے۔ صرف پیاس۔“ اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر وہ پھر جذباتی ہوا تھا۔ اُجالا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی سر جھکا گئی۔

”آپ کے بازو کا زخم کیسا ہے اب؟“ وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ مصحف بے قرار سا ونڈو سے پلٹ آیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر میں اس زخم کو کبھی بھرنے نہیں دوں گا۔ یہ جب تک رستا رہے گا، مجھے یاد رہے گا کہ میری زندگی میں کوئی آیا تھا۔“ وہ اب ڈریسنگ ٹیبل کی دراز پر جھکا تھا۔

”اور یہ لو۔۔۔۔۔ یہ سب میری طرف سے تمہارے لئے ہے۔ جب یہاں سے جاؤ تو یہ سب چیزیں تحفہً اپنے ساتھ لے جانا۔ پلیز۔۔۔۔۔“ ڈرینگ ٹیبل کی دراز

سے کچھ روز پہلے اسی کے ساتھ خالص اپنی پسند سے خریدی جانے والی جیولری وہ اب اس کی نذر کر رہا تھا۔ اُجالا ہکا بکا سی دیکھے گئی۔

”برامت ماننا، مگر میں اسجد غلام عباس سے جڑی ہر چیز سے نفرت کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اس کے باپ سے بھی۔۔۔۔۔ اسی لئے اس کا نام میرے نام کا حصہ نہیں ہے۔ تاہم اس کی محبوبہ سے شاید میں کبھی نفرت نہ کر پاؤں۔ اور اس کی وجہ خود میں بھی نہیں جانتا۔ تمہیں جتنے دن یہاں رہنا ہے، رہو۔ جب جانے لگو تو چپکے سے چلی جانا۔ پلیز۔“ اُس کا سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ اُجالا ایک اجنبی شخص کی خود سے اتنی چاہ پر حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر کمرے سے نکل گیا تھا۔ تاہم وہ اُلجھی سی وہیں کھڑی رہی۔ اس وقت وہ شخص کیا کیا منکشف نہیں کر گیا تھا اس پر۔

بہتے اشکوں کے تسلسل میں روانی کم ہے

ایسا لگتا ہے کہ دریاؤں میں پانی کم ہے  
تُو نے دامن میں سمیٹے ہیں زمانے کتنے  
اے محبت تجھے انسان سا فانی کم ہے  
☆...☆...☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ماربل لگے شان دار گھر میں جوڑوں کے درد کے ساتھ تنہا بیٹھی شہناز بیگم جیسے اب گھبرانے لگی تھیں۔ اسجد ملک سے باہر تھا اور ولید کی جو سرگرمیاں تھیں، وہ اب ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہ سکی تھیں۔ وہ ڈرنک کرنے لگا تھا۔ چار پیسے ہاتھ آ جانے کے بعد اس کے طور طریقے بھی ہائی سوسائٹی والوں جیسے ہو گئے تھے۔

پانچ وقت کی نماز اور قرآن کی باتوں پر اب وہ اپنے دوستوں کا مذاق اُڑاتا۔ صرف اُنیس سال کی عمر میں اُس نے قدم بد کاری کی دلدل میں بھی اُتار دیئے تھے۔ شہناز بیگم سب کچھ دیکھ رہی تھیں، مگر خاموش تھیں۔



وہ اپنے بچوں کے اساتذہ کی تھوڑی بہت جانچ پڑتال کر کے اتنا سا جاننے کی کوشش کر لیتے کہ بھاری فیس وصول کر کے آخر ان کے بچوں کے ذہنوں میں ڈالا گیا جا رہا ہے؟

بم دھماکوں اور خود کش حملوں میں ملوث سامنے آنے والے مسلمانوں کے ناموں کے پیچھے اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ مسلمان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا اقرار کرنے والے تھے بھی کہ نہیں؟ اپنے خسارے کا احساس اب ہو رہا تھا انہیں، اب جبکہ وہ دشمنوں کے جال میں بری طرح جکڑے جا چکے تھے۔

شہناز بیگم گھٹنوں کے درد میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ جبکہ غلام عباس کو شوگر نے جکڑ لیا تھا۔ وہ شخص اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت سے منکر ہوا تھا، اس پاک باز و بے نیاز ذات نے اس مکروہ شخص کو اپنی بے شمار نعمتوں سے ترسا دیا۔ وہ شخص کہ جس نے انتہائی کروفر سے غلام محمد کو ان کی غربت کا طعنہ دے کر دولت سے علاج کی راہ دکھائی تھی، اب خود اسی دولت سے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بھی شفا سے محروم تھا۔

غلام عباس صاحب پر اب بہت سے بھید کھل رہے تھے۔ غریب مسلمانوں کی  
مجبوریوں کو جانچ کر ان سے ان کی دنیا و آخرت کی سرخروئی خریدنے والوں  
کے مظالم بہت بھیانک تھے۔ وہ شخص اب جان رہا تھا کہ حقیقت کیا تھی۔

بڑے پیمانے پر سارے ملک میں بھوک بکھیر دینے والوں کے اپنے ضمیر اور ایمان تو کب کے بک چکے تھے۔ اب تو صرف مسلمان ہونے کا لیبل رہ گیا تھا ان پر۔۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔ یہ بڑے پیمانے پر سارے ملک پر بکھرنے والی بھوک، وہاں ان غریب، محنت کش، سفید پوشوں کی زندگیوں میں کیسے کیسے دکھ اور طوفان لا رہی تھی۔ شاید اس طرف ابھی کسی کا دھیان ہی نہیں جا رہا تھا۔ اندر سے کافر اور باہر سے بظاہر مسلمان وہ لوگ، کس تباہی کی طرف عوام کو دھکیل رہے تھے، اس پر توجہ کرنے کی فرصت نہ اعلیٰ عدالتوں کو محسوس ہو رہی تھی نہ پاک افواج کو۔ چھوٹے چھوٹے ننھے منے نونہالوں کے ذہن نام کے مسلمان، مگر اندر سے خطرناک عزائم رکھنے والے اسے بے ضمیر اساتذہ واش کر رہے تھے کہ جن کو خصوصی تربیت ہی اس کام کے لئے ملی تھی۔ دولت مند گھرانوں کے مصروف ترین والدین کے پاس اتنی فرصت ہی نہ رہی تھی کہ

ایسی مہر لگی تھی اس شخص کے دل و دماغ پر کہ زبردستی کلمہ پڑھنا بھی چاہتا تو الفاظ زبان پر ہی نہ آتے۔ ساری ساری رات آنکھیں نیند کے لئے ترستیں۔ مگر کئی کئی گولیاں پھانکے بغیر نیند نہ آتی۔ اسجد سے تو ویسے ہی کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ ولید کی شکل بھی ہفتوں کے بعد دیکھنے کو ملتی۔ بیٹی تھی تو اسے کوئی ادب لحاظ نہ رہا تھا۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی چلی جاتی اور اپنی مرضی سے جب دل چاہتا، گھر واپس آتی۔ روک ٹوک، سختی اب کچھ بھی کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اللہ رب العزت کی مقرر کردہ حدوں سے نکلنے کے بعد اب آزمائش نہیں، سزا ہی سزا تھی۔ دونوں میاں بیوی، نوکروں کے آسروں پر آپڑے تھے۔ کیونکہ ندا کو خود اپنے آپ سے فرصت نہیں تھی۔

حالات ابھی اسی نہج پر چل رہے تھے کہ ایک روز ولید کے قتل کی خبر نے ان دونوں میاں بیوی کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

شراب کے نشے میں دھت ولید غلام عباس، ایک کال گرل کے لئے اپنے چند اوباش دوستوں کے ہاتھوں انتہائی ذلت کی موت گلے لگا کر ہمیشہ کے لئے

سو گیا تھا۔ ندا کا حال دیکھنے والا تھا۔ مگر وہ دونوں میاں بیوی یوں چپ تھے، جیسے وقت ان کے منہ پر ریت بکھیر گیا ہو۔ اس لمحے اپنے جوان بیٹے کا کٹا پھٹا وجود دیکھ کر بے ساختہ غلام عباس صاحب کے کانوں میں غلام محمد کی آواز گونجی تھی۔

”اولاد مردِ مومن کے لئے سب سے بڑی آزمائش ہے بھائی!۔۔۔۔۔ چاہے تو جنتی بنا دے، چاہے جہنمی۔ میں ان کی چند روزہ خوشیوں کے لئے ان کی دنیا و آخرت کا سودا نہیں کر سکتا۔ غلام محمد کے بچے ہیں یہ۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ غلام کے۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے، یہ کبھی دنیا و آخرت میں میری رسوائی کا سبب نہیں بنیں گے۔“

اس کی آنکھیں پتھرائی تھیں، اسے لگا اس کے تینوں بچے اس کا گلا گھونٹ رہے ہیں، اپنی بربادی پر اسے مسمار کر رہے ہوں۔ وہ چاہتا تو انہیں تباہی کے راستے سے بچا سکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں چاہا۔

جوان بیٹے کی ناگہانی موت کا صدمہ شہناز بیگم پر اٹیک کی صورت پڑا تھا۔ اٹیک کے ساتھ فالج نے انہیں کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا۔ آدھ پون گھنٹہ

وہ تڑپتی رہی تھیں۔ انتہائی اذیت کے عالم میں سر ادھر ادھر مارتی رہیں، مگر روح ان کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ جانے کون ان پر ترس کھا کر مولوی صاحب کو بلا کر لایا تھا۔ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ ان کے پاس کوئی تھا بھی کہ نہیں۔ مولوی کی مسلسل پڑھائی کے بعد ان کا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم ان کی چارپائی کے قریب کھڑے غلام عباس کو لگا، وہ اب زندگی میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں بول سکے گا۔

☆...☆...☆

اُجالا پر زندگی کے بہت سے راز افشا کرنے کے بعد مصحف علی میر اپنی جون میں واپس لوٹ گیا تھا۔ وہی اس کی آوارہ گردی، وہی ذمہ داریوں سے لاپرواہی، وہی رات گئے دوستوں کے ساتھ شراب اور شباب کی محفلیں سجانا۔

اُجالا بہت خاموشی سے اس کی سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔ وہ نانو کو بے وقوف بنا سکتا تھا مگر اسے نہیں۔ اس روز اس نے بہت زیادہ ڈرنک کر رکھی تھی، اسی لئے حمزہ اور شاہ میر اسے گھر تک چھوڑنے آئے تھے۔ اُجالا جو اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی، گاڑی رکنے، پھر گیٹ کھلنے کی آواز پر اُٹھ بیٹھی۔ تاہم

جس وقت وہ لاؤنچ میں حمزہ اور شاہ میر کے سہارے آیا، وہ گویا پتھر ہو گئی۔ وہ دونوں مصحف کو اس کے بیڈ روم میں چھوڑنے کے پاس اُجالا کے پاس رکے تھے، جو سہمی کھڑی تھی۔ حمزہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جبکہ شاہ میر سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

”ایم سوری بھابی! ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود آج مصحف نے ضرورت سے زیادہ ڈرنک کر لی ہے، اسی لئے اسے یہاں چھوڑنے آنا پڑا میں جانتا

ہوں، آپ کا دل حمزہ اور شہریار کی طرف سے بہت خراب ہے۔ تاہم میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔ خود مصحف نے بھی انہیں اپنی غلطی کے احساس کے بعد معاف کیا ہے۔ پلیز آپ بھی انہیں معاف کر دیجئے۔ اب یہ محض مصحف کے دوست نہیں، آپ کے بھائی بھی ہیں۔“

وہ شاید کچھ اور بھی کہہ رہا تھا، مگر اس وقت اُجالا کو کچھ سنائی دے رہا تھا نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں لمحوں میں برف کی مانند سرد ہو گئے تھے۔ اس کی حالت کا

احساس کر کے ہی شاہ میر نے حمزہ کی طرف دیکھا اور پھر بغیر ایک لفظ بھی کہے دونوں وہاں سے چلے گئے۔

اُجالا تقریباً آدھے گھنٹے بعد خود کو حرکت دینے کے قابل ہوئی تو مصحف کے بیڈ روم میں چلی آئی۔ وہ بیڈ پر مدہوش پڑا سارے عالم سے بے خبر دکھائی دے رہا تھا۔ اُجالا کا دل اس لمحے جانے کیوں سینے میں بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ آہستہ سے جھکی اور مصحف کے پاؤں کو جو توں کی قید سے آزاد کر دیا۔ کتنا خوبرو شخص تھا وہ۔۔۔۔۔۔ مگر خود کو ضائع کر رہا تھا۔ کتنا قریبی رشتہ تھا اس کا اس کے ساتھ۔ مگر وہ اس کے کسی کام کی نہیں تھی۔

وہ ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور اس لمحے اُجالا اس کے بازو پر اپنی وجہ سے لگنے والے زخم کی گہرائی بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اس کی جان ہی نہیں، عزت بھی بچائی تھی۔ نہ صرف اس کا اعتبار کیا تھا بلکہ اسے اپنا نام دے کر معتبر بھی کر دیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے خود برائی مول لے کر نانو کے سامنے اس کے جھوٹ کا بھرم رکھا تھا۔ وگرنہ وہ کہیں کی نہ رہتی۔

کتنے احسان تھے اس شخص کے اس پر۔ وہ دوبارہ جھکی تھی اور اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑی تھی۔

’کاش۔۔۔۔۔۔ کاش اسجد غلام عباس کے پاس بھی تمہارے جیسا دل اور یقین ہوتا میرے محسن!۔۔۔۔۔۔ اے کاش۔‘

اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کے آنسو مصحف علی میر کے ہاتھ کو بھگو رہے ہیں۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو اُجالا اس کے کمرے میں نہیں تھی البتہ اس کے کپڑے پریس شدہ حالت میں ہینگ تھے۔ وہ ابھی اُٹھنے کا قصد کر رہا تھا کہ وہ کمرے میں چلی آئی۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔۔ صبح بخیر۔“

”وعلیکم السلام۔“ چونک کر اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھتا وہ قدرے حیران ہوا تھا۔ جب وہ بولی۔

”اللہ کا شکر ہے کہ آپ اُٹھ گئے۔ نانو کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔۔ خیریت؟“



”پتہ نہیں۔ یہ تو نانو ہی بتا سکیں گی۔ آپ جلدی سے ہاتھ لے لیجئے۔ پھر میں ناشتہ لاتی ہوں۔ اور ہاں، ناشتے میں کیا لیں گے؟ بیئر، برانڈی یا پھر وہسکی؟“

”واٹ؟“ وہ آج اپنے یکسر بدلے انداز کے ساتھ اسے حیران کر رہی تھی۔

اُجالا مسکرا دی۔

”واٹ کیا؟ آپ کی تو فیورٹ ہے یہ۔ مجھے تو کل رات پتہ چلا کہ یہ کتنے مزے کی چیز ہے۔ آج کے بعد پلیر میرے لئے بھی لے آیا کریں۔ ایک دو بوتل مل کر پیئیں گے۔“

”شٹ اپ۔“ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کیوں شٹ اپ؟۔۔۔ آپ پی سکتے ہیں، میں نہیں پی سکتی؟ میں بھی پیوں گی اب۔ بلکہ نانو کو بھی پلاؤں گی۔“

”میں کھال کھینچ لوں گا تمہاری اگر تم نے ان کو بھنک بھی پڑنے دی۔“ وہ بے زار ہو کر وارڈ روب کی طرف پلٹ گیا تھا۔

”آج آپ یہ وائٹ سوٹ ہرگز نہیں پہنیں گے، بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ یہ بلیو والا پہن لیں نا پلیر!“ وہ پھرتی سے پھر اس کے مقابل آئی تھی۔ مصحف نے ایک نظر دونوں ڈریسز پر ڈالی، پھر وائٹ والا سوٹ اٹھا لیا۔

”تمہارے حکم اور مرضی کا غلام نہیں ہوں میں۔“ اگلے ہی پل اسے جتاتے ہوئے وہ واش روم میں گھس گیا تھا۔ اُجالا اپنی چالاک اور اس کی بے وقوفی پر دل کھول کر ہنسی۔

☆...☆...☆

اگلے روز وہ ابھی شاہ میر کے گھر سے آیا تھا کہ نانو کے حضور اُس کی پیشی لگ گئی۔ اُجالا بڑے مزے سے ان کی پشت پر کھڑی ان کے بالوں میں مساج کر رہی تھی۔ وہ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتا مجبوراً وہیں چلا آیا۔

”السلام علیکم نانو!“

”وعلیکم السلام۔“ نانو کے تیور خطرناک تھے۔ وہ پھر اُجالا کو دیکھتا ان کے قریب ہو بیٹھا۔

”کیا بات ہے نانو! کل پرسوں سے ناراض ناراض سی لگ رہی ہیں۔“

”میں کیوں ہونے لگی تم سے ناراض۔ میرا کیا واسطہ ہے تم سے؟“ نانو بھری بیٹھی تھیں۔ مصحف کو زور کا جھٹکا لگا۔

”ارے۔۔۔۔۔ ایسا کیا کر دیا میں نے جو آپ نے سارے واسطے ہی ختم کر دیئے؟“

”ہاں تم کیا کرو گے؟ تیس سے اوپر کے ہو گئے ہو، ابھی تک لڑکے بالوں والی حرکتیں نہیں گئیں تمہاری میں تو بے کار پڑ رہا ہوں، مجھے تو چھوڑو، مگر بیوی کا خیال تو کرو۔ رات گئے تک تمہارا انتظار کرتی رہتی ہے۔ ادھر فیکٹری میں نقصان پر نقصان ہو رہا ہے۔ مگر تمہاری جوتی کو پروا نہیں۔ سوچ کیا رکھا ہے تم نے آخر؟“ وہ اُس پر الٹ پڑی تھیں۔ مصحف انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”آج میں ہوں، گھر کا نظام چل رہا ہے۔ کل آنکھیں بند ہو جائیں گی تو کیا بھوکے مرو گے؟ آنے والے بچوں کا کیا ہو گا؟ کیا بھیک منگواؤ گے ان سے؟ یا انہیں بھی اپنی طرح آوارہ گرد بنا کر دوسروں کو کھلاؤ گے؟“ غصے نے نانو کا چہرہ غضب ناک کر دیا تھا۔ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ نانو زندگی میں پہلی بار اس پر یوں غصہ ہوئی تھیں۔

”آئی ایم سوری نانو!“ بہت دیر خاموشی کے بعد وہ محض یہ ہی کہہ سکا تھا۔ اُجالا نے لب دبا کر اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیا۔

وہ کمرے میں آیا تو وہ اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

”نانو کی باتوں کو دل پر مت لیجئے گا۔ اصل میں آج کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تو مزاج تھوڑا چڑچڑا ہو گیا ہے۔ انہیں کیا پتہ، یہی تو عمر ہے زندگی کو انجوائے کرنے کی۔ جہاں تک فیکٹری کی بات ہے تو وہ میں جوائن کر لوں گی۔ اب آپ میں یا مجھ میں کوئی فرق تھوڑی ہے۔“ تھوڑی بے تکلفی سے وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ مصحف کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھتا رخ پھیر گیا تھا۔

”اور جہاں تک بچوں کی بات ہے تو۔۔۔۔۔ وہ تو ہم ہونے ہی نہیں دیں گے، سو آپ ان کی بھی فکر مت کریں۔ مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے سارے دن گھر میں آزاد رہنا۔“

”تم چپ کرتی ہو یا میں کھڑکی سے اٹھا کر پھینک دوں باہر؟“ اچانک وہ دھاڑا تھا۔ اُجالا بمشکل ہنسی ضبط کرتی خاموش ہو بیٹھی۔

”کھانا لاؤں آپ کے لئے؟“ تھوڑی دیر بعد پھر اس کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ تب ہی وہ سنجیدہ ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ تم جاؤ یہاں سے، پلیز۔“

”کیوں جاؤں؟ اگر یہ آپ کا کمرہ ہے تو میرا بھی کمرہ ہے۔“

”تمہارا کمرہ نہیں ہے یہ۔ انجام جانتی ہو اس کمرے میں سونے کا؟“ اچانک دھاڑ کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اُجالا بے ساختہ نظر چرا گئی۔

”مت اتنا آزماؤ مجھے کہ ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔ جب یہ طے ہے کہ تمہیں یہاں سے جانا ہے تو مت عادی بناؤ اس گھر کے مکینوں کو اپنا۔ جو تعلق کاغذی ہے،

اسے کاغذی ہی رہنے دو۔ بہت سادہ دل، بہت بھولی ہیں میری نانو۔ انہیں

مزید بے وقوف مت بناؤ۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔“ وہ چٹخ گیا تھا۔ اُجالا جھکا

سر اٹھا کر ایک نظر اس پر ڈالتی، وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔

”میں جانتی ہوں، میری وجہ سے آپ بہت اذیت سے گزر رہے ہیں۔ اور میں یہ بھی مانتی ہوں کہ میں نے کسی طور پر ایسا نہیں چاہا تھا، جو ہو گیا۔

مگر۔۔۔۔۔ میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے اب یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ اس کمرے میں میرے لئے کوئی جگہ ہو یا نہ ہو مگر اس گھر سے میں مرنے کے بعد ہی جاؤں گی، یہ یاد رکھئے گا۔“

”اونہ۔۔۔۔۔ کسے بہلا رہی ہو؟ مجھے یا اپنے آپ کو؟ ابھی تمہارا اسجد غلام عباس مل جائے تو پھر۔۔۔۔۔“

”پھر بھی نہیں جاؤں گی۔“ اس کا دل ایک لمحے کے لئے ٹھہرا تھا۔ مگر اس نے دل کی پروا نہ کرتے ہوئے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ مصحف نے سر جھٹک کر اس کی بات کو ہنسی میں اڑایا تھا۔

☆...☆...☆

اس روز موسم صبح سے ہی خاصا گرم تھا۔ اُجالا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو نانو نے اسے زبردستی مصحف کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا تھا۔ ڈاکٹر سے فارغ

ہو کر وہ نانو کی ہدایت پر مارکیٹ چلی آئی تھی اور یہیں مصحف نے اسے بتایا تھا۔

”شہریار کی شادی ہو رہی ہے، میں کچھ روز تک گھر نہیں آ سکوں گا، اس کا اصرار ہے کہ تم سبھی بہن کی طرح اس کی شادی میں شرکت کرو۔ کیونکہ اس کی اپنی کوئی بہن نہیں ہے۔ شاہ میر اور حمزہ بھی تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ بلکہ حمزہ تو آج شام کی فلائٹ سے ہی باہر جا رہا تھا۔ میں نے اور شہریار نے زبردستی روک لیا۔ بہر حال اگر تم ان سب کو معاف کرنے کا حوصلہ کر سکو تو میرے ساتھ چلنا، انہیں بہت خوشی ہو گی۔ بصورتِ دیگر تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔“

وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، مصحف کی اطلاع کے بعد اسے دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے، میں چلوں گی آپ کے ساتھ۔ مگر نانہ۔۔۔۔۔“

”وہ بھی ساتھ ہی چلیں گی۔ بچپن سے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے اور رہنے کی عادت ہے ہمیں۔“

”نانو کے بچپن سے؟“ وہ ہنسی تھی۔

مصحف نے ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد پھر رخ پھیر لیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ پتھر ہی ہو گیا ہو۔

شہریار اور اس کی ہونے والی بیوی کے لئے بہت سی چیزیں خریدنے کے بعد وہ گھر واپس لوٹے تو دونوں کا ہی تھکن سے برا حال تھا۔ اسی روز شام میں وہ مصحف کے ساتھ جانے کے لئے ہلکی پھلکی سی تیاری کے ساتھ کمرے سے نکلی تو وہ جو نانو کے ساتھ باتوں میں مگن تھا، ایک دم سے ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔

”اچھی لگ رہی ہوں نا، نانو!“ اُس کی محویت پر شرارت سے مسکراتی وہ نانو پر جھکی تو مصحف نے جلدی سے نظر پھیر لی۔

راستے میں وہ اسے بتا رہا تھا۔

”تمہیں شاید خبر نہ ہو، مگر مجھے ابھی کچھ روز پہلے پتہ چلا ہے، غلام عباس کی سیکنڈ وائف کی ڈیوٹھ ہو گئی ہے۔ اور اس کا جو چھوٹا بیٹا تھا ولید، اسے کسی نے ایک کال گرل کے لئے قتل کر دیا۔ بیٹی بھی گھر سے فرار ہو گئی۔ کچھ نہیں رہا اس شخص کے پاس سوائے پچھتاؤوں اور خاموشی کے۔“



وہ بتا رہا تھا اور اُجالا کو لگ رہا تھا، جیسے اُس کا سارا وجود سرد پڑ گیا ہو۔ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ کتنی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اتنی جلدی اس شخص کا حساب کلیر کر دیا تھا اللہ نے؟۔۔۔۔۔۔۔۔ اتنی جلدی نفع و نقصان کا بھید کھول دیا تھا اس پر۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب آنسو اس کے گالوں پر پھسل پڑے۔ نانو اب مصحف سے کچھ کہہ رہی تھیں، مگر اُجالا کو لگا جیسے اُس کا دماغ سُن ہو گیا ہو۔

شہریار کے گھر اس کا خاصا شان دار استقبال ہوا تھا۔ حمزہ اور شاہ میر بھی وہیں تھے۔ وہ سُن اعصاب کے ساتھ چپ چاپ سی نانو کے ساتھ ہی جڑی رہی۔ شہریار، شاہ میر اور حمزہ بار بار آکر اسے تنگ کر رہے تھے مگر وہ ان کی شرارتوں پر جواباً مسکرا بھی نہ سکی۔ تب ہی حمزہ نے مصحف سے کہا تھا۔

”لگتا ہے، بھابی نے ابھی تک ہمیں معاف نہیں کیا ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے یار! وہ اصل میں بہت اپ سیٹ ہے۔“

”چلو، تم کہتے ہو تو مان لیتے ہیں۔ ویسے تم ہو بہت خوش نصیب، کیونکہ تمہیں وہ لڑکی ملی ہے، جس کے چہرے پر کسی فیشل، کسی میک اپ کی چمک نہیں، بلکہ ایمان کا نور ہے۔“

”اندر کمرے میں گئی ہے نماز پڑھنے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک تو یہ لڑکی بھی نا۔ لگتا ہے، کسی مولانا کی روح سما گئی ہے اس میں۔ جب دیکھو مصلے پر ہی بیٹھی ہوتی ہے۔“ وہ چڑا تھا۔ نانو اُسے گھور کر رہ گئیں۔

”تمہیں توفیق نہیں ہوتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں پر بھی اعتراض کرو۔“

”میری یہ مجال کہاں؟ اب تو اس نے آپ کو بھی لگا لیا ہے نماز روزے پر۔ آپ تو سائیڈ لیس کی نا۔“ جل کر وہ پلٹا تھا۔

نانو دل ہی دل میں مسکراتی دوبارہ ساتھ والی آنٹی سے باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

اُجالا غلام محمد واقعی گلاب تھی، جس کی خوشبو سے ان کا گھر مہک اُٹھا تھا۔ اگر وہ سگریٹ ثابت ہوتی تو شاید ان کے ساتھ ساتھ مصحف کی زندگی میں بھی دھواں بھر جاتا۔ واقعی ہر چیز اثر ڈالتی ہے۔ ہر چیز کی صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ مصحف جس وقت دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا، وہ سارے عالم سے بے نیاز مصلے پر بیٹھی آنکھیں بند کئے روئے جا رہی تھی اور اس کے لب بار بار ایک ہی دعا کر رہے تھے۔

”مجھ پر رحم کر میرے مولا!۔۔۔۔۔ میرے شوہر کو میرا ہی رکھنا۔۔۔۔۔“  
اب کچھ بھی کھونے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ مجھ گناہ گار کو رشتوں کی  
آزمائش سے بچالے۔“

وہ ٹھٹکا تھا اور اس کا یا پلٹ پر حیران رہ گیا تھا۔ کہاں تو وہ کسی کی محبت کے  
دعوے کر رہی تھی اور کہاں اب۔۔۔۔۔ وہ پلٹا تھا اور وہیں کمرے کے باہر  
سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا  
تھا۔ وہ ساری سرگرمیاں جو اس کی بہترین وقت گزاری کا باعث تھیں، بے کار  
ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایک عجیب سی بے سکونی نے دل و دماغ کو جیسے جکڑ لیا

تھا۔ شاہ میر کی نظر اس پر پڑی تھی اور وہ اسے کھینچ کر زبردستی پھر مہندی کے پنڈال میں لے گیا تھا۔

اُجالا نماز سے فارغ ہو کر نیچے آئی تو وہ دوستوں میں گھرا، ہلکا پھلکا ڈانس کر رہا تھا۔ وہ تادیر اسے دیکھتی جانے کن کن سوچوں میں کھوئی رہی۔

☆...☆...☆

اگلے روز بارات جانی تھی۔ شہریار کی ممانے اُجالا کو سچ مچ شہریار کی بہن بنا کر، اس سے بہنوں والے سارے کام لئے تھے۔ وہ اتنی مصروف تھی کہ اسے مصحف کی تیاری میں اسے مدد دینے کا وقت بھی نہیں مل سکا تھا۔ جس پر وہ اس سے ناراض تھا۔

بارات مقررہ وقت پر ہوٹل پہنچی تھی۔ نانو گھر پر ہی رہ گئی تھیں، جبکہ اُجالا، شہریار کی ماما کے ساتھ ساتھ تھی۔ مصحف خفا خفا سا شہریار اور بقیہ دوستوں کے ساتھ ہی اسٹیج پر بیٹھ گیا تھا، جس کا اسپیشل انتظام کیا گیا تھا، جبکہ وہ نیچے تھی۔ دلہن اور دلہا کا نکاح ہو گیا تھا۔ ہر طرف رنگا رنگ قمقمے تھے۔ وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی پلٹ رہی تھی جب ساکت رہ گئی۔ وہاں اس سے کچھ ہی قدموں کے

فاصلے پر کھڑا وہ شخص شاید نہیں، یقیناً اسجد غلام عباس تھا۔ وہ اسجد غلام عباس جو کبھی اس کے جینے کا سبب تھا۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس اس وقت وہ ایک چھوٹے سے بچے کو بانہوں میں لئے کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں اپنے برابر کھڑی ایک خوش شکل سی لڑکی کے میک اپ میں رنگے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ شہریار کی ماما کی ان سے بے تکلفی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ”خاص مہمان“ تھے۔ یہ تو اسے بعد میں پتہ چلا تھا کہ شہریار کی دُہن اور اسجد کی ماڈرن بیوی دونوں آپس میں بہنیں تھیں۔

وہ شخص جو اس کے لئے زندگی کی مثال تھا، اس نے اس کا انتظار نہیں کیا  
تھا۔ وہ اپنی دنیا میں خوش اور مگن تھا۔ اور وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کیا سے کیا ہو کر  
رہ گئی تھی اس کے لئے؟ اُسے لگا شاید وہ زیادہ دیر تک اپنے پاؤں پر کھڑی  
نہیں رہ سکے گی۔ تبھی اس نے پاس پڑی کرسی کو تھاما تھا۔

مصحف جو اسٹیج پر مصروف تھا، اچانک اس کی نگاہ اس پر پڑی تھی اور وہ لپک کر پاس آیا تھا۔

”تم ٹھیک ہو نا اُجالا؟“

”پتہ نہیں۔“ اپنے کندھوں کے گرد اس کے مضبوط بازوؤں کا سہارا پا کر وہ پلٹی تھی۔ مصحف نے دیکھا، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں۔“ کتنا پریشان ہو گیا تھا وہ اس کے لئے۔ اُجالا چاہنے کے باوجود خود کو نارمل نہ رکھ سکی۔

”او کے چلو۔ شاید گیدرنگ کی وجہ سے بی پی لو ہو گیا ہے۔“ فوری فیصلہ کرتے ہوئے وہ اسے سہارا دے کر وہاں سے نکال لایا تھا۔ اُجالا کے ہاتھ اور پورا جسم جیسے برف ہو رہا تھا۔ مصحف کی جان پر بن گئی۔ باہر گاڑی میں کچھ پل اس کے ہاتھ مسلنے کے بعد وہ اسے ہاسپٹل لے آیا تھا اور وہیں سے فون کر کے اس نے شہریار کی ماما سے معذرت کی تھی۔

رات گئے تک اُجالا کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تو وہ اسے لے کر گھر واپس لوٹا۔ نانو کو بھی اس نے فون پر بتا دیا تھا اور اب وہ پہلی فرصت میں گھر واپسی کے لئے پَر تول رہی تھیں کہ اُجالا میں تو خود ان کی بھی جان تھی۔ مگر شہریار کی ممانے انہیں زبردستی رات کے لئے روک لیا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ جو نہی وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھی، مصحف بے تابی سے پاس چلا آیا۔

”ٹھیک ہوں۔ بس سر چکرا رہا ہے۔ آپ وضو کروا دیں گے مجھے؟“

”شٹ اپ یار! آنکھیں کھل نہیں رہیں، سر چکرا رہا ہے اور تمہیں وضو کی پڑی ہے۔“

”ہاں۔ جان سولی پر کیوں نہ لٹکی ہو، میں نماز نہیں چھوڑ سکتی۔ بہت مشکل سے پایا ہے اپنے رب کو۔۔۔۔۔ آپ چاہتے ہیں، ایک معمولی سی آزمائش پر پھر اسے چھوڑ دوں؟ غافل ہو جاؤں اس سے، اس کے حقوق سے؟“

”اس کے حقوق کی بہت فکر ہے، جبکہ کائنات میں اس سے بڑھ کر معاف کرنے والا کوئی نہیں۔ مگر اس کے بندوں کے حقوق کی کوئی پروا نہیں۔“ وہ اب گلہ کر رہا تھا۔ اُجالا نظر چرا گئی۔

”بخار ہو رہا ہے تمہیں۔ صبح پڑھ لینا کٹھی، پلیز۔“

”نہیں، مختصر پڑھ لیتی ہوں۔ نہیں تو ساری رات سو نہیں سکوں گی۔“

”بہت ضدی ہو تم۔ میری کوئی بات نہ ماننے کی تو ویسے بھی قسم کھا رکھی ہے تم نے۔“

”غلط بات کہیں گے تو کیسے مان سکتی ہوں؟ آپ کی جگہ میرے ابا جی ہوتے تو کبھی نہ کہتے کہ نماز مت پڑھو، چاہے میری جان ہی کیوں نہ نکل رہی ہوتی۔“

”ٹھیک ہے۔ کرو جو دل میں آتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے اگر گر پڑیں تو میں اٹھانے نہیں آؤں گا۔ خوا مخواہ اتنا اچھا فنکشن چھوڑ کر یہاں آیا تمہارے ساتھ۔“ وہ جلا تھا۔ اُجالا چاہ کر بھی خود کو ہنسنے سے باز نہ رکھ سکی تھی۔

نماز پڑھ کر وہ بستر پر آئی تو مصحف اس کی طرف دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

”آپ بھی کبھی نماز پڑھ لیا کریں۔ پھر دیکھئے گا، کتنی جلدی سکون کی نیند آتی ہے۔“

”تم نے پڑھ لی ہے نا، کافی ہے۔“ وہ جلا بیٹھا تھا۔

اُجالا اُس کے پہلو میں ٹک گئی۔



”کافی نہیں ہے۔۔۔۔۔ نماز ہی تو ہماری پہچان ہے مصحف!۔۔۔۔۔ نماز سے ہی تو پتہ چلتا ہے کہ ہم اپنے اللہ کے عاجز و فرماں بردار بندے ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر چلنے والے، ان کے غلام ہیں۔ نماز ہی تو ہے جو ہمیں اپنے رب کے قریب لاتی ہے۔ جب کوئی ہمارے ساتھ نہیں ہوتا، جب ہمیں کہیں سے امان نہیں ملتی، تب نماز ہی تو کام آتی ہے ہمارے۔“

”تمہارا تبلیغ کا پروگرام ہے آج؟“ وہ اس کے پاس آنے پر ذرا سا نرم پڑا تھا۔ اُجالا نفی میں سر ہلا کر پلکیں موند گئی۔ دواؤں کے اثر سے اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

مصحف بے تاب سا اس کے ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ رات میں اس کا بخار کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا تھا۔ حلق خشک تھا اور بدن یوں ٹوٹ رہا تھا کہ نرم بستر پر ایک ہی کروٹ سے سونا بھی محال ہو گیا تھا۔ بہت بے بس ہو کر اس نے مصحف کا بازو تھاما تھا، جس کی ابھی کچھ ہی دیر پہلے آنکھ لگی تھی۔

”پانی۔“ بہت بے بس پکار تھی، مگر وہ فوراً اٹھا اور پانی لے کر آیا۔ اُجالا نے ایک ہی گھونٹ لے کر منہ موڑ لیا۔

”بخار بہت تیز ہو گیا ہے اُجالا! میں کسی ڈاکٹر کا پتہ کرتا ہوں۔“

”نہیں۔ بس آپ میرے پاس رہیں پلیز!“

”بہت اسٹوپڈ لڑکی ہو تم، قسم سے۔“ وہ جھنجھکیا تھا۔ اُجالا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا مصحف! میں اس شادی سے خوش نہیں ہوں۔ کیونکہ۔۔۔۔۔ کیونکہ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔ بکواس کی تھی میں نے۔ بچپنا تھا وہ میرا۔۔۔۔۔ میرے اللہ نے اس سے بہتر لکھا تھا میری قسمت میں، پھر وہ کیسے مل جاتا مجھے؟“

”یہ بات اس وقت کیوں یاد آ گئی؟“ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ اُجالا نے آنکھیں بند کر لیں۔

”بس یو نہی۔۔۔۔۔ میں سوچ رہی تھی، نانو کو ساری حقیقت بتا دوں اور پھر ان سے کہوں کہ جہاں آپ چاہتے تھے، وہ وہاں آپ کی شادی کر دیں۔“

”سوچ تو بہت اچھی ہے۔ مگر پھر تمہارا کیا بنے گا؟“

”کچھ نہیں۔ میں اپنے ابا جی کے پاس رہ کر ان کی خدمت کروں گی۔“

”مگر تم نے تو کہا تھا، تمہارا دنیا میں کوئی نہیں۔“ اب وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔

”ہاں۔ بس ایک ابا جی ہیں۔ وہ بھی سمندر پار۔“

”چلو پھر، ابا جی کو واپس آنے دو، تب تک میں ایک ہی بیوی سے گزارہ کر لوں گا۔“ شرارت سے کہتے ہوئے اس نے پھر اسے اپنے برابر میں گرا لیا تھا۔

”ویسے فرض کرو، اس رات جب تم بھاگ کر آئیں اور جس طرح سے تم نے بنا سوچے سمجھے ایک اجنبی گھر میں پناہ لی، اس وقت اگر تمہارے ساتھ بہت کچھ غلط ہو جاتا تو؟“

”ہو سکتا تھا۔ بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر جگہ، ہر کسی کو مصحف علی میر ملے، یہ ضروری نہیں۔ مگر۔۔۔۔۔ اس وقت تو مجھے صرف اپنی عزت کی پروا تھی۔ وہ میری عزت چھین کر پھر موت کے گھاٹ اتارتے مجھے، اور یہ

مجھے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اپنے رب کے پاس جانے کا تصور ہی نہیں تھا میرے پاس۔ اسی لئے اگر سامنے سمندر بھی بچاؤ کے لئے ہوتا تو میں اس میں کود جاتی، اپنا جان کی پروا کئے۔“

”اور اگر اس وقت جس حال میں ہم لوگ بیٹھے تھے، ہمارے ہی ہاتھوں تمہاری عزت چلی جاتی تو؟“

”مجھے اپنے رب پر یقین تھا۔ جس پاک و بے نیاز ہستی نے تین دن ایک اوباش کے گھر میں محصور ہونے کے باوجود مجھے پاک رکھا، وہ آگے بھی میری عزت کی حفاظت کرتا۔ بس مجھے کوشش کرنی تھی اور وہی میں نے کی۔“

”ہاں۔ مگر تم نہیں جانتیں اُجالا! میں کتنا اوباش ہوں۔ دنیا کا کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو میں نے نہ کیا ہو۔ تم جتنی پاک ہو، میں اتنا ہی غلیظ شخص ہوں۔ اسی لئے تو دور رہتا ہوں تم سے، نانو سے کہ کہیں میرے جسم سے اُٹھتی سرائڈ تم دونوں پر میری حقیقت نہ کھول دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اُجالا کہ جب

”ابا جی۔۔۔۔۔“

اُس روز وہ ضد کر کے مصحف کے ساتھ فیکٹری جا رہی تھی، جب راستے میں اس کی نگاہ غلام محمد صاحب پر پڑی تھی۔ نورانی چہرے کے ساتھ، وہ چھٹری کے سہارے، تنہا کہیں جا رہے تھے۔ وہ تڑپ اُٹھی۔

”مصحف!۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ میرے ابا جی۔ پلین گاڑی روکیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔“

وہ چونکا تھا اور فوراً بریک لگائی۔

اُجالا گاڑی رکتے ہی بچوں کی طرح بے تابی سے باہر نکلنے لگی تھی، جب اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

”اگر انہوں نے مجھ سے تمہاری شادی کو پسند نہ کیا تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

کس موقع پر کیسا مشکل سوال داغ دیا تھا اس نے۔ وہ کچھ پل خاموش رہی، پھر اپنا کوئی جواب دیئے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ مصحف کو لگا جیسے اس پل اس کے اندر دھواں ہی دھواں بھر گیا ہے۔

مومن مرد کے لئے مومن عورت اور بدکار مرد کے لئے بدکار عورت ہے تو تم مجھے کیسے مل گئیں؟“

”اس میں بھی میرے اللہ کی کوئی حکمت ہو گی۔ ہو سکتا ہے، آپ نے کوئی ایسی نیکی کی ہو، جس کے صدقے اللہ نے مجھے آپ کی زندگی سنوارنے کے لئے بھیج دیا ہو۔“

وہ اب مسکرا رہی تھی۔ مصحف نے اسے اور قریب کر لیا۔

”پھر سنوارو نایار!۔۔۔۔۔ اب تو سب کچھ حقیقی ہے۔“ اُس کے انداز بدلے تھے اور اُجالا حقیقی معنوں میں پہلی بار گھبرا گئی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہو جائے گی قسم سے۔ تم تو جانتی ہی ہو گی، شوہر کے کتنے حقوق ہیں بیوی پر۔“ وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اُجالا کو اُس کے سامنے شکست تسلیم کرنی پڑی تھی۔

اس نے اپنے ابا کو پکارا تھا اور پھر روتے ہوئے ان کے سینے سے جا لگی تھی۔ وہ چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد وہ اپنے ابا جی کے ساتھ واپس پٹی تھی اور اس کی طرف کھڑی پر جھکتے ہوئے بولی تھی۔

”مصحف!۔۔۔۔۔ کیا آپ میرے ساتھ بھائی کے گھر چلیں گے؟“

اور جانے کیوں اس کا سر اثبات میں ہل گیا تھا۔ غلام محمد صاحب راستے میں صرف اُجالا سے ہی زیادہ بات کرتے رہے تھے۔

مقررہ مکان کے آگے گاڑی رکنے کے بعد جب وہ گیٹ کھول کر آگے بڑھے تو اُجالا نے چپکے سے مصحف کا ہاتھ تھام لیا۔ سعد اس وقت گھر پر ہی تھا۔ وہ ظہر کی نماز کے لئے ابھی نکلنے کا قصد ہی کر رہا تھا، جب ابا جی کے ساتھ اُجالا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”اُجالا۔۔۔۔۔“ وہ صرف حیران تھا، غضب ناک نہیں ہوا تھا۔ غلام محمد صاحب

نے سکون سے بیٹھ کر اسے ساری بات سنا دی، جو اُجالا راستے میں رو رو کر انہیں بتا چکی تھی۔ مصحف نے اس موقع پر خود کو غیر ضروری جانتے ہوئے شائستگی سے رخصت لے لی۔ سعد اب ساری بات سن کر رو رہا تھا۔

”اس نے غلط کیا نا ابا جی!۔۔۔۔۔ مجھ پر اعتبار نہیں کیا، غیروں پر کر لیا۔ کیا میں اتنا جاہل تھا کہ کچھ بھی سنے بغیر اسے قتل کر ڈالتا، یا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیتا۔ سات سال بڑی ہے یہ مجھ سے، کیا میں ایسا کر سکتا تھا؟“

”میں ڈر گئی تھی۔ پھر مجھے یہ بتایا گیا کہ تم یہ گھر چھوڑ کر کہیں جا چکے ہو۔“

”بکواس کی ہو گی کسی نے۔ میں نے تو سب کو یہی بتایا کہ تمہیں شہر سے باہر جاب مل گئی ہے اور تم وہاں شفٹ کر گئی ہو۔ تم نے ایک بار بھی نہیں

سوچا اُجالا! کہ میرا کیا ہو گا۔ دو بار موت کے منہ سے بچ کر آیا ہوں میں۔“ وہ اب بھی رو رہا تھا۔ اُجالا نے اُس کے ہاتھ تھام لئے۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے سعد! یقیناً تمہاری جگہ کوئی اور بھائی ہوتا تو کبھی میرا یقین نہ کرتا۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ پلیز!“ وہ رو پڑی تھی۔ سعد بھی روتا رہا۔

”مجھے تم پر نہیں، اپنے رب پر یقین تھا۔ اور پھر انسان کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کی زندگی میں۔ مجھے یقین تھا، تم کسی بھی حادثے کا شکار ہو کر مر سکتی ہو مگر اپنے ایمان اور وقار کا سودا نہیں کر سکتیں۔“



کیسا پختہ یقین اور ایمان تھا اس کا اپنے رب پر۔ اُجالا، غلام محمد کی گود میں سر چھپائے دیر تک روتی رہی۔ سعد کی بیوی میکے گئی تھی، لہذا وہ دونوں بہن بھائی، غلام محمد صاحب کے بستر میں ان سے جڑے بیٹھے رات عشاء کی نماز کے بعد بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔

اُجالا نے اُنہیں غلام عباس کی فیملی اور مصحف و نانو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ جواب میں سعد نے بتایا کہ بسمہ کی ڈیبتھ ہو گئی تھی، اسے اس کے اوباش شوہر نے زہر کھلا کر مار دیا۔ جبکہ ندانے ولید کے قتل کے بعد ایک ڈے کیئر سینٹر میں ملازمت کر لی تھی۔ وہ اتنی بدل گئی تھی کہ سعد بھی اسے نہ پہچان سکا۔ عباد ایک دو روز میں پاکستان آنے والا تھا۔ سعد بتا رہا تھا کہ ابھی کچھ روز پہلے اس نے تایا کو دیکھا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت کا سودا کرنے والا وہ شخص، راستے میں بیٹھا اپنے سر میں خاک ڈال رہا تھا۔

اس رات اُجالا نے تہجد کی نماز اپنے گھر میں اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ ادا کی تھی۔ غلام محمد صاحب کا اب بھی وہی حال تھا۔ مصلے پر بیٹھے روتے رہے۔ اُجالا کو بھول ہی گیا تھا کہ وہ پیچھے کچھ چھوڑ کر آئی ہے۔

مصحف جب سے اسے چھوڑ کر گیا تھا، بے چین تھا۔ بار بار سیل اُٹھا کر دیکھتا کہ کہیں اس کی کال یا میسج نہ آیا ہو۔ نانو کو تو اس نے مطمئن کر دیا تھا مگر خود کو نہ کر سکا۔ اندر جیسے آگ دہک اُٹھی تھی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ فیکٹری بھی نہ جا سکا۔ شہریار اپنی بیوی کے ساتھ مصروف تھا، حمزہ ملک سے باہر چلا گیا تھا اور شاہ میر، اس کے پاس اب ٹائم کہاں تھا۔ اس کا دل چاہا، وہ اپنے نظر انداز کئے جانے پر اسے کال کر کے خوب کھری کھری سنائے، جو اسے اپنوں میں بھول بیٹھی تھی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

نہ نیٹ میں دل لگ رہا تھا، نہ کسی لڑکی سے chat میں۔۔۔۔۔ نہ جانے یہ سب کیا تھا؟

بہت دیر بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد، جب جب تکلیف بڑھتی گئی تو وہ اُٹھا اور سیدھا واش روم میں گھس گیا۔ اُجالا نے کہا تھا، اللہ کی یاد میں سکون ہے،

ٹھنڈک ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ بات کتنے فیصد صحیح ہے۔ صرف اپنے مفاد کے لئے اس روز، بارہ سال کے بعد وہ اپنے رب کے حضور پیش ہوا تھا۔ پہلے پہل بہت دماغ الجھا، ادائیگی بھی صحیح نہ ہوئی۔ وہ اللہ کا نام لیتا اور تصور میں اُجالا کا چہرہ آ کر اسے بھٹکا دیتا۔ تاہم ایک گھنٹے کے بعد اس کی کیفیت نارمل ہو گئی۔ اپنے خالق حقیقی کے ذکر میں وہ یوں کھویا کہ خود اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔

زندگی میں پہلی بار اس رات وہ بہت رویا تھا، اپنی گمراہی پر، اپنی بے خبری پر۔ بار بار یہ خیال آتا کہ اگر اسی حال میں اسے موت آ جاتی تو وہ اپنے رب کے پاس کیا لے کر جاتا؟

صبح فجر کی نماز کے بعد اسے لگا کہ پرانے مصحف علی میر کی موت ہو گئی ہو اور اس کے اندر ایک نئے مصحف علی میر نے جنم لیا ہو۔ وہ مصحف علی میر، جس پر اس کے رب نے آگاہی کے در وا کر دیئے ہوں، جو اپنی حیثیت، اپنی اوقات اور اپنے رب کا مقام جان گیا ہو۔ وہ رب کہ جس نے رات اس کے

تڑپتے دل کو سکون بخشتا تھا۔ صبح نماز کے بعد ابھی وہ بستر پر لیٹا تھا کہ اُجالا کی کال آ گئی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟“ اس کا لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔ وہ چونک گئی۔

”بہت خوش۔ آپ کیسے ہیں؟ اور رات میرے بغیر نیند آئی کہ نہیں؟“

”نہیں۔“ کتنی سادگی سے اعتراف کر لیا تھا اس نے۔ وہ ہنس پڑی۔

”پھر تو اب عادت ڈالنی پڑے گی۔ کیونکہ میرے ابا جی کو میرے لئے اپنے جیسا پرہیزگار لڑکا پسند ہے۔ اگر تم اب بھی نہیں سدھرو گے تو وہ مجھے تمہارے پاس نہیں بھیجیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ اپنے ابا جی سے کہو، مجھے کچھ دنوں کی مہلت دیں۔“

”کتنے دنوں کی؟“ دوسری طرف وہ مذاق میں لے رہی تھی۔

”بس کچھ دنوں کی۔ صبح میں شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ تم پلیز ابا جی کے ساتھ

گھر واپس آ جانا۔ نانوائیلی ہوں گی۔ میں کچھ روز میں واپس لوٹ آؤں گا۔“

کہنے کے ساتھ ہی اس نے سیل آف کر دیا تھا۔ اُجالا اُلجھ کر رہ گئی۔ اگلے روز وہ اس کی گھر واپسی سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ نانو دیر تک غلام محمد اور سعد سے ماضی کی باتیں کرتی رہیں۔

ایک دن، دو دن، تین دن، وقت جیسے پَر لگا کر اڑا رہا تھا اور ادھر اُجالا کی جان پر بنی تھی۔

اس روز اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بڑی مشکل سے نانو کے ساتھ ہسپتال گئی تو وہاں ملنے والی خوشخبری نے اُسے رُلا دیا۔ وہ اُمید سے تھی اور اس کے محبوب کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ اب تو نانو بھی بہت متفکر رہنے لگی تھیں۔

اُجالا کو لگا، جیسے اس کا ضبط ٹوٹنے لگا ہو۔ مصحف کے بغیر اتنے دن وہ جس عذاب میں کاٹ رہی تھی، یہ محض اس کو پتہ تھا یا اس کے پاک رب کو۔ نماز میں بھی اب اس کا دل پہلے کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔ اس روز تھک ہار کر وہ نماز میں رو پڑی تھی۔ ہر دعا صرف مصحف کے لئے مانگتے ہوئے وہ پھر سے اپنے رب کے سامنے جیسے ضدی بچی بن گئی تھی۔

”اے اللہ! تُو جانتا ہے، میں بہت گناہ گار ہوں۔ میرا ایمان اتنا مضبوط نہیں کہ تیرے ذکر کی پناہ کے بعد میں ہر چیز سے غافل ہو جاؤں۔ تیرا کرم ہے مجھ پر۔ تیرا رحم ہے۔ مجھ گناہ گار کو اور مت آزما۔ اے اللہ! ہم لڑکیاں بہت کمزور ایمان، بہت کمزور نفس کی مالک ہیں۔ ہماری زندگی میں جب تک کسی ایک سچے مخلص ساتھی کا سہارا میسر نہیں آتا، بھٹکتی رہتی ہیں، سکون نہیں ملتا۔ تُو نے اپنے کرم سے مجھے ہر عذاب اور مصیبت سے محفوظ رکھا ہے، اب بھی میرے ایمان کا بھرم رکھ لے میرے مولا! میرے سچے مخلص ساتھی کو واپس بھیج دے۔“

صبح فجر کی نماز میں اس نے دعا مانگی اور شام میں وہ لوٹ آیا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، سر پر ٹوپی، نور سے دمکتا چہرہ اور سادہ لباس۔ وہ جو نانو کے لئے پرہیزی کھانا بنا رہی تھی، اسے اس حال میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”کیسی ہو پرنسز؟“ وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا تھا۔ اُجالا کی آنکھیں بھر آئیں۔ نانو البتہ اُس کے لئے لینے لگی تھیں۔ جواب میں وہ انہیں گلے لگا کر اپنی جماعت کا احوال سنانے لگا۔ اُجالا کو لگا جیسے اس کا دل رُک جائے گا۔ کیا تھا اس

شخص میں کہ وہ زندگی بن گیا تھا۔ آنسو تھے کہ اسے اتنے دنوں کے بعد مقابل دیکھ کر روکے نہ رک رہے تھے۔

وہ نانو کو مطمئن کرنے کے بعد اس کے بازو پکڑ کر اسے کمرے میں لایا تھا۔ ”میرا خیال تھا، اتنے دنوں کے بعد تم مجھے سامنے دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔ مگر یہاں تو آنسو ہی نہیں رک رہے۔ کیا مجھے نہیں آنا چاہئے تھا؟“

”ہاں۔ نہیں آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ تم بہت برے ہو۔“ وہ روتے ہوئے دھاڑی تھی۔ جواباً وہ مسکرا دیا۔

”یا اللہ!۔۔۔۔۔ جب برا تھا، تب خوش تھیں۔ اب ہدایت کا راستہ پا لیا ہے تو رو رہی ہو۔“

”بھاڑ میں جائیں میری طرف سے۔ میرا کوئی واسطہ نہیں آپ سے۔“

”بکھی تم، کبھی آپ۔ لگتا ہے لڑکی! تمہارا دماغ چل گیا ہے میری جدائی میں اور توبہ استغفار! کچھ تو سوچو، کہاں بھیج رہی ہو مجھے؟“

اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے محبت سے اسے ساتھ لگایا تھا۔ جواباً وہ خاموشی سے روتی رہی۔

”خود ہی تو کہا تھا یار! کہ ابا جی کو پرہیزگار لڑکا پسند ہے۔ مجھ سے پوچھو، پرہیزگار بننے کے لئے یہ تین ماہ کیسے گزارے ہیں۔ بہت مشکل ہے اُجالا! برائی سے دامن چھڑا کر کامیابی کے راستے پر چلنا اور پھر اس پر ڈٹے رہنا۔ بہت مشکل ہے۔ قدم قدم پر شیطان پاؤں تلے سے زمین کھینچنے آتا ہے اور قدم قدم پر ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اب تم جیسی اچھی لڑکی کے قابل بننے کے لئے یہ جنگ تو ضروری تھی نا۔ نفس کے خلاف جنگ۔۔۔۔۔ اب تو تمہارے ابا جی مجھے ریجیکٹ نہیں کریں گے نا؟“

وہ اسے بہلا رہا تھا۔ اُجالا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”جزاک اللہ! چلو اب پلیز چپ کر جاؤ نا۔ وہ نانو کسی خوشخبری کا ذکر کر رہی تھیں۔ ذرا بتانا مجھے، کیا خوشخبری ہے؟“

”تمہارا سر۔“ سر اٹھا کر خفگی سے کہتی وہ اس کے حصار سے نکل گئی تھی۔ جبکہ مصحف کھل کر ہنستا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے امید ہی نہیں، یقین بھی تھا کہ



وہ اپنی محبت سے اسے منالے گا۔ اس لڑکی کو کہ جو واقعی اُجالا بن کر اس کی  
بے مقصد اور تاریک زندگی کو منور کر گئی تھی۔

☆...☆...☆

ترے آسمان تلے

مجھے کنارے کی کب تمنا

تجھے ہے دریا کے پار جانا

پھرے دریا کی سرخ موجیں بتا رہی ہیں

خراج مانگے گا پھر سے دریا

جو میری مانو تو ایسا کر لو، مجھے شریکِ سفر بنا لو

خراج مانگے جو تم سے دریا

مجھے بھنور میں اُتار جانا

تیرا ضروری ہے پار جانا۔۔۔۔۔

وہ ابھی ابھی صبح کی سیر سے واپس لوٹا تھا۔ فضا میں خنکی پچھلے دنوں کی نسبت

زیادہ تھی۔ عبیرہ نے کشادہ برآمدے کے جھروکوں سے اسے دیکھا۔ پھر فوراً

دبے پاؤں اس کے پیچھے آتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہاتھ اس کی آنکھوں  
پر رکھ دیئے۔

”بوجھو تو جانیں۔“ ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ سوید  
آزر نے جواباً اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔

”بیہ۔۔۔۔۔“ تازہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بھی تھی۔ عبیرہ احساسِ تفاخر  
سے مسکرا دی۔

”کب آئیں؟“ اگلے ہی پل وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر ذرا سا جھکتے ہوئے اپنے  
پاؤں کو بوٹوں کی قید سے آزاد کر رہا تھا۔ عبیرہ کن آنکھیوں سے اس کی طرف  
دیکھتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”راتِ عشاء کی نماز کے بعد آئی تھی۔ مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ جناب اپنے  
آفس کی طرف سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں اور یہ کہ رات دیر سے گھر  
واپس لوٹیں گے۔ تب مجبوراً انتظار سے تھک کر سونا پڑا۔“

”او۔۔۔۔۔ اگر مجھے خبر ہوتی کہ محترمہ بنا اطلاع کے میرے گھر تشریف فرما ہیں تو یقیناً جلدی آ جاتا۔ یا رات میں ہی نیند سے اٹھا لیتا۔ مگر۔۔۔۔۔ چلو خیر اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہوں میں۔ اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟“

دونوں جرابیں ہاتھوں میں لئے اب وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عبیرہ کو بے ساختہ نگاہ چرانی پڑی۔

”سوید۔۔۔۔۔!“

”جی جانِ سوید!“ وہ اس کے چہرے پر واضح اضطراب کی کہانی پڑھ رہا تھا۔  
عبیرہ کی آنکھیں پل میں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ اس وقت تمہارے گھر میں کیا چل رہا ہے؟“

”جانتا ہوں، مگر یہ نئی بات نہیں ہے میرے لئے۔ بچپن سے اب تک یہی ماحول دیکھتے بڑا ہوا ہوں۔ تم ٹینشن مت لو۔“

”نہیں چاند!۔۔۔۔۔ تم اس طوفان سے باخبر نہیں ہو، جو کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں، روحیل انکل کو۔ وہ ضد کے بہت پکے ہیں۔ میں کچھ بھی غلط نہیں چاہتی۔ مجھ جیسی سو عبیرائیں میرے چاند پر قربان۔“

اس بار وہ رو پڑی تھی۔ سوید آزر نے لب بھینچ کر رُخ پھیر لیا۔

”تم بھول رہی ہو عبیرہ! کہ میں بھی انہی کا بیٹا ہوں۔ اگر وہ ضدی ہیں تو میری ضدی فطرت کا اندازہ بھی تمہیں بخوبی ہونا چاہئے۔“

”مجھے اندازہ ہے۔ مگر میں کسی بھی طور سے تمہارا نقصان نہیں چاہتی سوید! میں تمہیں اذیت میں نہیں دیکھ سکتی۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ میں مزید خالہ امی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ سوید! مجھ سے یہ اذیت برداشت نہیں ہو رہی۔“ اس کے آنسو پھر شدت سے بہنے لگے تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔ ساری عمر کی اذیت سمیٹنے کا کہہ کر یہ تو مت کہو عبیرہ! کہ تم مجھے اذیت میں نہیں دیکھ سکتی۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ میں مزید خالہ امی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی سوید! مجھ سے یہ اذیت برداشت نہیں ہو رہی۔“ اس کے آنسو پھر شدت سے بہنے لگے تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔ ساری عمر کی اذیت سمیٹنے کا کہہ کر یہ تو مت کہو عبیرہ! کہ تم مجھے اذیت میں نہیں دیکھ سکتیں۔ اور جہاں تک امی کی بات ہے تو وہ بھی

نہیں چاہتیں کہ ان کا اکلوتا، ذہین و فطین بیٹا ایک پاگل لڑکی سے شادی کر کے جیتے جی مر جائے۔ کوئی ماں ایسا نہیں چاہ سکتی۔ وہ صرف مجبور ہیں اور میں اپنی زندگی ان کی مجبوری پر قربان نہیں کر سکتا۔“ سوید کا لہجہ اٹل تھا۔ عبیرہ اپنے آنسو پی کر رہ گئی۔

”تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے سوید! یہ لوگ تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیں گے۔ نکال دیں گے تمہیں اس گھر سے۔ اور تم جانتے ہو، اگر ایسا ہوا تو خالہ امی ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ پھر کیا کرو گے تم؟ کہاں سے لاؤ گے اپنی مامتا؟۔۔۔۔۔ زندگی میں لڑکیاں بہت مل جاتی ہیں چاند!۔۔۔۔۔ مائیں نہیں ملتیں۔“

بھرائے لہجے میں کہا عبیرہ کا یہ جملہ سوید کے دل پر گھونسلے کی طرح لگا تھا۔

”مجھے جذباتی بلیک میل مت کرو عبیرہ! پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں میں۔ اور تو شکستہ مت کرو۔ یہاں یہ سب لوگ کم تھے کہ تم بھی۔۔۔۔۔“ دکھ سے اس کا گلا رُندھ گیا تھا۔ عبیرہ کا سر پھر جھک گیا۔

”شکستہ پا ہی تو نہیں کرنا چاہتی میں تمہیں۔ اسی لئے تو دیکھو خود اپنا دل لہو لہان کر کے تمہیں کسی اور کی رفاقت کے لئے مجبور کرنے چلی آئی۔ تم کیا سمجھتے ہو سوید! کیا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟۔۔۔۔۔ میں جو اتنی پٹھی ہوں تمہارے معاملے میں کہ ہوا کا تمہیں چھونا بھی برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔ کیسے، کس دل سے تمہیں کسی اور کا ہونے کو کہہ رہی ہوں۔ کیا تم نہیں سمجھ سکتے؟ تم صرف میری محبت نہیں ہو سوید! میری دھڑکن، میرا ایمان، میرا سکون، میری کل کائنات ہو تم۔ بہت جذباتی ہوں تمہاری محبت کے معاملے میں، میں۔ مگر میں خالہ امی سے بھی بہت پیار کرتی ہوں سوید!۔۔۔۔۔ میری وجہ سے ان کی جان چلی جائے، مجھے مر کر بھی یہ بات گوارا نہیں ہو سکتی۔ وہ میری خالہ نہیں، ماں ہیں سوید! ایک حقیقی ماں بن کر ہی پالا ہے انہوں نے مجھے۔ ان کے آنسوؤں پر میں اپنی محبت تو کیا، سارا جہان وار دوں، پھر بھی کم ہے۔ اور پھر انہوں نے ہی مجھے بتایا ہے، وہ لڑکی قطعی اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی۔ سمجھو ٹوٹل پاگل ہے۔ تمہارے تو قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔ یہ شادی صرف دکھاوا ہو گا سوید! اور کچھ نہیں۔“

وہ شاید قسم کھا کر آئی تھی کہ اسے قائل کر کے رہے گی۔ سوید اندر سے مسمار ہوتا تلخی سے مسکرا دیا۔

”تو تم یہ طے کر کے آئی ہو کہ مجھے ہرا کر رہو گی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہیں ہارا ہوا ہی تو نہیں دیکھنا چاہتی میں۔ اسی لئے تو شیئر کر رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر ایک شرط پر ہتھیار پھینکوں گا میں۔“ اس بار گہری سانس بوجھل فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے عبیرہ کا دل دھڑکایا تھا۔

”کیسی شرط۔۔۔۔۔“

”بہت انہونی نہیں ہے۔ میری زندگی کسی اور کے ساتھ شروع ہونے سے پہلے تم مجھ سے نکاح کرو گی۔۔۔۔۔ میری پہلی بیوی تم بنو گی۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے۔ میں بابا کی بات مان لیتا ہوں۔ اگر نہیں تو پھر ہونے دو جو ہوتا ہے۔ میں کسی کی کوئی بات نہیں مان رہا۔“ وہ ضدی تھا مگر عبیرہ کی محبت میں مخلص تھا۔ تبھی اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ پھر جا کر کہہ دو ان لوگوں سے اندر کہ میں قربانی کے لئے تیار ہوں۔ انہیں جو اوزار تیز کرنے ہیں، کر لیں۔“

اس بار سرعت سے اپنی بات مکمل کرتا وہ پھر وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔

عبیرہ سختی سے آنکھیں میچ کر مزید بہہ آنے والے آنسوؤں کو پیتی پھر کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی روتی رہی۔ زندگی کبھی ایسے کسی امتحان سے دوچار کر دے گی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

☆...☆...☆

”مومی!۔۔۔۔۔ آزر بھیا آئے ہیں۔ کیا نہیں ملو گی؟“

وہ لان میں بیٹھی، جھولی سے ایک ایک پھول اٹھا کر اسے پتی پتی کر رہی تھی، جب مریم عباس اس کے قریب چلی آئی۔ اُس کا سر بہت آہستگی سے نفی میں ہلا تھا۔

”نہیں۔“



”کیوں؟۔۔۔۔۔۔ کہاں تو ایک ایک پل ان کی آواز سننے کو پاگل ہوتی رہتی تھیں اور کہاں اب وہ واپس لوٹ آئے ہیں تو ملنا ہی گوارا نہیں۔ خیر تو ہے؟“

مریم کو اُس کے ’نہیں‘ نے حیران کیا تھا۔ وہ بے زار بے زار سی اس کے قریب سے اُٹھ گئی۔

”وہ بہت بدل گیا ہے مریم!۔۔۔۔۔۔ اب اس میں وہ پانچ سال پہلے والی کوئی بات نہیں رہی۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”میں نے اسے دیکھا ہے مریم!۔۔۔۔۔۔ اُسے قرۃ العین کے سوا دنیا میں دوسری کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی۔ پانچ سال میں یہاں۔۔۔۔۔۔ اُس کے لئے پل پل تڑپتی ہوں، مگر وہ گھمنڈی، بے حس شخص۔۔۔۔۔۔ اس نے ایک بار بھی تم سے یا کسی اور سے میرا نہیں پوچھا۔ اسے اپنی زندگی میں میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مریم!“ وہ آزدہ تھی۔ مریم دھیمے سے مسکرا دی۔

”پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔ ایک طرف جنونی محبت کا دعویٰ اور دوسری طرف ایسی شدید بدگمانی۔۔۔۔۔۔ ہائے کیا بنے گا میرے اکلوتے بھائی کا؟“ اس کے مصنوعی آہ بھرنے پر وہ چڑی تھی۔

”محبت تو کرتی ہوں نا یار!۔۔۔۔۔۔ وہ تھوڑی محبت کرتا ہے مجھ سے؟“

”وہ بھی کرنے لگیں گے۔ کوشش جاری رکھو۔ قطرہ قطرہ پانی سے سنا ہے پتھر میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے۔“

”تمہارا بھائی پتھر سے بھی بڑھ کر ہے، اچھا۔۔۔۔۔۔“

”ہا، ہا، ہا۔۔۔۔۔۔ میں تو تمہارے لئے صرف دعا ہی کر سکتی ہوں۔ آگے تمہارا نصیب۔“ مریم ہنسی تھی۔ مومی تپ کر ہاتھ میں پکڑے پھول کی پتیاں اس پر غصے سے اُچھالتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی جبکہ اوپر اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑا آذر عباس اُس کی اس حرکت پر نرمی سے مسکرا دیا۔

☆...☆...☆

عبیرہ لان سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آئی تو اُس کے سارے جسم میں درد کی لہریں سر پیٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں یوں جل رہی تھیں گویا کچھ ہی دیر میں ان سے لہو ٹپکے گا۔

ڈھیلے ڈھالے انداز میں خود کو صوفے پر گرا کر اس نے آنکھیں میچ لی تھیں۔  
اسے یاد آنے لگا تھا کہ جب وہ صرف چھ سال کی تھی تو اس کے محبوب بابا  
کی رحلت ہو گئی تھی، جس

کے بعد اس کی ماں فضیلہ بی اُسے ساتھ لے کر اپنے آبائی گاؤں اپنی بڑی بہن کے پاس چلی آئی تھیں۔ سوید اُن کی اسی بڑی بہن راحیلہ بی کا اکلوتا بیٹا تھا جس میں ان کی جان تھی۔

سوید کے بابا راحیل جعفری، اس کی ماں راحیلہ بی اور خالہ فضیلہ بی کے فرسٹ کزن تھے۔ شروع سے ہی راحیل جعفری کی ماں، راحیلہ بی اور فضیلہ بی کی ماں پر حاوی رہی تھی۔ کیونکہ وہ اس خاندان کی پہلی بہو تھی اور بے حد ہوشیار تھی۔ جبکہ راحیلہ بی کی ماں سیدھی سادی، حساس دل و دماغ کی مالک عام سی خاتون تھی۔ باطنی چالاکی کے ساتھ ساتھ وہ حُسن و صورت میں بھی اپنی دیورانی پر بھاری

تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حویلی میں برسوں تک راحیل جعفری کی ماں کا راج ہی رہا۔ سونے پر سہاگہ قدرت اولاد کے معاملے میں بھی ان پر مہربان رہی۔ وہ لگاتار چار بیٹیوں کی ماں بنی تھیں جبکہ راحیلہ بی نے پہلے دو بیٹیوں راحیلہ بی اور فضیلہ بی کو جننے کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا، جو عین جوانی کے عالم میں زمینوں اور جائیداد کے مسئلے پر اپنے باپ کے ساتھ، راحیل جعفری کے بڑے بھائی سہیل جعفری کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

راجیلہ بی ان دنوں پورے خاندان سے ٹکمر لے کر شہر میں پڑھ رہی تھیں۔  
اکلوتے بھائی اور باپ کی اندوہناک موت کی خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی۔  
وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فی الفور گاؤں واپس آئی تھیں جہاں ان کے  
گھر جیسے کہرام مچا تھا۔

سارا گاؤں قاتل کو جانتا تھا مگر۔۔۔۔۔ ان کے شر سے خوف زدہ ہو کر کسی نے بھی زبان نہ کھولی اور راحیلہ بی بے بسی سے، غم و غصہ پی کر رہ گئیں۔

اپنے تایا زاد سہیل جعفری کے ساتھ انہیں ان کے بقیہ تینوں بھائیوں سے بھی شدید نفرت تھی اور یہ نفرت اس وقت مزید دوچند ہو گئی، جب ان کی

ماں ایک صبح چپ چاپ اپنے سرالیوں کے مظالم کے دکھ سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ابھی یہ درد بھی تازہ تھا کہ اس کی نفرت اور خود سری کو ضد بناتے ہوئے راحیل جعفری نے ان سے شادی کا شوشہ چھوڑ دیا۔ راحیلہ بی اس شادی کے لئے کسی طور تیار نہ تھیں مگر وہ پنجرے میں قید پنچھی ک مانند محض پھڑپھڑا کر رہ گئیں۔ ان کی نفرت کو اپنی ضد بناتے ہوئے راحیل جعفری نے ان سے شادی تو کر لی مگر انہیں بیوی کی حیثیت سے بھی تسلیم نہ کیا۔ وہ عورت جو تائی کے روپ میں انہیں زہر لگتی تھی، اب ساس بن کر مزید قہر ڈھانے لگیں۔ چند دنوں میں ذہنی اور اور جسمانی طور پر انہیں کچھ یوں ٹارچر کیا گیا کہ وہ جو شعلہ جوالہ تھیں، بجھ کر رہ گئیں۔ دورے پڑنے لگے اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ فضیلہ بی جو راحیل جعفری سے چھوٹے عقیل جعفری کی جنوں خیز محبت سے ہار گئی تھیں، یہاں اس مقام پر آ کر ان سے شادی سے انکاری ہو گئیں کہ اپنی بڑی بہن کو مزید دکھ سے ہمکنار کرنا انہیں کسی طور گوارا نہیں تھا۔

حویلی میں واحد عقیل جعفری تھا، جو روایتی جاگیردار ثابت نہیں ہوا تھا، بلکہ فضیلہ بی کی غیر متوقع بے وفائی کے بعد وہ گاؤں تو کیا، ملک چھوڑ کر ہی چلا گیا۔ کتنے عہد، کتنے پلان، دونوں کی زندگی کے بیچ ادھورے رہ گئے تھے۔ نفرتوں کے سلسلوں کو محبت کی بارش سے دھونے کا ان کا عزم بس عزم ہی رہ گیا۔ اور فضیلہ بی اسی گاؤں کے نمبردار کے بیٹے کی دلہن بن گئیں۔ سوید اُن دنوں محض چار سال کا تھا اور سارا سارا دن عقیل جعفری کو یاد کر کے ”چاچو، چاچو“ کہتا روتا رہتا تھا۔ جو شفقت اسے باپ سے ملنی تھی، وہ چچا نے دی تھی۔ مگر زیادہ عرصہ یہ شفقت بھی اس کا نصیب نہ رہ سکی اور وہ پھر سے محرومیوں کی گود میں آگرا۔ جن دنوں فضیلہ بی بی کی گود میں عبیرہ آئی، انہیں حویلی سے عقیل جعفری کے بیرون ملک نکاح کی خبر ملی اور وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئیں۔ چار سالہ ننھے سوید کے ذہن سے عقیل کا تصور بھی نکل گیا۔ البتہ وہ عبیرہ کو پا کر بہت مسرور تھا۔ اُس کا بس نہ چلتا تھا کہ عبیرہ سارا دن ان کی بانہوں میں کھیلنے کے بعد، رات کو بھی اسی کے پاس سوتے۔

بہت سے پیمان تھے جو بن کہے دونوں کے بیچ بندھ گئے تھے اور بہت سی ذمہ داریاں تھیں جو دونوں نے خود بخود اپنے ذمہ لے لی تھیں۔

عبیرہ رہ رہ کر اس وقت کو کوس رہی تھیں جب تین روز قبل شام میں وہ ہوٹل سے گھر آئی تھی۔ شہر میں ان کا مکان تعمیر ہو چکا تھا اور آدھے سے زیادہ سامان بھی نئے گھر میں شفٹ کیا جا چکا تھا جب اچانک راحیل جعفری نے نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ ان کے فرمان کے مطابق ان کے لاڈلے بھائی عقیل جعفری اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے لئے راحیل جعفری اور ان کے اکلوتے بیٹے سوید سے درخواست گزار تھے۔ یہ خبر کسی طرح ہضم ہو ہی جاتی کہ سوید کو یہ پتہ چل گیا کہ عقیل جعفری، ان کے امیر کبیر لاڈلے چچا اپنی جس اکلوتی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرنا چاہ رہے ہیں، وہ پاگل ہے اور کوئی بھی شخص اسے اپنانے کو تیار نہیں۔

راجیل جعفری نے اپنے بھائی کی محبت اور بڑے بھائی سہیل جعفری کے دباؤ میں، اپنا کسی سے بات کئے نہ صرف یہ رشتہ طے کر دیا بلکہ شادی کی تاریخ بھی

اُس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی مگر پورے چھ سال بعد۔ جب فضیلہ بی پر شوہر کی ناگہانی اچانک موت نے فالج کا اٹیک کر دیا اور وہ زندہ لاش بن کر محض بستر کی ہو رہیں۔ ایسے میں راحیلہ بی نے ہی تمام تر مشکلات اور اذیتوں کا سامنا کرتے ہوئے نہ صرف ان کی دیکھ بھال کی بلکہ عبیرہ کو بھی سنبھالا۔ وہ بستر پر ایک طرف بیٹھے کو ساتھ لے کر سوتیں تو دوسری طرف عبیرہ کو۔

دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا روپ دھارتے وقت کا حصہ بنتے چلے گئے اور سوید، عبیرہ کے ساتھ نیچین کی دہلیز سے نکل کر جوانی کی شاہراہ پر آ کھڑا ہوا۔ دونوں کو خبر بھی نہ ہو سکی اور محبت ان دونوں کے پیچ جیسے پیچھے گاڑ کر بیٹھ گئی۔

کتنی یادیں تھیں جو اس محبت سے وابستہ تھیں۔ کتنے ایسے واقعات اور باتیں تھیں جو ان کی چاہت کی گواہ بنی تھیں۔ وہ اس کے مزاج کے ہر موسم کی آشنا تھی۔ اور سوید۔۔۔۔۔ اسے تو زندگی کا ہر رنگ نظر ہی اس کی خوب صورت آنکھوں میں آتا تھا۔



دے دی۔ عبیرہ یہ خبر سن کر ہی ہوٹل سے گھر آئی تھی جہاں اس وقت سویڈ کا پورا خاندان اسے گھرے ہوئے تھا۔

وسیع حویلی کے کشادہ ہال کمرے میں، جس وقت اس نے دہلیز پر قدم دھرے، سویڈ کے بابا راحیل جعفری کی کڑک دار آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

”مت بھولو بر خوردار! کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ پڑھا لکھا کر، پالنے پوسنے اور ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار و آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ آج تم باپ پر اپنی مرضی کے فیصلے مسلط کرو۔ مت بھولو کہ جتنے تم مجھے عزیز ہو، اتنی ہی دل آویز بھی عزیز ہے۔ وہ صرف عقیل کی نہیں، میری بھی بیٹی ہے۔ اگر کسی وجہ سے بیمار ہے تو اس میں اس پاگل کا کیا قصور؟۔۔۔۔۔ مشکل اور مصیبت میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ بھری دنیا میں کوئی اور اس کا سہارا بنے نہ بنے، تمہیں ضرور اس کا سہارا بننا ہے۔ بصورت دیگر تم یہ گھر اور اپنے والدین کو چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ میں یہ سمجھ لوں گا کہ عقیل اور سہیل بھائی کی طرح میرا بھی کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔“

”دھڑاک۔۔۔۔۔۔“ عبیرہ کو لگا جیسے اس وقت ساتوں آسمان اس کے سر پر آگرے ہیں۔ معاملہ اتنی شدید نوعیت کا ہو گا، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

سویڈ وہاں سب کے بیچ تنہا اپنے لئے لڑ رہا تھا۔ راحیلہ بی اس کے قریب یوں سر جھکاتے کھڑی تھیں، جیسے کسی گھناؤنے جرم کی مجرم ہوں۔ جبکہ سامنے کے صوفے پر راحیل جعفری، عقیل جعفری اور اس کی ماڈرن سی نفیس بیگم براجمان تھیں۔ دائیں طرف دھرے پلنگ پر سہیل جعفری اور اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ سویڈ اپنے باپ کی بات پر تپ کر اٹھا تھا۔

”ہونہ۔۔۔۔۔۔“ آپ سے اُمید بھی یہی رکھی جا سکتی ہے۔ کبھی باپ بن کر بیٹے کو پالا ہوتا تو آج یوں اتنی آسانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ آپ کیا سوچ کر حق جمارہے ہیں مجھ پر؟۔۔۔۔۔۔ میں آپ کی نوازشوں کا محتاج نہیں ہوں۔ میرے اور میری ماں کے حصے میں صدا قہر آیا ہے آپ کا۔ آپ کی نوازشیں تو سدا اپنے بھائیوں اور ان کی بیویوں پر رہی ہیں، پھر اب یہ خوش فہمی کیوں لاحق ہو گئی آپ کو کہ میں آپ کی خواہش کا احترام

جسم لے کر آج ہم کو ہی آنکھیں دکھا رہے ہو۔ یہی سکھایا ہے تمہاری ماں اور تعلیم نے تمہیں؟“ راحیل جعفری صاحب کے منہ سے کف بہہ رہے تھے۔ ایسے میں عقیل جعفری فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”بس کریں بھائی! اگر وہ راضی نہیں ہے تو زور زبردستی مت کریں۔ ایسے معاملے زور زبردستی سے زیادہ دیر نہیں چلتے۔ دل آویز کی قسمت میں اگر کوئی خوشی لکھی ہی نہیں تو بھلا میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟“ ان کے انداز میں شکستگی تھی۔ سوید جعفری نے شفر سے سر جھٹک دیا۔

”نہیں عقیل! میں نے تمہیں زبان دی ہے۔ اب اس سے پھرنا میرے لئے موت کے مترادف ہے۔ دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں کرتا دل آویز بیٹی سے شادی۔“ راہیل صاحب کی بھائی سے محبت اور واضح چیلنج پر سوید پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گیا تھا۔ جبکہ عبیرہ کو لگا جیسے اس کا وجود پتھر کا ہو گیا ہو۔ اس وقت اسے مزید کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ عجب قیامت پڑی تھی دل پر کہ وہ سسکی بھی نہ نکال سکی۔ اسی رات سوید

کروں؟۔۔۔۔۔۔ سوری والد محترم! یہ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چلتی ہے۔ میری ماں بے شک آپ کی جیتی ہوئی جنگ ہوں گی مگر میں آپ کا مفتوح علاقہ نہیں ہوں، نہ میں نے اپنی زندگی سنوارنے کے لئے کبھی آپ کی عنایتوں کی اس رکھی ہے۔ میں آج جس مقام پر ہوں، اپنی ماں کی دعاؤں اور مجتہدوں کے بعد اپنے بل بوتے پر ہوں۔ اس میں آپ کا کوئی کمال نہیں ہے۔ لہذا اس غلط فہمی کو دل سے نکال دیجئے کہ میں یہاں سے نکل کر جی نہیں سکوں گا۔ میں جیوں گا اور جی کر دکھاؤں گا۔ آپ رکھئے اپنی دھن دولت اپنے پاس سنبھال کر۔“ وہ بھی انہی کا بیٹا تھا۔ راحیل جعفری اُس کی اس قدر جرأت پر دنگ رہ گئے تھے۔

”چٹاخ“ کی زور دار آواز پر جہاں راحیلہ بی تڑپ کر اُٹھی تھی۔ وہیں عبیرہ کا ہاتھ بھی بے ساختہ اپنے دل پر پڑا تھا۔

”گستاخ، بد زبان! تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہمارے سامنے زبان چلانے کی؟ کس نے ڈالیں تمہارے ذہن میں ایسی باغیانہ باتیں اور سوچ؟ ہمارے خون سے

بنا کسی کو بتائے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اسی رات راحیلہ بھی ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر بمشکل منتوں اور دعاؤں سے زندگی کی طرف واپس لوٹی تھیں۔

سوید اس متوقع حادثے پر فوراً گھر تو واپس لوٹ آیا تھا مگر اس نے ہتھیار نہیں پھینکے تھے۔ راحیل جعفری صاحب سے مکمل خفا۔ وہ پورا ایک ہفتہ سب سے لڑا تھا، مگر۔۔۔۔۔ بالآخر عبیرہ نے اسے ہار ماننے پر مجبور کر ہی ڈالا تھا۔

اس رات وہ روئی تھی اور اتنا روئی تھی کہ صبح اس کا پورا وجود تیز بخار میں جل رہا تھا۔ اپنی ماں اور خالہ کی محبت میں مجبور ہو کر اس نے اپنا پیارا قربان کرنے کا حوصلہ کر لیا تھا مگر اب جوں جوں وقت گزر رہا تھا، اسے جیسے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

سخت گرمی کی چیلچلاتی دھوپ میں جس وقت اسے سوید کی باتیک کا ہارن سنائی دیا، وہ بے کل سی لب کاٹ کر رہ گئی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد بھی اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سوید ہارن پہ ہارن دے رہا تھا۔ وہ بہت مجبور ہو کر اس کی طرف بڑھی تھی۔

”بیٹھو۔۔۔۔۔“ کالج گیٹ سے نکل کر جونہی وہ اس کی طرف بڑھی، اس نے فوراً حکم صادر کر دیا۔ عبیرہ نے دیکھا، اس وقت وہ سخت تناؤ کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی وہ منمنائی تھی۔

”سوید! آئی ایم سوری۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، پھر میں بھی کسی صورت وہ نہیں کر رہا جو صحیح ہے۔“ وہ لب بھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عبیرہ کو تاؤ آ گیا۔

”تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”چپ چاپ بیٹھ جاؤ عبیرہ! سڑک پر تماشا مت بناؤ۔ پلیز!“

”سوید تم۔۔۔۔۔“

”بیٹھتی ہو کہ زبردستی پکڑ کر بٹھاؤں؟“ اب کے وہ غصے ہوا تھا۔ عبیرہ بے بسی سے ایک نظر اسے دیکھتی چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اگلے تیس منٹ میں وہ اپنے کسی جاننے والے وکیل کے پاس بیٹھا اسے سارا احوال سنا رہا تھا۔ عبیرہ اس دوران خاموش بیٹھی، اپنی شور مچاتی دھڑکنوں کو سنبھالنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سویڈ کے

ساتھ کورٹ میں کھڑی تھی اور اگلے چند لمحوں میں کچھ ضروری کاغذات پر چند دستخط گھسیٹ دینے کے بعد وہ عبیرہ شیرازی سے عبیرہ سوید ہو گئی۔ ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اس وقت اس کی انگلیاں بھی کانپ رہی تھیں۔ مگر سوید کی محبت اور گرم ہاتھوں کی حرارت نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ وہ خوش تھا۔ بے حد خوش۔۔۔۔۔ ساتھ ہی اس کے دوست بھی خوش تھے۔

کورٹ سے رخصتی کے بعد جب وہ اسے اپنے ایک دوست کے گھر لے کر آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے متمتا رہا تھا۔ والٹ میں موجود سارے پیسے اس نے کورٹ اور دوستوں میں مٹھائی کے لئے بانٹ دیئے تھے۔ عبیرہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تھینکس۔۔۔۔۔ تھینکس میری جان! کہ تم نے مجھے محبت کی۔ اس پُر کٹھن راہ پر بے آسراء تنہا بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ میں بہت خوش ہوں عبیرہ! اتنا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اور ہاں، آج سے میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔۔۔ بیوی ہونے کا حق میں صرف اور صرف تمہیں دوں گا۔ اس پاگل سے شادی کاغذی کارروائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی۔ جیسے ہی حالات ہمارے

حق میں ہوئے، میں وہ کاغذی بندھن توڑ دوں گا۔ میرے بچے اگر دنیا میں آئیں گے تو صرف تمہارے بطن سے۔ سمجھیں؟“

جگر جگر چمکتی روشن سیاہ آنکھوں میں اس کے لئے محبت ہی محبت تھی۔ عبیرہ نے پُر سکون ہو کر اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ سوید کی نرم گداز انگلیاں جانے کتنی دیر تک اس کے سلکی بالوں کو سہلاتے ہوئے اس پر عجیب سا سحر طاری کرتی رہی تھیں۔

☆...☆...☆

آزاد یزداد عباس حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کر کے پاکستان اپنے گھر واپس لوٹا تھا۔ عمر میں وہ مومی اور مریم سے پورے پانچ سال بڑا تھا۔ اس سے دو سال بڑا یاسر یزداد عباس تھا، جس نے لندن میں ہی اپنے والد کی رحلت کے بعد ان کے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ مومی ان کی اکلوتی خالہ زاد کزن تھی، جس کے نازک سراپے اور بے جا لاڈ پیار کے باعث انہی کی ماما آسیہ بیگم نے اس کا نام پیار سے مومی رکھ دیا تھا۔



آزر کو یاد تھا، جب وہ لوگ چھوٹے تھے تو دن بھر معمولی معمولی باتوں پر کتنا لڑتے تھے۔ وہ غصے ہو کر اگر اس کے بال کھینچتا تو مومی غضب ناک ہو کر اپنے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیا کرتی۔ کبھی کبھی وہ اتنی شدت سے بازو کاٹتی تھی کہ وہاں زخم بن جاتا تھا۔ اب بھی اس کے بائیں بازو پر مومی کے دانتوں کے نشان زخم کی صورت رقم تھے۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اب ان زخموں پر کھرند آ گیا تھا۔

مومی اور مریم نے میٹرک تک اسی کی درس گاہ میں تعلیمی مدارج طے کئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جھگڑوں کے باوجود وہ سکول میں ان دونوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ میٹرک کے بعد مومی کے والدین نے اچانک پاکستان واپسی کا فیصلہ کیا تو وہ بے قرار ہو گئی۔ مریم اور آزر کے بغیر کہیں رہنے کا خیال ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے وہیں رہ کر مزید پڑھنے کی ضد کر لی۔ آزر کو اس کی ضد کا پتہ چلا تو وہ بے حد حیران ہوا۔ کہاں تو ان کی لڑائیاں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں اور کہاں اب وہ موم کی گڑیا اس کے لئے رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔

اپنی اسی حیرانی کو دور کرنے کے لئے وہ اس کے کمرے میں اس کی ضد کی وجہ پوچھنے کے لئے آیا تھا، جب وہ مسل مسل کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

”آزر! تمہارے بغیر پاکستان میں میرا دل نہیں لگے گا۔“

”واہ۔۔۔۔۔ کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے پتہ نہیں کتنی گہری دوستی ہو ہماری۔  
جنگلی بلی! تم تو کل کو شادی کے لئے بھی یونہی اڑ جاؤ گی کہ مجھے تو آزر سے ہی  
شادی کروانی ہے، کسی اور کے ساتھ میرا دل نہیں لگے گا۔“

”ہاں تو اور کیا۔ شادی بھی تم سے ہی کرنی ہے مجھے۔ اور کسی سے نہیں۔“

”جی نہیں محترمہ!۔۔۔۔۔ معاف کرو مجھے۔ میں باز آیا ساری عمر کے لئے یہ

مصیبت مول لینے سے۔“

”کیا میں مصیبت ہوں؟“

مومی کو اس کے صاف جواب پر سخت صدمہ ہوا تھا۔ وہ شگفتگی سے مسکرا دیا۔

”اور نہیں تو کیا۔ میں یوری چڑیل ہوں۔ جنگلی بی۔“

”تم خود ہو گے جنگی بلے۔ اچھا خبردار جو دوبارہ مجھ سے بات کی تو۔ میں جا رہی ہوں پاکستان اپنے ددھیال والوں کے پاس۔ تم رہنا یہاں اپنی عینی، ٹینی کے ساتھ خوش و خرم۔“ اس کی توقع کے عین مطابق وہ چڑی تھی۔ اور آزر بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ اس کے لاکھ روکنے اور منانے کے باوجود اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلی آئی تھی۔ جبکہ آزر عباس اُس کی اس ضد پر کڑھتا رہ گیا تھا۔

مومی کے بغیر لندن جیسے خوب صورت ایڈوانس شہر میں اس کے پانچ سال بہت اُداس گزرے تھے۔ ایک طرح سے اسے مومی کو چڑانے، رُلانے اور پھر منانے کی عادی پڑ گئی تھی۔ اسے اشتعال دلا کر پھر اس کا جارحانہ روپ دیکھنا بہت لطف دیتا تھا اسے۔ مگر دلی غصے کی وجہ سے اس نے کبھی اس پر یہ بات کھلنے نہیں دی تھی۔ وہ پاکستان سے آئی اُس کی میلز کا جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ قرۃ العین جو بروکن فیمیلی کی ٹوٹی پھوٹی سی سمجھ دار لڑکی تھی اور پوری کلاس

میں اس کی واحد عزیز دوست تھی، اکثر اسے مومی کے حوالے سے چھیڑتی اور وہ کبھی ہنس کر، کبھی ڈانٹ کر اسے ٹال دیتا۔

اس کی فیمیلی، مومی لوگوں کے لندن سے کوچ کے ایک سال بعد ہی پاکستان شفٹ ہو گئی تھی۔ مگر وہ پاکستان نہیں آیا تھا۔ اپنی تعلیم مکمل ہونے تک وہ یاسر عباس کے ساتھ لندن میں ہی رہا تھا۔ اور یہی وہ بات تھی، جس نے مومی کو سب سے زیادہ ہرٹ کیا تھا۔

پورے پانچ سال بعد پاکستان واپسی پر عینی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ پاکستان میں اس کے ساتھ مل کر بزنس اسٹارٹ کرنا چاہتی تھی اور آزر کے لئے یہ خوشی کی بات تھی۔ تاہم اپنی واپسی پر شوق دید سے بے حال مومی کو، جو نکھر کر اور بھی پیاری ہو گئی تھی، اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا۔ ویسے بھی اس کی سوچ میں بہت مچھوڑی آ گئی تھی وہ اس سے پچھلے پانچ سال کی جدائی کا بدلہ اپنے ہی انداز میں لینے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔

☆...☆...☆

راحیلہ بی اور فضیلہ بی کو سوید آزر کے کارنامے کی خبر ہو چکی تھی اور دونوں اس پر بے حد مسرور تھیں۔ تاہم فضیلہ بی کے دل کو کچھ وسوسے ضرور گھیرے ہوئے تھے۔ سوید، عبیرہ کے ساتھ گھر واپس لوٹا تو وہ کتنی ہی دیر اس کا منہ چومتے ہوئے زار و قطار روتی رہی تھیں۔ وہ بد نصیب تھیں اپنا پیار نہیں پاسکی تھیں، تاہم ان کی بیٹی کے آنکھوں کے خواب ضرور تعبیر پا گئے تھے۔

دوسری جانب راحیلہ بی اپنی دلی تمنا کی تکمیل کے لئے اپنے بیٹے کی جرأت اور جائز حکمت عملی پر از حد مطمئن و مشکور تھیں۔ ان کا دل اپنے سوہنے رب کا شکر ادا کرتا نہ تھک رہا تھا۔ حویلی میں دلاویز جعفری سے سوید کی نکاح کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ تاہم اب انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ مسرور تھیں کہ ان کے دل نے جس لڑکی کو بہو کے روپ میں دیکھنے کی خواہش کی تھی، بالآخر پہلے وہی لڑکی ان کی اگوتی بہو کے منصب پر فائز ہوئی تھی۔

اس روز دل آویز جعفری کے ساتھ سوید کے نکاح کی تقریب تھی۔ دل آویز کی خراب طبیعت کے پیش نظر شادی کی دیگر رسومات سے پرہیز کرتے ہوئے

صرف نکاح کی تقریب ہی شایانِ شان طریقے سے اریج کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عبیرہ کو اس روز ہکا بکا بخار تھا۔ سوید شہر میں تمام انتظامات کی دیکھ بھال کے بعد گاؤں واپس آیا تو راحیلہ بی سے مل کر سیدھا اس کی طرف چلا آیا۔ جو اس وقت مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد جائے نماز پر بیٹھی چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔

سوید ایک سرسری نگاہ اس کے بھینگے چہرے پر ڈالنے کے بعد کسی لاپرواہی بچے کی مانند اس کی گود میں سر رکھ کر زمین پر ہی لیٹ گیا۔ عبیرہ نے چونک کر فوراً سے پیشتر دعا سمیٹتے ہوئے آنسو پونچھے تھے۔ جب سوید نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”لو، مجھے ہی مانگ رہی تھیں نا اللہ سے، میں آ گیا۔“

”مہربانی! مگر اٹھو یہاں سے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیوں اٹھوں؟۔۔۔۔۔ میری خالہ جانی کا گھر ہے اور محبوب

بیوی کی گود ہے۔ تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔“ عبیرہ نے بے ساختہ نگاہ چراتے ہوئے اپنے آنسو اس سے چھپانا چاہے تھے، جب وہ بولا۔

”رو کیوں رہی ہو عبیرہ؟ میں تو وہی کر رہا ہوں جو تم نے مجھ سے چاہا ہے۔ ورنہ ایک پاگل سڑکی سے شادی میں بھلا میرا کیا انٹرسٹ ہو سکتا ہے؟ خود سوچو، میرے تو سارے جذبے صرف تم سے وابستہ ہیں۔ اس لئے آج رات تقریب میں تم میرے ساتھ ساتھ رہو گی۔ سمجھیں؟“

”ہوں۔“ نم آنکھوں سے سر ہلاتے ہوئے وہ اسے بے حد پیاری لگی تھی۔

”چلو شاباش! اب یہ آنسو پونچھو۔ نہیں تو میں ہونٹوں سے چٹوں گا تو پھر تم شکایت کرو گی۔“ وہ پھر شرارت پر آمادہ تھا۔ عبیرہ نے ہلکا سا مکا بنا کر اس کے چوڑے سینے پر رسید کر دیا۔

”زیادہ رو مینس بگھارنے کی ضرورت نہیں ہے، اچھا۔“

”ضرورت ہے یار! میری ماما بہت بے تابی سے اپنی گود میں میرے بچے کھلانے کی خواہش مند ہیں۔“ وہ کب باز آنے والا تھا۔ عبیرہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”تو۔۔۔۔۔ میں نے ابھی ایسا کچھ نہیں کرنا۔“

”تو کی بچی! آرام سے رہو۔۔۔۔۔ ضروری نہیں کہ ہر بار میں تمہاری مانتا رہوں گا۔ کبھی دل کے کہے پر بھی چلنے دیا کرو اچھا۔“

”اچھا جی اچھا۔۔۔۔۔ تمہیں تو اللہ سمجھے۔“ وہ اب پزل ہو رہی تھی۔ سوید جان بوجھ کر اگلے تین چار گھنٹوں تک اسے یونہی زچ کرتا رہا۔

☆...☆...☆

دل آویز جعفری سے سوید کے نکاح کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ وہ شہر بارات کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے پھر عبیرہ کی طرف اسے اور فضیلہ بی کو لینے آیا تھا، جب اسے سادہ سے کپڑوں میں ہلکا پھلکا تیار دیکھ کر، بے خود سا اس کے قریب چلا آیا۔

”بیہ۔۔۔۔۔“ وہ جو سنگھار میز کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ اس کی پکار پر پلٹی۔

”ہوں۔“

”بیہ! میں کسی دل آویز جعفری سے شادی نہیں کر رہا۔“



”کیوں؟“ اُس کی قربت پر دھڑکتے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ مگر پھر سوید کی آنکھوں میں دیکھ کر فوراً نگاہ جھکا گئی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ اور کچھ نہیں۔“

”صحیح کہہ رہی ہو قسم سے۔ آج تو ٹھیک ٹھاک خراب ہو رہا ہے۔ اک شعر سنو۔

جس طرح میرا خواب ہے اس طرح تیرے ساتھ

اک شام گزر جائے تو اک شام بہت ہے“

اپنے گرم سانسوں سے عبیرہ کے چہرے کو چھوتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی جب وہ بولی۔

”عقل کو ہاتھ مارو سوید! وہاں سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”تو کرنے دو نایار! تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ اچھے بھلے موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیتی ہو۔ بالکل اچھی بیوی نہیں ہو تم۔“ اپنی ٹھوڑی مزے سے اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے اس نے دہائی دی تھی جب وہ مسکرا دی۔

”چلو دوسری تو اچھی مل رہی ہے نا۔ اس سے پیار کروا لینا۔“ اس نے مذاق کیا تھا مگر سوید برا مان کر تپ اٹھا۔

”شٹ اپ۔“ تپ کر کہتے ہوئے وہ فوراً کمرے سے نکل کر باہر گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ عبیرہ ہنستے ہوئے فضیلہ بی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میرج ہال میں جس وقت وہ اپنے خاندان والوں کے درمیان گھرا خود کو عقدِ ثانی کے لئے تیار کر رہا تھا، عبیرہ کی آنکھ کے آنسو اسے تڑپا گئے۔ ڈھیروں مہمانوں کے بیچ وہ اسٹیج کے قریب بیٹھی جیسے اپنا ضبط آزمانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سوید سے رہا نہ گیا تو اُٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”بیہ! تم رو رہی ہو؟“

”نہیں تو۔“

”جھوٹ مت بولو۔ دیکھو اگر تم راضی نہیں ہو تو میں ابھی۔۔۔۔۔“ وہ

مضطرب تھا۔ عبیرہ آنسو چھپاتی زبردستی مسکرا دی۔

”پاگل مت بنو۔ میں ٹھیک ہوں۔ جاؤ، سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔“ اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے اس نے بمشکل سویڈ کو پیچھے دھکیلا تھا، جس پر راحیل جعفری صاحب جو اپنے کسی دوست سے باتوں میں مگن تھے، پہلو بدل کر رہ گئے تھے۔ اندر کمرے میں دل آویز جعفری تاحال ہوش و حواس سے بے گانہ پڑی تھی اور مسز عقیل کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

”آنٹی! میرا خیال ہے، ہمیں مومی کو ابھی مزید کچھ وقت دینا چاہئے تھا۔“

”نہیں بیٹے! ڈاکٹرز کے مطابق اس کی فوری شادی بے حد ضروری ہے۔“

”مگر۔۔۔۔۔“

”اللہ سب بہتر کرے گا مریم!۔۔۔۔۔ تم کسی طرح اس کا ذہن اس طرف بناؤ پلیز!“

”ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔“

تھکن اور اُن دیکھے درد کی آمیزش نے اس کا لہجہ بھاری بنا دیا تھا۔ مسز عقیل قدرے مطمئن سی کمرے سے نکل گئیں۔ سویڈ نے اُلجھے دل و دماغ کے ساتھ نکاح نامے پر سائن کئے تھے اور پھر جبراً مسکرا کر سب سے نکاح کی مبارک

باد وصول کی تھی۔ اس دوران اس نے نہ تو دِلہن کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، نہ اس معاملے میں اس کی کوئی دلچسپی سامنے آ سکی۔ نکاح کے بعد کھانے کا دور چلا تو وہ عبیرہ کو لے کر میرج ہال سے نکل آیا چپکے سے۔

”بس اب تو خوش ہو نا عبیرہ!۔۔۔۔۔ میں نے بانٹ دیا خود کو دو حصوں میں۔“

”نہیں۔ کاغذ کے اس جبری تعلق کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ تم میرے ہو اور زندگی کی آخری سانس تک صرف میرے ہی رہو گے۔“

سویڈ کا بازو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لئے اس نے آہستہ سے اپنے ہونٹ اس کی ٹھوڑی سے چُچ کئے تھے۔ سویڈ جیسے بے جان سا گاڑی میں آ بیٹھا

”یہ یقین ہمیشہ قائم رکھنا عبیرہ! کیونکہ جس دن تمہارے اور میرے بیچ ذرا سی بھی غلط فہمی آئی اسی دن میں مر جاؤں گا۔“

”پاگل ہو گئے ہو؟“ تڑپ کر کہتے ہوئے عبیرہ نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں عبیرہ! میری سانسیں تم سے جڑی ہوں۔ تم میرے وجود، میرے سارے جذبوں کی مالک ہو۔ بہت پیار کرتا ہوں میں تم سے۔ یہ زندگی اگر خوب صورت ہے تو صرف تمہارے دم سے۔ ماما کے بعد تم دوسری عورت ہو جو مجھے اپنی جان سے بڑھ کر پیاری ہے۔“ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ عبیرہ نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”تم بھی میرا ایمان ہو سوید!۔۔۔۔۔ زندگی کی آخری سانس تک میری وفا تمہاری ہم سفر رہے گی۔“ سوید کی آنکھوں کی نمی اُسے بھی رُلا گئی تھی۔

☆...☆...☆

تکیہ بانہوں میں دبائے، بیڈ پر اڑا ترچھا لیٹا وہ گہری نیند میں غرق تھا، جب مومی دبے پاؤں اس کے کمرے میں چلی آئی۔ نیچے آسیہ بیگم اور مریم ناشتے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس نے تفصیلی نگاہوں سے آزر کا جائزہ لیا۔ وہ پہلے سے قدرے کمزور ہو گیا تھا۔

کتنے افسوس کی بات تھی کہ وہ لندن سے اس کے لئے کوئی تحفہ نہیں لایا تھا۔ وہ دکھ کی انتہا پر تھی۔ اس وقت اسے کچھ اور نہ سوجھا تو فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر پوری کی پوری اس پر انڈیل دی۔ وہ جو گہری نیند میں تھا، اس اچانک افتاد پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

”تم۔۔۔۔۔؟“ نگاہ اس کے مسکراتے چہرے پر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔

”جی جناب!۔۔۔۔۔ السلام علیکم اینڈ صبح بخیر۔“ دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اس نے اسے چڑایا تھا۔ جب وہ گہری سانس بھر کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کسی کو گہری نیند سے جگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“

”بہت زبردست طریقہ ہے۔ تمہیں کیا پتہ، پاکستان میں یہ طریقہ کتنا کامیاب ہے۔“ مزے سے کہتے ہوئے وہ اس کی اسٹڈی ٹیبل پر ٹک گئی تھی۔ آزر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”تم انتہائی بدتمیز۔۔۔۔۔ اور بے وقوف لڑکی ہو۔“

”اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ کہاں اس کے رعب میں آنے والی تھی۔ آذر بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اپنے گھر میں سکون نہیں ہے تمہیں جو ہر لمحہ ادھر دوڑی رہتی ہو؟“  
”تمہیں کیا تکلیف ہے؟ میری خالہ کا گھر ہے۔ جب دل چاہے آؤں جاؤں۔ تمہیں کیا؟“

”بہت بولنا آ گیا ہے۔ اچھی تمیز سیکھی ہے یہاں آ کر۔“

اسے برا لگا تھا۔ مومی اسے منہ چڑا کر رہ گئی۔

اگلے تین چار روز وہ عینی کے ساتھ کام میں بے حد مصروف رہا تھا۔ مومی کا بس نہ چلتا تھا کہ عینی کو شوٹ کر ڈالتی، جو لندن کے بعد پاکستان میں بھی اس کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے ساتھ گھر کے لان میں بیٹھا کسی ضروری امور پر ڈسکس کر رہا تھا، جب وہ مریم کے ساتھ اسلامک اکیڈمی سے واپسی پر اس طرف چلی آئی۔

”مریم!۔۔۔۔۔ تم مانو نہ مانو، تمہارا یہ بھائی ضرور اسی عینی چڑیل سے شادی کرے گا۔“ وہ جلی تھی۔ مریم مسکرا دی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے یار! وہ صرف بھائی کی اچھی دوست ہے اور بس۔“  
”ہاں، تم تو یہی کہو گی۔ آخر ہو نا بھائی کی چچی۔“

”ہا، ہا، ہا۔۔۔۔۔ پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔“ مریم ہنسی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی لان کر اس کر گئی۔ آذر کی پُرشوق نگاہوں نے دُور تک اس کا پیچھا کیا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ لان سے اٹھ کر اندر آیا تو وہ آسیہ بیگم کے پاس بیٹھی مزے سے نوڈلز کھا رہی تھی۔ وہ پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھتا وہیں بیٹھ گیا۔

”تم پھر آ گئیں۔ آخر نہیں ہے نا سکون اپنے گھر میں۔“ وہ اسے تنگ کرنے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ مومی کلس کر رہ گئی۔

”اپنے شوق سے نہیں آئی۔ تمہاری بہن زبردستی کھینچ کر لائی ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ یقیناً سارے گھر کی صفائی کرنی ہو گی یا پھر کپڑے دھونے ہوں گے۔ کل سے کام والی بھی تو نہیں آ رہی نا۔ چلو پہلے میرا کمرہ صاف کر دینا۔ بہت خراب ہو رہا ہے۔“



”منہ دھو رکھو۔۔۔۔۔ اور خود کرو یہ سارے کام۔ فضول لوگوں سے گپ شپ میں جو قیمتی وقت برباد کرتے ہو، اسے کبھی مفید بھی بنا لیا کرو۔“ غصے میں ناک چڑھا کر بولتی وہ اسے بے حد اچھی لگی تھی۔ آسیہ بیگم مسکرا کر اٹھتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

”مریم! میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں عینی کے ساتھ۔۔۔۔۔ واپسی پر املی کا شربت بنا کر رکھنا۔“ فوراً سنجیدہ ہو کر وہ مریم سے مخاطب ہوا تھا۔ مومی کی جلن مزید بڑھ گئی۔

”اللہ کرے تم اسے چھوڑنے جاؤ اور تمہارا ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ جس میں وہ اسٹوپڈ لڑکی مر جائے۔“

”مومی!۔۔۔۔۔ پاگل ہو گئی ہو؟“

اس کے دبے دبے لہجے کی بد دعا پر مریم نے دہل کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جب وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”ابھی تو نہیں ہوئی، مگر تم دیکھ لینا، تمہارا یہ بھائی ایک دن ضرور مجھے پاگل کر کے چھوڑے گا۔“ آزر کمرے سے نکل چکا تھا۔ مریم محض افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆...☆...☆

”مریم!۔۔۔۔۔ کیا آزر واقعی عینی سے محبت کرتا ہے؟“ اس روز اکیڈمی جاتے ہوئے مومی نے مریم سے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

”نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ایسا کچھ ہے۔“

”کیوں؟۔۔۔۔۔ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ وہ بے چین تھی۔ مریم اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”عینی، بھائی سے بات کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ آزر! خیال کیا کرو اس کا۔۔۔۔۔ اس سے مجھے پتہ لگا کہ بھائی کی زندگی میں وہ نہیں ہے۔“

”گڈ۔۔۔۔۔ میں ایویس خار کھاتی ہوں بے چاری سے۔ ویسے پھر وہ کون ہے جس کی وہ سفارش کر رہی تھی؟ یہ تو مجھے پتہ ہے کہ وہ میری سفارش کسی صورت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میرا اس سے اب تک بہت غلط بیہو رہا ہے۔“

”یہ تو اب وہی جانے۔ مگر یہ ہے کہ بھائی کسی نہ کسی سے محبت کرتے ضرور ہیں۔“

”کیسے؟۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہیں کیسے پتہ؟“

”ابھی پرسوں پتہ چلا ہے، جب میں انہیں شام کے بعد چائے دینے گئی۔ بھائی کے ہاتھ میں کسی لڑکی کی تصویر تھی اور وہ اکیلے میں اس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں گئی تو جلدی سے تصویر ڈائری میں چھپا کر رکھ دی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ کوئی لندن کی لڑکی کی ہے۔ کیونکہ بھائی کے سیل پر آنے والی زیادہ تر کالز لندن کی ہی ہوتی ہیں۔“

”ہائے، نہیں مریم! میرے ہوتے اگر کسی نے میرے حق پر ڈاکہ ڈالا تو میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گی۔“ وہ جذباتی ہوئی تھی۔ مریم نے نظر پھیر لی۔

”بس رہنے دو۔ دلوں کی سلطنت غنڈہ گردی سے نہیں جیتی جاتی۔ اس معاملے میں صرف عاجزی چلتی ہے۔“

”تمہارے بھائی کا دل عاجزی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے، اچھا۔“ وہ چڑی تھی۔ مریم خفا ہو گئی۔

”ایک تو تم فتوے بڑی جلدی جاری کر دیتی ہو۔ ذرا جو کسی کی بات سمجھ میں آ جائے تمہارے۔“

”مجھے نہیں سمجھنی ایسی کوئی بات، جس سے اسے مزید اکڑنے کا موقع ملے۔ ایک تو پہلے ہی اس کی گردن میں خم نہیں ہے، اوپر سے تم مجھ سے منتیں کروا رہی ہو۔ نہ بابا! مجھے تمہاری یہ نادر رائے منظور نہیں۔“ وہ ہٹلر سوچ کی مالک تھی۔ مریم منہ پھیر کر اپنی جماعت کی طرف بڑھ گئی۔

☆...☆...☆

آذر کا آئی ڈی کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈ اکٹھے گم ہو گیا تھا، سارا کمرہ چھان مارا مگر کہیں سے وصول یابی نہ ہو سکی۔ تبھی اس نے مریم سے پوچھ تاچھ کی تھی، مگر وہ صاف مُکر گئی یہ

کہہ کر کہ بھائی! میں تو آپ کے کمرے میں جاتی ہی نہیں ہوں۔

”پھر۔۔۔۔۔ جن اٹھا کر لے گئے یا انہیں پاؤں لگ گئے؟“

اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ مریم کو یاد آ گیا کہ صبح اس کے آفس جانے کے بعد مومی وہاں آئی تھی۔ تبھی وہ بول اٹھی تھی۔

”بھائی!۔۔۔۔۔ صبح مومی یہاں آئی تھی۔ شاید اُس نے ادھر ادھر رکھ دیئے ہوں۔“ مومی کی شرارتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ آزر آج اسے رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”اوکے۔۔۔۔۔ فوری بلا کر لاؤ اسے۔“ مومی بلیک میکیسی میں نک سک سی تیار کہیں جانے کو پَر تول رہی تھی، جب آزر کے بلاوے پر بنا کسی ہچکچاہٹ کے اس کے حضور پیش ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اسے بنے سنورے دیکھ کر وہ اپنا مسئلہ فوری بھول ہی گیا۔ مریم کا دل بے تحاشا ہنسنے کو چاہ رہا تھا مگر وہ ضبط کئے رہی۔

”ایک فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی ہے، وہیں جا رہی ہوں۔ کیا یہی پوچھنے کے لئے بلایا ہے؟“

”جی نہیں۔ میرا آئی ڈی کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈ کہاں ہے؟“

”مجھے کیا پتہ؟ مجھے تو نہیں پکڑائے تھے۔“

”مومی! میں اس وقت ٹینشن میں ہوں، مجھے تنگ مت کرو۔“ وہ شدید غصے میں تھا۔ مومی ٹھٹک کر رہ گئی۔

”جو سچ ہے، میں وہی کہہ رہی ہوں۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ پھر آؤ میرے ساتھ۔“ لپک کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے مومی کا بازو تھاما اور اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹتا اوپر کی بالائی منزل پر لے آیا۔ مومی اس وقت اس کا موڈ سمجھنے سے قطعی قاصر تھی۔ وہ ٹیرس کے قریب آیا اور اس سے پہلے کہ مومی اس کا ارادہ جانتی، اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ٹیرس سے نیچے لٹکا دیا۔ وہ چیخی تھی اور اس کا دل لمحے میں خشک پتے کی مانند کانپ کر رہ گیا تھا۔

”اب بولو! مجھے تنگ کرنے سے باز آؤ گی یا نہیں؟“

”آزر۔۔۔۔۔“ وہ خوف سے چیخ رہی تھی، مگر وہ بے نیاز تھا۔

”میرے کارڈ واپس کرتی ہو یا پھینک دوں نیچے؟“

”آزر۔۔۔۔۔“ مومی کا لہجہ خوف اور دکھ سے پھٹ رہا تھا۔ وہ جیسے آزر کی کوئی بات نہیں سن پا رہی تھی۔ مریم بھاگتے ہوئے اوپر آئی تھی اور پھر سامنے کا منظر دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی۔ موم کے سانچے میں ڈھلی اس کی وہ پیاری سی کزن، آزر عباس کے دو مضبوط بازوؤں کے سہارے فضا میں لٹکی ہوئی تھی۔

”بھائی! یہ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ پریشان سی اس کے قریب آئی تھی جب وہ بولا۔

”تم چپ رہو مریم! اسے اس کی شیطانیوں کی سزا ملنی چاہئے۔“ مومی کا رنگ اب سفید پڑ رہا تھا۔ آزر کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے واپس کھینچنا پڑا۔

”بولو۔۔۔۔۔ باز آؤ گی اپنی حرکتوں سے کہ نہیں؟“ وہ ذرا سا نرم پڑا تھا۔ مومی سے اپنی سانسیں درست کرنا دشوار ہو گیا۔

”مومی! تم ٹھیک ہو؟“ مریم پریشانی سے آگے بڑھی تھی مگر مومی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اب رو رہی تھی۔ آزر عباس کی ٹینشن مزید بڑھ گئی۔

”تو تم اپنی فضول حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی؟“

”شٹ اپ۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں تمہارے لئے اتنی سستی ہوں۔ خردار جو کبھی دوبارہ مجھے چھونے کی کوشش کی۔“ اس کی بھیگی آنکھوں میں جیسے آگ دہک رہی تھی۔ آزر کچھ دیر اسے سنجیدگی سے دیکھتا واپس پلٹ گیا تھا۔ جبکہ مریم اب اس کی دہکی ہوئی آگ کو سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆...☆...☆

ٹی وی لاؤنج میں ٹیلی ویژن فل آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کے سامنے بیٹھی جیسے وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

وہ چھوٹی سی تھی جب اس کی ماں زبردستی اس کے پاپا سے ڈائیورس لے کر علیحدہ ہو گئی۔ قرۃ العین کے لئے وہ وقت زندگی کا سب سے کٹھن وقت تھا۔

مگر پھر اس سے بھی برا وقت تب آیا جب اس کے پاپا نے بھی دوسری شادی کر لی۔ وہ جیسے اپنے ہی گھر میں ایک فالتوشے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ایسے میں آزر کی فیملی اور دوستی نے اسے بہت سہارا دیا تھا۔ وہ جو



مایوسیوں اور غموں کے حصار میں قید ہو چلی تھی، آزر کے ساتھ نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف واپس کھینچ لیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ جیسے اس کی فیملی کا حصہ بنتی چلی گئی تھی۔ اسے اس تنہائی اور وحشت کا احساس ہی نہ رہا، جو کچھ روز پہلے اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ پھر سے جینے لگی تھی۔

اس روز بھی آزر اپنے سارے کام التوا میں ڈال کر اس کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کے لئے گھر کا کونا کونا سجا رہا تھا۔ مومی ہر بات سے بے خبر اس روز اکیلی ہی اکیڈمی گئی تھی۔ جبکہ مریم نے گھر میں کام کا بہانہ بنا کر چھٹی کر لی۔ وہ اکیڈمی سے واپس آئی تو آزر، مریم کے ساتھ مل کر ہال کمرے کی سجاوٹ کر رہا تھا۔ وہ ذرا سی حیران ہوئی تھی۔ کہاں تو اس کی اتنی مصروفیت کہ سر کھجانے کو ٹائم نہیں۔ اور کہاں اب مکمل فرصت سے بچوں کی طرح دیواروں پر رنگا رنگ ربن لگا کر وہاں غبارے باندھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا، وہ لندن میں صرف اُس کی سالگرہ کے روز ایسا اہتمام کیا کرتا تھا۔ مہمانوں کو مدعو کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کو سجانا اور سنوارنے سے لے کر، مزے

مزے کے پکوان تیار کرنے میں بھی وہ ہمیشہ سب سے آگے رہا کرتا تھا۔ مومی چاہ کر بھی ان دونوں کو بھلا نہیں پا رہی تھی جب وہ صرف اور صرف اس کا تھا۔ وہ آگے بڑھی تھی اور مریم کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔ کوئی آ رہا ہے کیا؟“

”ارے نہیں یار!۔۔۔۔۔ آنا کس نے ہے؟ عینی کی سالگرہ ہے اور آزر بھی اُسے سرپرائر دینا چاہ رہے ہیں۔“

مریم کیمک سجانے میں مصروف تھی۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکی کہ اس کے الفاظ نے مومی کے چہرے پر کیا اثر ڈالا ہے۔ آذر اب میز سے کود کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

”تم نے عینی کے لئے کوئی گفٹ وغیرہ خریدا ہے کہ نہیں؟“

کتنی فکر تھی اسے عینی کی خوشی اور پذیرائی کی۔ مومی کے اندر جیسے دھواں سا بھر گیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟۔۔۔۔۔اپنے لئے تو بڑی کاشش رہتی ہو۔ کبھی دوسروں کی خوشی کا خیال بھی کر لیا کرو۔“

”دوسروں کی خوشی کا خیال رکھنے کے لئے تم کافی ہو آزر عباس!“ اسی کے انداز میں تپ کر جواب دیتے ہوئے وہ پھر وہاں ٹھہری نہیں تھی۔ جبکہ آزر عباس اس کی بھیگی پلکوں کا تصور کر کے مسکرا دیا تھا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے بھائی! آپ کو پتہ بھی ہے کہ وہ آپ سے کتنا پیار کرتی ہے، پھر بھی آپ اُسے دُکھ دینے سے باز نہیں آتے۔ کیوں؟“

”مزا آتا ہے ڈیر سسٹر!۔۔۔۔۔تمہیں کیا پتہ وہ سسٹر کرتی کتنی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مریم اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”مومی صحیح کہتی ہے۔ آپ واقعی بہت بے حس ہیں۔“

کبیک کی سجاوٹ کا کام ادھورا چھوڑ کر وہ بھی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔ تاہم آزر، مومی کی متوقع ناراضی کا سوچتے ہوئے دیر تک لطف اٹھاتا رہا۔

☆...☆...☆

اس روز بہت بارش ہوئی تھی۔

رات بھر وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ دل آویز، ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہو چکی تھی۔ لہذا عقیل جعفری اب اس کی رخصتی کا سوچ رہے تھے۔ اسی مقصد کے لئے راحیل جعفری کی شہر آمد پر ایک عرصے کے بعد وہ ان کے گھر فضیلہ بی کے مقابل آئے تھے۔

برستی بارش میں بھیگے در و دیوار، حسرت سے تکتی ان کی آنکھوں میں عجیب سی خاموشی تھی۔

جوانی میں وہ عورت کیا تھی اور اب۔۔۔۔۔وقت سے پہلے بڑھاپے نے اس خوب صورت سراپے والی عورت کا کیا حشر کر دیا تھا کہ سناٹوں کی چیخیں ان کی آنکھوں سے باہر آتی تھیں۔ وہ ہال کمرے میں لیٹی بارش کو دیکھ رہی تھی، جب ان کے قدم اس کمرے کی دہلیز پر پڑے تھے اور پھر۔۔۔۔۔جیسے وجود پتھر کا ہو گیا تھا۔

بارشوں کے موسم میں

تم کو یاد کرنے کی عادتیں پرانی ہیں

اب کی بار سوچا ہے

عادتیں بدل ڈالیں

پھر خیال آیا کہ

عادتیں بدلنے سے بارشیں نہیں رکتیں!

”عقیل۔۔۔!“ فضیلہ بی کی نگاہ اُن پر پڑی تھی اور لب جیسے پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا

مدتوں بعد میری آنکھ میں آنسو آئے

وہ سست روی سے قدم اٹھاتے ان کی طرف آئے تھے۔

”کیسی ہو فضیلہ؟“

”پتہ نہیں۔ بس ایک بے نام اُداسی سی ہے جو کسی لمحہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ایک

خلش ہے عقیل! جو کسی پل سکون سے جینی نہیں دیتی۔ تم۔۔۔۔۔ تم اعلیٰ طرف

ہو، معاف کر دو مجھے پلیز۔“ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ عقیل

جعفری نے بے ساختہ رُخ پھیر لیا۔

”کس بات کی معافی پگی!۔۔۔۔۔ اپنے قانون ہوتے ہیں محبت کے اور سزائیں بھی۔ میں تو اب وہ سزا پوری بھی کر چکا۔“ ان کی آواز بھاری ہوئی تھی۔ فضیلہ بی کی آنکھوں سے کئی قطرے ایک ساتھ پھسل کر چہرے کو بھگو گئے۔

”گھر والے کہاں ہیں؟“ فوراً سے پیشتر سنبھالا تھا انہوں نے خود کو جب وہ بولیں۔

”کہیں باہر گئے ہیں۔ سوید اور عبیرہ بیٹی اوپر ہیں۔“

”ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔ راحیل بھائی آئیں تو میرا بتا دینا اور کہنا کہ سوید اور دل آویز کی باقاعدہ شادی کی تیاری کر لے۔“

”عقیل۔۔۔۔۔“

”ہوں۔“ فضیلہ بی کے پکارنے پر وہ جیسے چونکتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”عقیل!۔۔۔۔۔ سوید میری بیٹی کی محبت ہے۔ میری عبیرہ بہت چاہتی ہے اسے۔“ وہ بے قراری سے بولی تھیں اور عقیل جعفری جیسے پھر سے شاکد رہ گئے تھے۔

”کیا کہہ رہی ہو فضیلہ؟“

”وہی جو سچ ہے۔“ انہیں جیسے بہت جلدی تھی۔ عقیل جعفری کتنی ہی دیر تک حیران حیران سی پشیمان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔ باہر بارش پھر زور پکڑ گئی تھی۔

اگلی صبح عبیرہ اپنی ماں کو ”صبح بخیر“ کہنے کے لئے ان کے کمرے میں آئی تو گرم بستر میں فضیلہ بی کا صرف جسم پڑا تھا، روح نہیں تھی۔

وہ روئی تھی۔ بلک بلک کر روئی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔ اس کے آنسو بھلا اس کی مامتا کو کہاں واپس لا سکتے تھے؟ رات کے کسی پہر فالج کے دوسرے شدید اٹیک نے ان کے جسم کے بائیں طرف والے حصے کو مفلوج کر دیا تھا۔ راحیلہ یوں سُن ہو کر رہ گئی تھیں جیسے ان کا دنیا میں کچھ باقی بچا ہی نہ ہو۔ جبکہ

سوید۔۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی ان دو عزیز ہستیوں کا غم کیسے بانٹے۔

چار ماہ اسی غم نے چاٹ لئے۔ سوید کے ساتھ دل آویز کی رخصتی پھر التوا میں پڑ گئی۔ وہ قطعی کسی نئی ذمہ داری کو قبول کر نیکی پوزیشن میں نہیں تھا۔ جبکہ عبیرہ سے اس کا تعلق بھی، عبیرہ کی پریگننسی کے باعث منظر عام پر آ چکا تھا۔ حالات مختلف ہوتے تو شاید راحیل جعفری صاحب شور مچاتے، مگر۔۔۔۔۔ عجیب سی سوگواری کے اس ماحول میں عبیرہ پر اُنکی اُٹھنے سے قبل ہی اس نے انہیں سب کچھ صاف صاف بتا کر، کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

ادھر عقیل جعفری نے فضیلہ بی کی موت کی خبر بڑے حوصلے سے سنی تھی۔ مگر یہ حوصلہ اندر ہی اندر اُنہیں کھانے لگا تھا۔ اسی لئے فضیلہ بی کی وفات کے ٹھیک چار ماہ بعد۔۔۔۔۔ سوید کے لاکھ پاؤں پٹخنے کے باوجود دل آویز کی رخصتی طے کر دی گئی۔

رات بھر جاگنے اور ٹینشن کا شکار رہنے کے سبب اس کے سر میں شدید درد تھا اور پورا جسم جیسے ہلکے ہلکے بخار کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ پورا دن عبیرہ کے ناز



اُٹھانے کے بعد شام ڈھلے وہ ضد کر کے بے حد سادگی کے ساتھ راحیل جعفری کی ہمراہی میں عقیل منزل کی طرف آیا تھا، جس کے شان دار در و دیوار سے چھلکتی عجیب سی وحشت نے اس کا بڑا پرتپاک استقبال کیا تھا۔

☆...☆...☆

قرۃ العین عرف عینی کی سالگرہ اس کی شرکت کے بغیر بھی بہت شاندار رہی تھی۔

تقریب ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ مریم اسے شرکت کے لئے بلانے چلی آئی۔ مگر وہ جو اندر سے لہو لہان ہو رہی تھی، اسے مریم کا یہ بلاوا جلتی پر تیل کا کام لگا۔ تبھی اسے بے رخی سے انکار کر کے کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ جانے کیوں اس وقت اس کا دل شدت سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ اگر عینی وہ لڑکی نہیں تھی جیسے آزر چاہتا تھا تو پھر وہ اس پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟ کیوں اتنی اہمیت دے رہا تھا اُسے؟۔۔۔۔۔ سوچ سوچ کر اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔

اسے ہر لمحہ انتظار رہا کہ وہ اسے بلانے آئے گا مگر اُس کا انتظار انتظار ہی رہا اور تقریب ختم بھی ہو گئی۔ اسے پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ کتنی دیر سر گھٹنوں میں دیئے روتی رہی تھی۔ مسز عقیل تقریب کے اختتام کے بعد اُٹھ کر آنے لگیں تو آزر بھی ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔

”آئی!۔۔۔۔۔ مومی نے کھانا نہیں کھایا۔ پلیز اسے کھانا کھلا دیجئے گا۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ وہ تو اب تک سو چکی ہو گی۔“

”آج وہ اتنی جلدی نہیں سو سکتی۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔“

کچھ سوچ کر کہتے ہوئے وہ سرعت سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مومی کا کمرہ اُس کی توقع کے برخلاف لاکڈ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے مومی کو کیسے کھانا کھلانا ہے۔ مگر۔۔۔۔۔ اس وقت اس کی جان پر بن گئی، جب اس نے کمرے کے وسط میں مومی کو اپنا پیٹ پکڑے درد سے تڑپتے ہوئے دیکھا۔ بجلی کی سرعت سے وہ اس کی طرف لپکا تھا۔

”مومی۔۔۔۔۔!“

”آزر!۔۔۔۔۔ آزر! مجھے بچا لو۔۔۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔“ اس کا چہرہ اس وقت عجیب ہو رہا تھا۔ آزر کو لگا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔

”او مائی گاڈ۔۔۔۔۔ کیا کیا ہے تم نے اپنے ساتھ؟۔۔۔ کیا کھایا ہے؟“ موقع کی نزاکت کا احساس کئے بغیر وہ دھاڑا تھا۔ مگر مومی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اسے کوئی جواب نہ دے سکی۔ تب وہ اسے اپنے مضبوط پاؤں میں اٹھا کر نیچے کی طرف بھاگا تھا۔ مسز عقیل ابھی کچن میں مومی کے لئے کھانا نکال رہی تھیں۔ ان کی نظر آزر پر پڑی تو ہاتھ سے کھانے کی ٹرے چھوٹ کر گر پڑی۔

”آزر!۔۔۔۔۔ کیا ہوا میری بچی کو؟“

”پتہ نہیں آئی! شاید اس نے کچھ کھا لیا ہے۔ پلیر جلدی میرے ساتھ آئیں۔“

گاڑی باہر کھڑی تھی۔ وہ سرعت سے مومی کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر سینے میں اودھم مچاتے دل کے ساتھ مسز عقیل کے گاڑی میں بیٹھتے ہی بنا کسی کو اطلاع دیئے گاڑی بھگالے گیا۔ مسز عقیل کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بار بار مومی کا منہ چومتے ہوئے وہ رو رہی تھیں۔ جبکہ آزر کا دل اسے کچھ

ہو جانے کے تصور سے ہی پھٹ رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ گاڑی کسی درخت سے ٹکرا کر اپنا وجود ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔

زندگی میں پہلی بار اس نے ٹریفک سگنل کے قوانین کو توڑا تھا۔ گاڑی کو سڑک پر دوڑانے کے بجائے ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ ہاسپٹل پہنچا تھا اور وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز کو غیر حاضر پا کر دیگر عملے پر برس پڑا تھا۔ اُس کا بس نہ چلتا تھا کہ سب کو گریبان سے پکڑ کر زبردستی ایمر جنسی روم میں دھکیل دیتا۔ یہ کیسا امتحان تھا محبت کا کہ جسے جلا کر، ستا کر وہ لطف سمیٹتا تھا، اب وہی زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی تو جیسے وہ دیوانہ ہو کر رہ گیا تھا۔ صحیح معنوں میں اسے ابھی احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے لئے کتنی قیمتی تھی۔

جانے یہ ایک ماں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ محبوب کی بروقت کوششوں کا جو وہ موت کو شکست دے کر زندگی کی طرف واپس پلٹ آئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس نے چوہے مار ادویات پھانکی تھیں جس سے اس کا معدہ چھلنی ہونے کا خدشہ تھا۔ اس کا زندہ بچ جانا ایک طرح سے معجزہ ہی خیال کیا جا رہا تھا۔ جب تک وہ ایمر جنسی وارڈ میں رہی، آزر کو اپنی جان سولی پر لٹکی محسوس

ہوتی رہی۔ اس دوران اس نے نہ تو کسی کا فون سنا، نہ ایک پل کے لئے بھی ہاسپٹل سے باہر گیا۔ جس وقت ڈاکٹرز نے اسے مومی کی زندگی خطرے سے باہر ہونے کی نوید سنائی، وہ پلکیں موندے، سر دیوار سے لگائے سُن بیٹھا تھا۔ اس کی زندگی کی نوید سننے کے بعد اسے زندگی اپنے اندر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔

ڈاکٹرز کے مطابق مومی بے ہوشی میں مسلسل اپنی ماں اور باپ کے ساتھ آزر کو پکارتی رہی تھی۔ اس کے کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد آزر نے گھر فون کر کے اپنی ماما اور دیگر افراد کو اطلاع دی تھی۔ آسیہ بیگم کے ساتھ جس وقت مریم اور عینی نے کمرے میں قدم رکھا، وہ بے ہوش پڑی مومی کا ہاتھ تھامے، بیڈ پر اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ عینی کے اندر بے چینی سی پھیل گئی۔

مریم اور آسیہ بیگم، مومی کو چومتے ہوئے رو رہی تھیں۔ جبکہ اس نے آزر کے قریب جا کر اپنا ہاتھ اس کے مضبوط کندھے پر رکھا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے مومی کی؟“

”خطرے سے باہر ہے۔“ آزر کے لہجے سے لگ رہا تھا، جیسے اسے بولنا دشوار لگ رہا ہو۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔

”ٹینشن مت لو آزر! اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انکل کو فون کیا ہے؟“

”نہیں۔ اس وقت انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں۔“ عقیل صاحب ملک سے باہر تھے، اس لئے آزر نے انہیں اطلاع نہیں دی۔ ویسے بھی مومی اب ہوش میں آرہی تھی۔ آزر خاموشی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ عینی بھی اس کے پیچھے ہی باہر آئی تھی۔

”کچھ پتہ چلا کہ مومی نے ایسا کیوں کیا؟“

”پتہ کس سے چلنا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔“ آزر کی آنکھیں اس لمحے جیسے جل رہی تھیں۔ عینی اس کے پہلو میں ٹک گئی۔

”میں کئی دنوں سے یہ بات محسوس کر رہی تھی آزر! کہ وہ ٹینس ہے۔ شاید وہ

تم سے بہت جنوں خیز قسم کی محبت کرتی ہے۔“

”وہ بہت پاگل ہے عینی! میں بچپن سے جانتا ہوں اسے۔ مگر پاگل پن میں وہ کوئی ایسا احمقانہ قدم بھی اٹھا سکتی ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ وہ پریشان تھا۔

عینی دیر تک اس کے پہلو میں بیٹھی اسے تسلیاں دیتی رہی تھی!

☆...☆...☆

”سوید بھائی!“ ہلکی پھلکی کڑھائی کے سادہ سے پنک سوٹ میں تیار، بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی دل آویز جعفری رخصتی کے لئے تیار تھی جب وہ کسی کی پکار پر ٹھٹک کر رُک گیا۔

”جی۔۔۔۔۔“ فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اُس کی نگاہ بہت دل کش چہرے والی ایک خوب صورت سی لڑکی سے ٹکرائی تھی۔

”مم۔۔۔۔۔“ میرا نام مریم ہے۔ مریم عباس۔ دل آویز کی بہن اور بہت اچھی دوست ہوں۔ آپ سے کچھ کہنا تھا۔“

”جی فرمائیے۔“ بے گانگی لئے اس کے لہجے میں عجیب سا رُوکھا پن تھا۔ مریم عباس سے اپنا مدعا بیان کرنا مشکل ہو گیا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ میں آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ۔۔۔۔۔ دل آویز پاگل نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ صرف ایک صدمے کے حصار میں ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ماحول کا بدلاؤ اور ڈھیر ساری محبتیں اُسے اس صدمے کے حصار سے نکال سکتی ہیں۔“

”تو۔۔۔۔۔“ سوید کو ذرا برابر اس قصے سے دلچسپی نہیں تھی۔

”تو۔۔۔۔۔“ تو آپ اس کا بہت خیال رکھتے گا۔ اسے بہت سارا پیار دیجئے گا۔ انکل نے اگر اس کے لئے آپ کا انتخاب کیا ہے تو یقیناً بہت سوچ سمجھ کر کیا ہو گا۔ وہ گوہر نایاب ہے، صدف ہے۔ اسے کبھی دُکھ مت دیجئے گا پلیز۔“ سامنے کھڑی خوب صورت لڑکی کی بھیگی پلکیں دیکھ کر وہ کہتے کہتے رہ گیا تھا۔

”ایسا ہی گوہر تھا تو گھر میں رکھتے۔ میری زندگی کیوں عذاب کر رہے ہو؟“ مگر کہہ نہ سکا۔

”ٹھیک ہے۔ اور کچھ؟“



”نہیں۔“ آنسو پینے کی ناکام کوشش کرتی وہ لڑکی نفی میں سر ہلا کر فوراً واپس پلٹی تھی اور تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کسی کمرے میں گم ہو گئی تھی۔ سوید سر جھٹک کر، بنا کسی سے ملے کمرے سے نکل آیا۔

تھکن سے بے حال جس وقت وہ گھر واپس لوٹا، عبیرہ اس کے انتظار میں جلے پیر کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ دل آویز کو گاڑی سے راحیل جعفری صاحب باہر نکال کر گھر کے اندر لاتے تھے۔ وہ یوں سرد اور گم سم تھی، جیسے برف سے نکال کر لائی گئی ہو۔

راحیل بی ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کمرے میں قید ہو گئی تھیں۔ ایسے میں راحیل جعفری صاحب کو مجبوراً سوید کو آواز دینی پڑی، جو اندر کمرے میں عبیرہ کے پاس بیٹھا، اسے ڈھیروں وعدے اور تسلیاں تھما رہا تھا۔

”جی بابا!“ راحیل جعفری کی کڑک پکار پر وہ فوراً نیچے آیا تھا۔

”بیٹی کو کمرے تک تو لے جاؤ۔ یا یہ فرض بھی مجھے سر انجام دینا پڑے گا؟“

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ جواب میں کچھ کہتا مگر اس وقت تھکن سے بے حال وہ کچھ بھی کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لہذا خاموشی سے دل آویز کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر اس کے لئے مخصوص کتے گئے کمرے میں لے آیا۔

”بیٹھ جاؤ آرام سے۔ اگر بھوک لگے تو بتا دینا، کھانا لا دوں گا۔“ اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ پلٹ رہا تھا، جب دل آویز جعفری سکڑ کر خود کو سمیٹتی، دونوں پاؤں بیڈ کے اوپر رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ یوں خوف زدہ تھی، جیسے جنگل سے پکڑ کر شہر کے چوراہے پر لا کر کھڑی کر دی گئی ہو۔ سوید سر جھٹک کر بنا اُس کا دیدار کتے کمرے سے نکل آیا تھا۔

☆...☆...☆

رات عبیرہ کے اطمینان سے سو جانے کے بعد وہ بے دلی سے اٹھ کر دل آویز جعفری کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ دروازہ آہستہ سے دھکیل کر جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوا، ٹھٹک کر رک گیا۔ دل آویز جعفری، کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی عجیب دلچسپی سے آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ خوب صورت نگاہوں میں عجیب سا خالی پن تھا، کسی بھی قسم کے داغ سے پاک، موم



کے منہ پر جم کر اس کی آواز کا گلا گھونٹ چکا تھا۔ وہ اس کی مضبوط گرفت میں مچھلی کی طرح پھسل، تڑپ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں تم پاگل ہو۔ مگر میں تم سے بڑا پاگل ہوں۔ دماغ گھوم گیا تو سارا ماضی بھلا دوں گا، سمجھیں تم؟“ مریم عباس کی آخری لمحوں میں کی گئی درخواست وہ قطعی بھلا چکا تھا۔

دل آویز جعفری کی حالت اس لمحے غیر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس کا جسم اب سرد پڑ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مڑنے لگے تھے۔ سوید کے ہاتھوں میں ہی اس کا خوشبوؤں سے مہکتا وجود ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

سوید اس نئی افتاد کے لئے قطعی تیار نہیں تھا، تبھی اسے بیڈ پر سلا کر نیچے آیا اور پھر راحیلہ بی کی منت کر کے انہیں اوپر دل آویز کے پاس لے آیا۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ عبیرہ کے پہلو میں لیٹا سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

دل آویز کو محفوظ ہاتھوں میں سوہنے کے بعد عقیل جعفری اپنی بیگم کے ساتھ دوبارہ بیرون ملک واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ فضیلہ بی کی رحلت کے بعد انہیں اس ماحول میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ انہی کی خواہش پر راحیل جعفری صاحب نے دل آویز کو ان سے ملوانے کے لئے سوید کے ساتھ ”عقیل منزل“ بھیجا تھا۔

عبیرہ کا حال دیکھنے والا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر سوید نے منع کر دیا۔ کیونکہ وہ اس کے معاملے میں ذرا سی لاپرواہی کا متحمل ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تھا جب راحیل جعفری صاحب، دائیں بازو کے حلقے میں دل آویز کو لئے گاڑی کے قریب چلے آئے۔ پھر خود اپنے ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے سوید کے برابر فرنٹ سیٹ پر بٹھایا تھا اور یہ سب اوپر سوید کے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی عبیرہ بخوبی دیکھ رہی تھی۔

دل آویز کے ہوش رُبا حُسن کے باوجود سوید آزر کی اس لا تعلقی نے اسے قدرے اطمینان بخشا تھا۔ راحیل جعفری، سوید کو دل آویز کا خاص خیال رکھنے کی

تلقین کرتے واپس پلٹے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر میں انہیں بھی گاؤں کے لئے روانہ ہونا تھا۔

سویڈ، دل آویز کی ہمراہی میں ابھی چند فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ وہ جو پتھر کی مورت بنی، گم سم سی کھڑکی کے اس پار باہر کے نظاروں میں کھوئی تھی، اچانک بول اُٹھی۔

”رُکو۔۔۔۔۔رُک جاؤ پلیز۔۔۔۔۔رُک جاؤ۔“

سویڈ کا پاؤں اس کی صدا پر فوراً سے پیشتر بریک پر جا پڑا تھا۔ گاڑی رکتے ہی اس نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور سرپٹ سرک پر بھاگ کھڑی ہوئی۔

”آزر!۔۔۔۔۔آزر رک جاؤ۔ میری بات سنو آزر! پلیز۔“ بھاگنے کے ساتھ ساتھ وہ اب چلا بھی رہی تھی۔ سویڈ ہکا بکا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ سرک پر لوگ اب رُک کر اُس کی عزت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ لپک کر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے قابو کرتا، وہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دیوانہ وار کسی گاڑی کے پیچھے بھاگتے ہوئے ایک موٹر سائیکل کی زد میں آ گئی۔

حادثہ اس قدر اچانک تھا کہ سویڈ کو کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ تو موٹر سائیکل والے کی سپیڈ آہستہ تھی، جس کی وجہ سے بچت ہو گئی ورنہ پتنگے کی طرح جس طرح سے وہ ٹکرائی تھی، اسے خاصی شدید قسم کی چوٹیں بھی لگ سکتی تھیں، جو جان لیوا ثابت ہوتیں۔

سویڈ فوراً سے پیشتر گاڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھا تھا، جو سرک پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ یقیناً اس کے چہرے اور پیشانی پر زخم آئے تھے۔ وہ سرسری اس کا جائزہ لینے کے بعد اس کا نازک سا وجود بانہوں میں سمیٹ کر اسے سسرال لے جانے کے بجائے سیدھا ہاسپٹل لے آیا تھا۔ تھوڑی دیر میں عقیل جعفری اور ان کی مسز کے ساتھ مریم عباس بھی اس کی اطلاع پر وہاں موجود تھی۔

ڈاکٹرز کے اچھی طرح اطمینان دلانے کے بعد مسٹر اور مسز عقیل کو دل آویز کے پاس چھوڑ کر وہ مریم عباس کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر آیا تھا۔

”مس مریم! اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ سے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“



”کیا جاننا چاہتے ہیں؟“ اس کے چہرے پر اب بھی یاسیت پھیلی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے رک گیا۔

”آزر! کون ہے؟“ مریم اس سے جس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی، وہی پوچھ لیا تھا اس نے۔ وہ چپ چاپ سی چند لمحوں تک خود سے اُبجھتی رہی، پھر بولی۔

”بھائی تھا میرا کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں ڈیٹھ ہو گئی ان کی۔“  
 ”او۔۔۔۔۔ ویری سیڈ۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ دل آویز کا اس سے کیا رشتہ تھا؟“

”بچپن کا دوست تھا اس کا اور فیانسی بھی۔“

”بس۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، دوست اور فیانسی تھا تو لازمی طور پر دل اس سے محبت بھی کرتی ہو گی۔“

”پتہ نہیں۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بس صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بہت پیار تھا انہیں دل آویز سے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ کیا یہی وہ صدمہ ہے جس کا ذکر آپ اس دن کر رہی تھیں؟“  
 ”جی ہاں۔“ اب کے مریم نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے ذرا سا رخ پھیر لیا تھا۔

دل آویز کسی طور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ آزر بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے، اسی لئے وہ جو بھی ان سے ملتا جلتا انسان دیکھتی ہے، اس کے پیچھے بھاگتی ہے، اسے آزر بھیا سمجھ کر اس سے باتیں کرتی ہے۔ اگر کبھی کوئی اسے ہرٹ کرے، تب زیادہ یاد آتے ہیں وہ اسے۔ اسی لئے میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ کا بھرپور خیال رکھے گا۔“  
 ”آپ شاید مجھے کرائے کا انسان سمجھتی ہیں مس مریم! جس کی اپنی کوئی زندگی، کوئی پسند و ناپسند نہیں۔“

مریم عباس کی روداد سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ گم سم سے انداز میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”میری کزن ہے عبیرہ۔ بچپن سے دونوں ساتھ پلے بڑھے ہیں میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں مس مریم!۔۔۔۔۔ اور وہ بھی بہت خیال رکھتی ہے

میرا۔ آپ کو شاید یہ جان کر شاک لگے کہ میں آل ریڈی اس کا شوہر ہوں۔۔۔۔۔ ایسا شوہر جس کی تقسیم کے لئے وہ دلی طور پر کسی طور راضی نہیں تھی۔“

اُس کا رخ مریم عباس کی طرف نہیں تھا ورنہ وہ اس کے چہرے پر بکھرنے والی زردی کو ضرور دیکھ لیتا۔ تاہم اس کے سفید دودھیا ہاتھوں کی گرفت کوریڈور میں دھرے لکڑی کے بیچ پر مضبوط ہوئی تھی۔

”آز بھیا کی رحلت کے بعد میرے لئے یہ دوسری بڑے دکھ کی خبر ہے۔“ اس کی بھگی آواز پر وہ اس کی طرف پلٹا تھا۔ مگر مریم عباس بنا اس کی طرف دیکھے پیچھے پلٹتے ہوئے تیز تیز چلتی کوریڈور سے نکل گئی تھی۔ وہ دور تک بجتے سیل سے بے نیاز اُس کے تیزی سے اُٹھتے ہوئے قدموں کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆...☆...☆

دل آویز جعفری کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔

سوید نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایک عرصے کے بعد بہت سا وقت اس نے عقیل جعفری کے ساتھ بتایا تھا، جو ماضی کے

دھند لکوں میں کھوئے، بہت دیر تک اسے اس کی نیچن کی بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ خود سے اس کی اُنسیت کے قصے بھی سناتے رہے تھے۔ سوید کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ نفرت کے چکر میں ددھیالی رشتہ داروں سے قطع تعلق کوئی ایسا بھی احسن اقدام نہیں تھا۔

عقیل صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ مریم عباس بھی لندن واپس اپنے والدین کے پاس جا رہی تھی۔ سوید کی نگاہیں بار بار اس کی گود میں سر رکھے لیٹی دل آویز جعفری کی سمت اُٹھ رہی تھیں۔ جو جانے کس احساس کے تحت یک ٹک ٹکلی باندھے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مسز عقیل کھانا لگوا رہی تھیں جبکہ عقیل صاحب اب اس سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے تمہارے جذبات و احساسات کا پورا خیال ہے سوید! میں کسی طور تمہاری طرف سے عبیرہ بیٹی کے حقوق میں زیادتی کا خواہش مند نہیں۔ کیونکہ وہ بھی مجھے اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ مومی۔“

”مومی۔۔۔۔۔؟“ سوید کے لئے یہ نام قطعی غیر شناسا تھا، تبھی وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ عقیل جعفری صاحب اب اسے وضاحت دے رہے تھے۔

”ہوں۔ مومی، دل آویز کانک نیم ہے۔ جب یہ چھوٹی سی تھی تو بالکل موم کی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ اسی لئے اس کی آنٹی نے پیار سے اس کا نام مومی رکھ دیا تھا۔ گھر میں اور گھر سے باہر اپنی فرینڈز کے لئے دل آویز صرف مومی ہی ہے۔“ بڑے پیار سے بتاتے ہوئے ایک آسودہ سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کر رکھا تھا۔ سوید کی نگاہ ایک مرتبہ پھر مومی کے شفاف چہرے کو چھو کر پلٹ آئی۔ عین اسی لمحے اس کے سیل پر عبیرہ کی کال آئی تو وہ عقیل صاحب سے معذرت کر کے سائیڈ پر چلا آیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔!“

”ہاں سوید!۔۔۔۔۔ کہاں ہو؟ میں کب سے کھانا بنا کر تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔ آئے کیوں نہیں ابھی تک؟“ اس کے ہیلو کہتے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔ سوید کو مجبوراً جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

”دل آویز کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیہ!۔۔۔۔۔ میں ابھی نہیں آسکوں گا۔“

”کیوں؟۔۔۔۔۔ تم اُس کے ڈاکٹر ہو یا اس کے پاپا ابھی سے کوچ کر گئے ہیں پاکستان سے؟“ اُسے اُس کی معذرت چبھی تھی۔ سوید دھیرے سے مسکرا دیا۔

”ڈاکٹر نہ سہی، اُس کا شوہر تو ہوں۔“

”جی نہیں۔ تم صرف اور صرف میرے ہو اچھا۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ محض کاغذی تعلق ہے تمہارا۔ یاد رکھنا سوید! اگر تم نے اسے پیار کرنے یا چھونے کی کوشش کی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ وہ جذباتی تھی اور اس وقت بھی اس نے جذباتیت کا مظاہرہ ہی کیا تھا۔ وہ پھر مسکرا دیا۔

”بے وقوف ہو تم اور کچھ نہیں۔ ایک پاگل لڑکی سے بھی خدشات لاحق ہیں تمہیں؟“

”لڑکی پاگل ہے تو کیا ہوا؟ لڑکا تو پاگل نہیں ہے نا۔ ویسے بھی تم مردوں کی رال ٹپکتے دیر نہیں لگتی۔“

”اچھا۔ مگر آپ بھول رہی ہیں محترمہ! کہ اس مرد کو اس شادی کے لئے مجبور کرنے والی بھی آپ ہی تھیں۔“

”ہاں تو شادی کے لئے مجبور کیا تھا نا۔ رومینس بگھارنے کے لئے نہیں۔“ وہ پھر جلی تھی۔ سوید اس بار ہنس پڑا۔

”شادی ہو گئی تو اب شریعت کی رُو سے رو مینس بھی ضروری ہے۔ ورنہ اللہ کا گنہگار ہوں گا۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ کرو رو مینس۔۔۔۔۔ جب فارغ ہو جاؤ تو آ کر میری قبر پر فاتحہ بھی پڑھ جانا۔“ اس بار سلگ کر کہتے ہوئے اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔ سوید ہنس پڑا۔ دل آویز اب بھی اسے دلچسپ نگاہوں سے نہنتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”کتنی پیاری لڑکی ہو تم۔ ذرا جیلس نہیں ہوتیں اپنی سوتن سے۔ خیر، ہو بھی کیسے  
سکتی ہو؟ میں کون سا تمہارا آزر عباس ہوں۔“ پلٹ کر عقیل صاحب کی طرف  
بڑھتے ہوئے اس کی نگاہ پھر دل آویز کی نگاہ سے ٹکرائی تھی اور اس نے دل  
ہی دل میں جیسے اس سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

عبرہ سے بات ہونے کے بعد اس کی کوشش فوراً گھر واپسی کی تھی۔ مگر عقلی صاحب نے اسے کھانا کھائے بغیر اُٹھنے ہی نہیں دیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اُٹھنے لگا تو مریم نے دل آویز کو بھی ساتھ تیار کر دیا۔

”مومی بھی آپ کے ساتھ جائے گی سوید بھائی! اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ ٹھٹکا تھا، ایک نظر عقیل صاحب اور مسز عقیل پر بھی ڈالی تھی، مگر ان کی نگاہیں بھی مریم کے الفاظ کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔

مریم نے اسے شانوں سے تھامے تھامے سوید کے برابر گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر لا بٹھایا تھا۔ وہ تمام راستے خاموش سی یوں بیٹھی رہی تھی، جیسے گاڑی میں بالکل اکیلی ہو۔ جس وقت وہ گھر پہنچے، خاصی دیر ہو چکی تھی۔ عبیرہ بے چین سی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بظاہر نیوز دیکھ رہی تھی مگر اصل میں اُسے سوید کی واپسی کا انتظار تھا۔ اب جو گاڑی کے ہارن پر وہ الرٹ ہو کر بیٹھی تھی، سوید کے ساتھ دل آویز کو دیکھ کر اس کا دل جیسے جل کر راکھ ہو گیا۔ سوید کے مطابق اگر اس کی طبیعت بہت خراب تھی تو پھر وہ اپنے پاؤں پر چل کر اس کے



ساتھ گھر کیسے آگئی تھی؟ ہزار وسوسے تھے جو اس کے صرف ایک جھوٹ کی آڑ میں اس کے دماغ میں گھس آئے تھے۔

اُس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ سوید کو دو چار تھپڑ رسید کر کے پھر خوب روئے۔ سوید اُسے لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر فوراً اس کی طرف لپکا تھا۔

”بیہ! آئی ایم سوری۔ میں۔۔۔۔۔“

”جسٹ شٹ اپ سویڈ! جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے کوئی۔“ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ سویڈ کی مشکل بڑھ گئی۔

”میری بات تو سنو یاں!“

”مجھے کچھ کہنا سننا نہیں۔ جاؤ عیش کرو اپنی نئی نویلی بیگم کے ساتھ۔“ غصے سے کہتے ہی وہ سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔ سوید نے بھاگ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”اتنی جلدی بد گمان ہو گئیں عبیرہ؟“

”بازو چھوڑو میرا۔“ وہ اُس کی طرف دیکھنے کی روادار بھی نہیں تھی۔ سوید دکھ کی شدت سے اسے دیکھتا، زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر اپنے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔

”ہے اتنا حوصلہ تم میں کہ مجھے کسی دوسری عورت کے ساتھ عیش کرتے دیکھ سکو۔“ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ عبیرہ چپ چاپ رو پڑی۔

”نہیں ہے نا، اسی لئے کہتا ہوں بیہ! میرے ضبط کا امتحان مت لیا کرو۔ ہزار بار کہہ چکا ہوں میرا جسم، میری روح، میری ہر سوچ صرف تمہارے لئے ہے۔ تمہارا پیار اتنا کافی ہے میرے لئے کہ کسی اور کے لئے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔“ اس بار نرمی سے کہتے ہوئے اس نے عبیرہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر خفا خفا سی اس کے سینے سے لگی روتی رہی تھی۔

سوید تو بھول ہی گیا کہ وہ نیچے لاؤنچ میں دل آویز عرف مومی نامی ایک حادثاتی پاگل لڑکی کو اکیلا ہی چھوڑ آیا ہے، جو سکڑی سمٹی سی، لاؤنچ میں دھرے ٹی وی پر نگاہ پڑتے ہی سسک اُٹھی تھی۔

”آزر۔۔۔۔۔!“ بے خودی میں اُس کے لب بار بار اسی نام کا ورد کر رہے تھے جبکہ باہر شب جیسے اس پر ہنستے ہوئے آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے مومی؟“ آسیہ بیگم، مومی کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ جب عینی نے مریم کے ساتھ وہاں انٹری دیتے ہوئے پوچھا۔ مومی کی نگاہیں اٹھی تھیں اور اس کے ساتھ آزر کو نہ پا کر دوبارہ پلٹ گئی تھیں۔

”ٹھیک ہوں۔“ گھر کے سب افراد کے ساتھ ساتھ وہ عینی سے بھی عجیب سی جھجک اور شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ جانے اُس کی بزدلی کے بارے میں وہ بھی کیا سوچتی ہو گی۔ مریم بیڈ پر اس کے پہلو میں آ بیٹھی تھی۔

”تم بہت بری ہو مومی! قسم سے۔“ منہ اس کے کان میں گھسیڑتے ہوئے اس نے گلہ کیا تھا۔ مومی کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکان بکھر گئی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ صحیح کہتی ہو مریم!“ وہ نہ جانے کس سوچ کے حصار میں تھی۔

عین اسی لمحے آزر نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ پُر شکن کپڑوں اور نیند کی کمی سے سرخ تھکی تھکی سی آنکھوں کے ساتھ اس کا حال مومی پر خوب واضح ہو رہا تھا، مگر وہ زیادہ دیر اس پر نگاہ جما کر نہ رکھ سکی تھی۔

”آزر بیٹے! تھوڑی دیر گھر جا کر آرام کر لو۔ پچھلے تین روز سے بے آرام ہو۔“  
مسز عقیل اس پر نگاہ پڑتے ہی بولی تھیں۔ مگر وہ سرسری سی نگاہ مومی پر  
ڈالتے ہوئے اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔

”میں ٹھیک ہوں آنٹی!۔۔۔۔۔ البتہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ پلیز آپ لوگ گھر جائیے۔ صرف آج کی رات ہے۔ کل اللہ نے چاہا تو مومی ہمارے گھر ہو گی۔“ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ رف حلیے میں بھی وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ مومی نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

”میرا خیال ہے، میں مومی کے پاس رک جاتی ہوں۔ آپ لوگ جائیں۔“ عینی بروقت بولی تھی مگر آزر نے اس سے اتفاق نہیں کیا

”نہیں۔ میں نے کہا نا، میں یہاں ہوں۔ تم گاڑی ڈرائیو کر سکتی ہو۔ پلیز، ماما اور آئی کی غیرہ کو گھر لے جاؤ۔ انہیں مجھ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ ضدی تھا۔ عینی، مومی کے سامنے اپنا بھرم کھونے کے ڈر سے نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گئی۔ باہر شام گہری ہو رہی تھی۔ آزر سب کو رخصت کرنے کے

بعد کمرے میں واپس آیا تو مومی ڈبل تکیے پر سر رکھے لیٹی پلکیں موند گئی تھی۔ وہ چپ چپ سا اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تمہیں پتہ ہے مومی! آج تمہارا برتھ ڈے ہے؟“ اچانک وہ بولا تو مومی کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

”بھی بھئی مجھے تم پر اتنا شدید غصہ آتا ہے کہ تمہارا حشر نشر کرنے کو جی چاہتا ہے، مگر۔۔۔۔۔ اگلے ہی پل میں خود کو قطعی بے بس محسوس کرتا ہوں۔

سمجھ میں نہیں آتا، تمہارا کیا کروں؟“

”ایم سوری آزر!۔۔۔۔۔ ایم ریٹی ویری سوری۔“ وہ اس کے سامنے پھر رو  
پڑی تھی۔ آزر تڑپ اُٹھا۔

”کس بات کی سوری؟“ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا جب وہ بولی۔

”میں بہت خود غرض ہوں۔ نیچکین سے اب تک میں نے صرف اپنے لئے سوچا ہے۔ اپنی خوشی، اپنے غم کے لئے۔۔۔۔۔ میں جو سانس بھی تمہارے لئے لیتی ہوں، تمہارے لئے تو کبھی سوچ ہی نہیں سکی۔ بہت تنگ دل ہوں میں آزر!

پلیز مجھے معاف کر دو۔“ وہ اب بھی اپنی سوچ کے حصار میں تھی۔ آزر کے لب ہلکے سے مسکرا دیئے۔

”شکر ہے، تمہیں اس بات کا احساس تو ہوا کہ تم کتنی بری ہو۔“ مومی کا نرم و نازک سا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔ وہ سر جھکا کر بے وجہ مسکرا دی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ مگر تم بہت اچھے ہو۔ تبھی تو ہر مشکل میں سب سے پہلی صدا میں تمہیں دیتی ہوں۔“

”وہ تو میں ہوں۔۔۔۔۔ خیر آئندہ اگر تم نے ایسی کوئی فضول حرکت کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا مومی! میں سچ مچ تمہارا حشر نشر کر کے رکھ دوں گا۔“ دھیمے سے مسکراتے ہوئے وہ فوراً سنجیدہ ہوا تھا۔ مومی نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی آزر! ایک پل بھی نہیں۔“ اس کی آنکھیں آزر کے چہرے پر جی چنچ چنچ کر کہہ رہی تھیں مگر ہونٹوں پر چپ کا بھاری قفل پڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یونہی آزر کو دیکھتے، اس سے باتیں کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر وہ اس رات بھی نہیں سویا تھا۔ مومی کا کمبل ٹھیک کر کے۔ دیر تک اس کے سرہانے بیٹھا وہ اس کے دل کش مومی چہرے کو دیکھتے ہوئے بنا اپنی تھکن کی پروا کئے، جاگتی آنکھوں سے جانے کیسے کیسے خواب دیکھتا رہا تھا۔

☆...☆...☆

”مومی! درد تو نہیں ہو رہا؟“ آزر کا اس کے کمرے میں پانچواں چکر تھا۔ مومی کا دل اس کی اس درجہ توجہ پر خوشی سے بھر گیا۔

”نہیں۔“ نگاہ اس کے چہرے پر جمائے جمائے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا

جب وہ بولا۔

”تو پھر کچھ کھا کیوں نہیں رہی ہو؟“

”میری مرضی۔“ وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ ”آزر مسکرا دیا۔“

”نہیں باز آؤ گی نا تنگ کرنے سے؟“

”اوں ہوں۔“ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے آزر کی مسکراہٹ گہری کی تھی۔

”بہت پٹائی کروں گا۔۔۔۔۔ سوچ لو۔“

”سوچ لیا۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے۔ میرا ارادہ آج تمہیں کچھ دکھانے کا تھا، مگر۔۔۔۔۔ تم تنگ کرنے سے باز نہیں آؤ گی تو پھر۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں دکھانے والا۔“

اب وہ اسے بلیک

میل کر رہا تھا۔ مومی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میرا کچھ بھی کھانا تمہارے لئے اتنا ضروری تو نہیں آزر!“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ جواب میں آزر نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر رسید کر دی۔

”تم پاگل ہو اور کچھ نہیں۔ چلو شاباش یہ سوپ پیو۔ پھر میں تمہیں آؤٹنگ پر لے کر چلتا ہوں۔“

”کیا عینی بھی ساتھ جائے گی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی صرف ہم دونوں جا رہے ہیں اور بس۔“ کتنا مہربان ہو رہا تھا وہ اس پر۔ مومی کے لئے سوسائڈ کرنے کی یہ کوشش، جس کی وجہ اس نے کسی کو بھی نہیں بتائی تھی، بہت سودمند رہی تھی۔



تقریباً ایک گھنٹے کے بعد آزر اسے خود اپنے ہاتھوں سے سوپ پلا کر باہر گاڑی تک لے آیا تھا۔

مسز عقیل اور آسیہ بیگم کے ساتھ ساتھ مریم اور عینی بھی اس وقت لان میں بیٹھے، مومی کے نصیب پر رشک کر رہے تھے۔ آسیہ بیگم کا ارادہ جلد از جلد دونوں بیٹوں کے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا تھا اور اس سلسلے میں مومی کے بعد اپنے بڑے بیٹے کے لئے ان کی نظر عینی پر تھی، جس کے دل میں صرف اور صرف آزر کے لئے پیار تھا، یاسر عباس کے لئے نہیں۔ تاہم گھر میں کوئی بھی اس بات سے آگاہ نہیں تھا۔ مومی کو ایک مدت کے بعد زندگی بے حد پیاری لگ رہی تھی۔

”آزر! ایک سوال پوچھوں، سچ جواب دو گے؟“

”پوچھو۔“ تمام مصروفیات بھلائے وہ صرف اُس کا ہو کر رہ گیا تھا۔

”کیا اب بھی تم کسی سے پیار نہیں کرتے؟“

”کرتا ہوں۔“ آزر اُس کی اُجھن سمجھ رہا تھا، تبھی مسکرا دیا۔

”کس سے؟“

”یہ تمہیں کیوں بتاؤں؟ کچھ تو سیکرٹ بھی رہنے دو۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا اب میں تمہاری دوست نہیں رہی؟“

”دوست ہو، اسی لئے تو بتا نہیں رہا۔ تمہارا کوئی پتہ چلتا ہے، کب کیا کر دو۔ ویسے بہت جلد اس راز سے پردہ اُٹھنے والا ہے، کیونکہ میں نے ماما سے کہہ دیا ہے، جلدی سے میری شادی کر دیں۔ نہیں تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ اس کی مسکراہٹ مومی کی اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ پھر کتنی ہی دیر تک اس سے کوئی سوال نہ کر سکی۔ آزر نے گاڑی ایک زیر تعمیر عمارت کے سامنے روکی تو اس کا انہماک ٹوٹا۔

”آؤ مومی! تمہیں وہ تاج محل دکھاؤں جو میں نے اپنی ممتاز بیگم کے لئے

تعمیر کروایا ہے۔“ وہ اتنا خوش اور پُر جوش تھا کہ مومی اس کے ہاتھ میں

دبے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اس کی شدت محسوس کر سکتی تھی۔

”یہ دیکھو، یہ لان ہے۔ یہاں میں دنیا بھر سے نایاب قسم کے پودے اور پھول

لا کر لگاؤں گا اور پھر میں اور میری ممتاز بڑھاپے میں اپنے بچوں سے روٹھ

کر یہیں ایک دوسرے کا غم بٹانے کے لئے پہروں بیٹھے رہیں گے۔ اور یہ

دیکھو، یہ اطالوی طرز کا کچن ہے۔ جب میں آفس سے تھک کر آیا کروں گا تو میری ممتاز یہیں ملا کریں گی مجھے۔ اور یہ۔۔۔۔۔۔ یہ ہمارا بیڈ روم ہے۔ میں اس کی دیواروں پر اتنا دیدہ زیب پینٹ کرواؤں گا کہ میرے گھر سے جانے کے بعد بھی میری ممتاز کا دل اس کمرے سے نکلنے کو نہیں چاہے گا۔“

اپنی ہی خوشی اور جوش میں وہ اسے اپنے ساتھ ساتھ کھینچتا اپنا سب سے چھپ کر خفیہ خریدا ہوا گھر دکھا رہا تھا۔ اس لمحے مومی کو وہ وہی لندن والا آزر عباس لگ رہا تھا، جس نے

اپنی ایسی ہی حرکات سے اس کے دل میں اپنے پیار کی شمع روشن کی تھی۔

”اور یہ دیکھو۔ یہاں ہمارے بیڈ روم کے ٹیرس سے شام ڈھلنے اور پھر سورج نکلنے کا منظر اتنا دل فریب لگتا ہے کہ جب بھی میری ممتاز کا مجھ سے کسی بات پر جھگڑا ہوا کرے گا، وہ مجھے روتی بسورتی، تمہاری طرح گلے شکوے کرتے یہیں بیٹھی ملا کرے گی۔ یہ تاج محل اسی کی ملکیت ہو گا مومی!“

جگمگاتی سیاہ نگاہوں میں ڈھیروں خواب سجائے وہ اسی کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑا دونوں بازو سینے پر باندھے، خواب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مومی نم پلکوں سے یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

”تم بہت بری ہو مومی! قسم سے، نہ تم کوئی فضول حرکت کرتیں، نہ میں تمہیں ابھی یہاں لاتا۔ یہ تاج محل، اپنی مکمل تکمیل تک میرے گھر والوں کے لئے ایک سرپرائز ہے۔“ فوراً اپنے خوابوں کے سحر سے نکلنے ہوئے اس نے پھر مومی کو سرزنش کی۔ وہ سر جھکائے چپ کھڑی رہی۔

”چلو آؤ۔۔۔۔۔۔ مارکیٹ چلیں۔ تمہارا برتھ ڈے گفٹ ڈیو ہے مجھ پر۔“ انتہائی مصروف انداز میں دوسرے ہی پل اس کا ہاتھ تھام کر پھرتی سے وہ بالائی منزل سے نیچے اتر آیا۔ مومی کا دل ان لمحوں کے لئے امر ہو جانے کی دعا کر رہا تھا۔

”یہ رنگ دیکھو۔ اچھی ہے نا؟ میری ممتاز کے ہاتھ میں بہت پیاری لگے گی۔“ مارکیٹ پہنچ کر سب سے پہلے وہ جیولرز شاپ میں گھسا تھا۔ مومی نے رنگ فوراً انگلی سے اتار دی۔

”چلو، ڈریس دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے نیکسٹ ویک میں میری ماما میری شادی کا فنکشن رکھ دیں۔۔۔۔۔۔ تو اچھے کپڑے تو ہونے چاہئیں نا تمہارے پاس۔“

اپنے ہی انداز میں کہتا، بنا اُس کے احساسات کی پروا کئے، وہ اب اسے ساتھ لئے بوتیک میں گھس رہا تھا۔ مومی جیسے بے اختیار سی اُس کے ساتھ کھینچتی جا رہی تھی۔

”یہ بلیک ڈریس دیکھو۔ پیارا ہے نا؟“

”جی نہیں۔ تمہاری شادی پر بلیک ڈریس نہیں پہننا مجھے۔“ پہلی بار اس نے لب کھولے تھے۔ آزر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا زیر لب مسکرا دیا۔

”اور کیسا ڈریس پہننا ہے میری شادی پر؟“

”جیسا تمہاری بیوی پہنے گی، بالکل ویسا ہی۔“

”نہیں یار! وہ تو دُلہن ہو گی۔ تم کوئی دُلہن تھوڑی ہو گی؟“

”تو کیا ہوا؟ بس مجھے یہ بلیک ڈریس نہیں پہننا۔“

”تم یہی بلیک ڈریس پہنو گی۔ بس میری پسند ہے یہ۔“ وہ ضدی ہوا تھا۔ مومی بھی ضد میں آ گئی۔

”میں یہ بلیک ڈریس نہیں پہنوں گی۔ اتنا ہی پسند ہے تو اپنی محبوبہ کو گفٹ کر دو۔“

”اوکے، یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو پھر تم یہ بلیو سوٹ پہنو گی۔ یہ بھی بہت اچھا لگا ہے مجھے۔“ ڈارک بلو سوٹ جس پر خالص نیگنوں کا ہلکا پھلکا کام ہوا تھا، اٹھاتے ہوئے اس نے کہا تو مومی چڑ گئی۔

”مجھ پر فرض نہیں ہے کہ تمہاری پسند کا ڈریس ہی پہنوں۔ اب میری اپنی بھی کوئی پسند ہے۔“

”گولی مارو اپنی پسند کو۔ بس تم یہ بلو سوٹ پہنو گی۔ چلو اب چوڑیاں دلاؤں تمہیں۔“

”مجھے نہیں لینا چوڑیاں۔ بس اب گھر چلو۔“

”اول ہوں۔۔۔۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں چوڑیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ تو شکر کرو، ابھی عینی ساتھ نہیں آئی۔ ورنہ اس نے تو ساری جیب خالی کروا دینی تھی میری۔ کل

اُس کے حوالے سے بھی ایک زبردست سرپرائز دوں گا تمہیں۔“ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ مومی کے اندر کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔

”چلو اب مزے کی آس کریم کھلاتا ہوں تمہیں۔ زیادہ ہیوی کھانا تو کھا نہیں سکو گی تم۔“ رنگا رنگ چوڑیوں کے کئی پیکٹ اپنی پسند سے خریدنے کے بعد وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ مومی لا تعلق سی چپ چاپ اثبات میں سر ہلا گئی۔

”آج بڑے فیاض اور مہربان ہو رہے ہو۔ خیر ہے نا؟“

”ہوں، تمہیں کیا لگتا ہے خیر نہیں ہے؟“ وہ ہنسا تھا۔ مومی خاموش رہی۔

”میرا دل چاہتا ہے مومی! بس آج تم میرے ساتھ رہو بہت دیر تک۔“

”کیوں، کیا آج کے بعد تم پر پابندی لگ جائے گی؟“

”کیا پتہ؟“ شانے اچکاتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مسرور سا فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”ایک نظم سنو گی؟“ وہ خاموش سی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی، جب آزر گاڑی کو مین روڈ پر لاتے ہوئے بولا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ نہیں بھی سنوں گی تو تم کون سا سنائے بغیر رہ جاؤ گے؟“ وہ اس کے الفاظ پر مبہم سا مسکرایا تھا۔

”خاصی سمجھ دار ہو گئی ہو۔“ مومی نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر نگاہ پھیر لی۔

پاگل لڑکی تم سے مل کر یوں لگتا ہے

جیسے خواب کی رانی تو ہے

میری پریم کہانی تو ہے

تیری اُٹھتی گرتی پلکیں

نین کٹیلے، ہونٹ رسیلے

مل جل کر بے کل کرتے ہیں

دوش زمانے کو کیا دینا

مجھ کو خود سے ڈر لگتا ہے

صحرا جیسا گھر لگتا ہے

پریت کی بوچھاڑیں ہیں قاتل

سچ پوچھو تو مجھ کو اب بھی



مر جانے کی آس نہیں ہے

بارش مجھ کو راس نہیں ہے!

اُس کا لہجہ گمبھیر ہو رہا تھا۔ مومی چاہتے ہوئے بھی چپ نہ رہ سکی۔

”ویری گڈ۔۔۔۔۔ نظم تو اچھی ہے۔ مگر نظم کا پس منظر کیا ہے؟“

”وہ کل بتاؤں گا، جب عینی کو لندن کے لئے ایئرپورٹ چھوڑنے آئیں گے۔“

بے خیالی میں وہ اسے بتا گیا تھا۔ مومی چونک اُٹھی۔

اس روز کے بعد اسے صحیح معنوں میں ہوش میں آنا نصیب ہوا ہی نہیں۔ جب

بھی ہوش میں آتی، چیخنے چلانے لگتی یا پھر سہم کر گھنٹوں دیواروں کو گھورتی

رہتی۔ آزر کی شبیہ اُسے ہر شے میں دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا ذرا سا مسکرا کر سر

جھٹکنا اُس کے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ وہ سارا دن پلکیں موندے لیٹی اس

کے لبوں سے ادا ہونے والی نظم ”بارش مجھ کو راس نہیں ہے“ ذہن میں

دہرائی رہتی تھی۔

عینی لندن واپس جا چکی تھی۔ آسیہ بیگم کو بھی یاسر وہیں لے گیا تھا، کچھ ماہ کے

لئے۔ مسز عقیل اور عقیل صاحب بھی مومی اور مریم کے ساتھ لندن میں ہی

رہے تھے۔ مگر پھر مومی کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر ڈاکٹرز نے جب اس

کے لئے فوری شادی کا ایک آپشن رکھا تو وہ فوری پاکستان چلے آئے۔ مومی کو

سنبھالنے کے لئے مریم بھی ان کے ساتھ ہی پاکستان چلی آئی تھی۔

پاک سرزمین کی پاک فضا میں اس روز ہاسپٹل کے قریب ہونے والا وہ خود کش

حملہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس حملے میں ضائع ہونے والی ساری قیمتی

جائیں عام لوگوں کی بھیں۔ کسی وزیر، کسی مشیر کا کوئی بیٹا نہیں مرا تھا۔ لہذا

حکومتی سطح پر صرف چند مذمتی جملوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا

مگر۔۔۔۔۔ لوگوں کے جان و مال کے محافظ ان نگہ ہوں کی حکمرانی میں ہے

قصور لقمہ اجل بننے والے ان سینکڑوں افراد سے وابستہ جانے کتنے خاندانوں سے

زندگی جیسے روٹھ گئی تھی۔

اقتدار کے نشے میں چور۔۔۔۔۔ صرف اپنی عیاشیوں اور آسائشوں کے لئے بے

بس مظلوم لوگوں کی جانوں پر سیاست کرنے والوں کے لئے آذر عباس کی

ناگہانی موت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔ مومی کو ساری فضا اس

شہزادے کی حادثاتی موت پر سسکیاں لیتی سنائی دیتی تھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنا پچھلا سفر طے کر رہی تھی۔

مومی ہال کمرے سے نکل کر، سست روی سے بے خود سی چلتی باہر آ گئی۔ دور آسمان پر سب سے زیادہ روشن دکھائی دینے والا ستارہ آہستہ آہستہ سرکتاب جیسے عین اُس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ شدید ٹھنڈ کے باوجود اسے اپنے جسم سے ٹکراتے سرد ہوا کے شریر جھونکوں سے کوئی فرق پڑتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

[illegible]

وہ تصویر جس سے فرصت کے لمحات میں باتیں کیا کرتا تھا، اسی کی تصویر تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کے سارے راز افشا ہو گئے تھے۔ آزر کے اس کے لئے خریدے ہوئے گفٹ امانتاً اُس کی الماری میں اُن چھوٹے پڑے تھے۔ اُس کی ادھوری ڈائری جس میں اس کے ہزاروں خواب لفظوں کی صورت دفن تھے۔ آخری وقت میں جو شاپنگ اس نے اس کے لئے کی تھی، وہ ساری چیزیں بھی گاڑی میں جوں کی توں پڑی رہ گئی تھیں۔ بس ایک رِنگ تھی، جو اس کی پاکٹ میں ہونے کے باعث اسی کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔

”دل آویز۔۔۔۔۔“ سوید کی آنکھ کھلی تھی۔

وہ پانی پینے کے لئے نیچے کچن میں آیا تھا جب دل آویز کو کمرے میں نہ پا کر ہال کمرے سے باہر نکل آیا مگر۔۔۔۔۔ وہ اس کی پکار پر نہیں پلٹی تھی۔  
تبھی وہ اس کے قریب آیا تھا۔

”دل آویز!“ اس بار نرمی سے پکارتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر دھرے تھے، تبھی وہ حیران حیران سی پلٹی تھی۔

”اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟ کسے ڈھونڈ رہی ہو وہاں آسمان پر؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہاں ایک ستارہ نہیں ہے مم!۔۔۔۔۔ میں روز اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جگمگاتے ہوئے دیکھتی تھی مم! مگر اب وہ وہاں نہیں ہے۔“ وہ

پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ سوید کی نگاہیں بھی آسمان پر جم گئیں۔

”سردی بڑھ رہی ہے دل آویز! اندر چلو۔“ کچھ ہی لمحوں میں تھک کر وہ اسے کہہ رہا تھا۔ مومی خالی خالی سی نگاہوں کے ساتھ واپس پلٹ آئی۔

اس رات صبح فجر کی نماز کے قریب کہیں اس کی آنکھ لگی تھی اور پہلی بار اس نے آزر کے ساتھ سوید کو دیکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ندی کنارے بیٹھے کچھ کھا رہے ہوتے ہیں۔ سوید، آزر سے گلے مل کر رخصت ہوتا ہے تو وہ مومی کا ہاتھ تھام کر اسے سوید کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ سوید، مومی کو ساتھ لے کر رخصت ہوتا ہے تو اس کی گاڑی ایک درخت سے ٹکرا جاتی ہے۔ سوید آزر کا لہو لہان چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور وہ چیختی ہے۔ عین اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔

سوید اس وقت اسی کے کمرے میں موجود، کوئی چیز تلاش کر رہا تھا جب وہ فلک شگاف چیخ کے ساتھ بیدار ہو گئی۔ وہ پلٹ کر فوراً اس کی طرف لپکا تھا۔ ”دل آویز۔۔۔۔۔ آریو اوکے؟“ عبیرہ نیچے کچن میں اس کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھی، مومی کی چیخ پر وہ بھی اوپر چلی آئی۔ دل آویز اب سہمی سہمی سی نگاہوں سے سوید کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

عبیرہ کو سوید کی مومی کے پاس موجودگی تپا گئی تھی۔ وہ خاموشی سے پلٹ گیا۔ ”کچھ نہیں۔ میرا کمرہ ہے۔ ایک ضروری فائل لینے آیا تھا۔“

”اوکے، چلو نیچے ناشتہ تیار ہے۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا بازو سوید کے بازو کے گرد لپیٹ دیا تو مومی مچل کر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ت۔۔۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ اس کا ذہن اب بھی خواب والے حادثے کے حصار میں تھا۔ عبیرہ حیران حیران سی سلگ اٹھی۔

”یہ کیا بکواس ہے؟۔۔۔۔۔ تم تو کہتے تھے، یہ پاگل ہے۔ پھر یہ اُلفت، یہ استحقاق۔ میری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو نا تم؟“

بے زاری سے اپنا بازو مومی کی گرفت سے چھڑا کر اسے قریبی بیڈ پر دھکیل دیا۔

”پاگل ہو۔۔۔۔۔ پاگل ہی رہو۔ مجھے پاگل مت کرو پلیرز! کتنی بار کہوں کہ میں تمہارا آزر عباس نہیں ہوں۔“ تنفر سے کہہ کر وہ فوری کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ مومی کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ پھیلا اور بائیں گال پر لڑھکتا ہوا ہونٹوں میں جذب ہو گیا۔

عقیل صاحب اپنی وائف اور مریم کے ساتھ لندن روانہ ہو گئے تھے۔

روانگی سے تین روز قبل ہی دل آویز، عقیل منزل میں چلی آئی تھی، جہاں مریم زیادہ وقت اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے اس سے آزر کی باتیں کرتی رہی تھی۔ اسی روز وہ مومی کو آزر کے خوابوں کے نگر اُس کے زیر تعمیر تاج محل میں لائی تھی، جس کے بارے میں صرف مریم ہی جانتی تھی۔ اس نے مومی کو آزر کے کمرے میں اس کے لئے رکھی چیزیں اور وہ

”ایسی کوئی بات نہیں ہے عبیرہ! میں تو ابھی کمرے میں آیا ہوں۔ یہ شاید خواب میں ڈر گئی ہے، اسی لئے ایسا کہہ رہی ہے۔“ نرمی سے کہتے ہوئے اس نے عبیرہ کو اپنے حصار میں لیا تھا جب مومی بول اُٹھی۔

”آزر!۔۔۔۔۔تت۔۔۔۔۔تم اس کے نہیں ہو۔ مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔  
تت۔۔۔۔۔تم صرف میرے ہو۔تت۔۔۔۔۔تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ وہاں  
آگ ہے۔ تم وہاں نہیں جاؤ گے۔“ اس کی گردن اور پیشانی پسینے سے تر تھی۔  
سوید شرمندہ اور حیران سا اسے دیکھتا رہ گیا جو اس کا دوسرا بازو تھام رہی  
تھی۔ عبیرہ کا دماغ گھوم گیا۔

”سن لیا، کیا کہہ رہی ہے یہ پاگل۔ اب بھی کچھ کہنے کے لئے ہے تمہارے پاس؟“ وہ چلائی تھی۔ مومی اُس کے احساسات سے قطعی بے نیاز سوید کے بازو سے لگ گئی۔

”رہو اسی کے ہو کر۔ مجھے بڑی ہوئی محبت نہیں چاہئے۔“ کینہ توڑ نگاہوں سے وہ دونوں کو دیکھتے ہوئے تلخی سے کہتی کمرے سے نکل گئی تھی۔ سوید نے



تصویر بھی دکھائی، جس سے مومی کی بدگمانیاں آزر کے لئے بڑھی تھیں۔

تاج محل میں ایک مرتبہ پھر مومی کی حالت شدید بگڑ گئی تھی، تبھی مریم کو مجبوراً سوید کو کال کر کے اسے وہاں بلوانا پڑا۔ وہ ایک ضروری میسٹنگ میں مصروف تھا، مریم کی کال پر پہلی فرصت میں وہاں پہنچا اور پھر دونوں مل کر اسے ہسپتال لائے۔ سوید نے اپنا سیل آف کر دیا تھا جس سے عبیرہ کی الجھن بڑھی تھی۔ وہ دن میں جب تک اسے پچاس فون نہیں کر لیتی تھی، اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ آج کل تو ویسے بھی وہ تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھی۔ لہذا سوید خود ہی سارا دن اس سے رابطے میں رہتا اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ تاہم اس روز مومی کی حالت ہی اتنی بگڑ گئی تھی کہ اسے مجبوراً عبیرہ کی خفگی سے بچنے کے لئے اپنا سیل آف کرنا پڑا۔ دن کے بعد شام بھی ڈھل گئی تھی۔ عبیرہ کی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی۔ ادھر مریم جو اپنا سامان بھی پیک کر چکی تھی، تاج محل کی ادھوری تعمیر کے بارے میں سوید کو سب کچھ بتاتے ہوئے بولی۔

”یہ گھر مومی کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے سوید بھائی! اسی لئے اس کی طبیعت اتنی خراب ہوئی۔ آپ دعا کیجئے، اسے سکون کی زندگی تو نصیب نہیں ہوئی، سکون کی موت ہی نصیب ہو جائے۔“ وہ از حد آزرده تھی۔ سوید گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

رات خاصی تاخیر سے وہ گھر واپس لوٹا تو چوکیدار سے حالات کا پتہ چلا۔ عبیرہ کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور راحیلہ بی اس سے رابطے کی تمام تر کوشش کے بعد ناکام ہو کر اکیلی ہی اسے ہسپتال لے گئی تھی۔ سوید کے پاؤں تلے سے زمین نکلی تھی۔ تھکن سے چور اس نے چوکیدار سے ہسپتال کا پوچھا اور فوراً گاڑی نکال لی۔ عبیرہ ابھی لیبر روم سے باہر تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کی ڈیوری بغیر مہر آپریشن کے ممکن نہیں تھی۔ وہ رو رہی تھی جب سوید آزر اس کے پاس پہنچا۔

”بیہ!۔۔۔۔۔ بیہ! ایم سوری۔ میں ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ سیل کے سگنل بھی کام نہ کر رہے تھے۔ تم ٹھیک ہو نا؟“

”ابھی تو ٹھیک ہے۔ مگر ڈاکٹرز نے ڈلیوری کے لئے میجر آپریشن کا کہا ہے۔“  
راحیلہ بی کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ اس سے پہلے تو ڈاکٹرز سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دیتے رہے ہیں۔“

”ڈاکٹرز کا کیا ہے۔ جب چاہیں سیاست دانوں کی طرح اپنا بیان بدل لیں۔  
تمہارے پاپا شہر سے باہر ہیں۔ میں اکیلی عورت کیا کیا کروں؟“

”ایم سوری ماما!۔۔۔۔۔ میں واقعی ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ وگرنہ آپ تو جانتی ہیں، میری بیہ میں میری جان ہے۔“

عبیرہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے پھر اسے اپنی  
محبت کا یقین دلایا تھا۔ تبھی ڈاکٹرز نے آپریشن کا اعلان کر دیا۔

”بیہ!۔۔۔۔۔ پلیز کوئی ٹینشن مت لینا۔ اللہ ہے نا ہمارے ساتھ۔ وہ سب بہتر  
کرے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، میری بیہ کو معمولی سی تکلیف بھی نہیں  
چھو سکتی۔ میں۔۔۔۔۔ میں یہیں ہوں۔ بس جلدی سے جاؤ اور ہمارا بے بی لے

آؤ۔“ لیبر روم سے باہر وہ اسے حوصلہ تھما رہا تھا۔ اس پر بے تحاشا پیار لٹا رہا  
تھا۔ اسی پل عبیرہ نے لب کھولے تھے۔

”سوید! ایم سوری۔ میں نے تمہیں بہت تنگ کیا ہے۔ تمہیں پوجنے کی حد تک  
چاہنے کے باوجود بڑے امتحان لئے ہیں تم سے۔ آج امتحان دینے کی باری  
میری ہے۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں  
دل آویز سے دُور رکھا۔ اپنے اللہ کی گنہگار ہوئی۔۔۔۔۔ اپنے چھوٹے طرف سے  
مجبور اس کے احکامات کی نافرمانی کی۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے  
آزر!۔۔۔۔۔ وہ نوازنا بھی جانتا ہے اور لینا بھی۔ اگر۔۔۔۔۔ اگر میں واپس نہ آ  
سکی تو پلیز۔۔۔۔۔“

”چپ کر جاؤ بیہ!۔۔۔۔۔ نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں نے کہا نا، تمہیں  
کچھ نہیں ہو گا۔ تم میری زندگی ہو بیہ! میرے لئے جیو گی۔“ اس پر جھکا اس  
کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لئے وہ اسے پیار کر  
رہا تھا۔

عبیرہ پُرسکون سی، لبوں پر پھسکی سی مسکراہٹ سجائے لیبر روم میں چلی گئی۔ سوید آزر اس لمحے دل آویز جعفری کا درد بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ مگر اسے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ اس کی حالت بگڑتی، نہ وہ اتنی دیر تک اپنی عبیرہ سے دُور رہتا۔ اس کے لب مسلسل درود پاک کا ورد کر رہے تھے۔

اس نے ڈاکٹر سے کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں منہ مانگی رقم ادا کرے گا، مگر اس کی بیوی کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا تھا اور اسے صحت مند بیٹے کی ولادت کے ساتھ ساتھ بیوی کی زندگی کی نوید ملی تھی۔ اللہ رب العزت کے حضور مانگی گئی اس کی دعائیں رد نہیں ہوئی تھیں۔ وہ خوش تھا۔ اتنا خوش کہ ہاسپٹل کے پورے عملے کو اس نے پیسوں سے خوش کر دیا تھا۔

عبیرہ کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد ہوش میں آئی تو اس کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ گو جسم ابھی درد کے حصار میں تھا، مگر وہ اپنے بچے کو فوری فیڈ کروانے کی خواہش مند تھی۔ راحیلہ بی کے پاؤں مارے خوشی کے

زمین پہ نہ ٹٹکتے تھے۔ جانے کیوں اس موقع پر ان کی آنکھیں پھر سے فضیلہ بی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”سوید! اللہ رب العزت نے ہم پر بڑا کرم کیا ہے۔ میرے بیٹے کا وارث دنیا میں آ گیا۔ بس اب یہاں سے فارغ ہو کر تم پہلا کام اس لڑکی کو طلاق دینے کا کرو گے۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری پُرسکون زندگی میں گھس آئی ہے۔“ راحیلہ بی کا اشارہ دل آویز کی طرف تھا۔ سوید کی نگاہ عبیرہ کی نگاہ سے ملی اور پھر فوراً جھک گئی۔

”ٹھیک ہے امی! میرے بیٹے کو دیکھیں، ایک ایک نقش میرا چرایا ہے اس نے۔“

”ہوں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ بہو کو گھر کب تک لے جا سکیں گے؟“

”آج ہی لے چلتے ہیں۔ میں اپنی بیہ کو مزید یہاں اس بستر پر نہیں دیکھ سکتا۔“

پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا وہ اٹھا اور ڈاکٹرز سے بات کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تبھی راحیلہ بی، عبیرہ کے قریب آئی تھی۔

”عبیرہ! سب ٹھیک ہے نا بیٹی؟“

”ہوں، بس درد بہت ہو رہا ہے اور ٹانگیں بھی سُن سی محسوس ہو رہی ہیں۔“  
 ”کمزوری ہے نا۔ چلو، میں دبا دیتی ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ کچھ پریشان سی تھی۔ آپریشن کے بعد سے بلیڈنگ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رُکی تھی۔ اور یہ بات اس نے سویڈ کو بتائی تھی۔

”میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں۔ تم ٹینشن مت لو۔“ اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ پھر روم سے باہر نکل گیا تھا۔ ڈاکٹر فرزین نے اس کی شکایت پر عبیرہ کا چیک اپ کیا تو ٹھٹک گئی۔

”سوری مسٹر سویڈ! ہمیں آپ کی وائف کا دوبارہ آپریشن کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر ناہید ذمہ داری سے اپنا فرض انجام نہیں دے سکیں۔ فوری چار بوتل خون کا انتظام کیجئے پلیز۔“ ڈاکٹر فرزین اس کے ایک قریبی دوست کی بھابی تھیں، تبھی انہوں نے وہ بات بتا دی تھی، جو عموماً انسانیت کے یہ میساج اپنی غلطیاں اور گناہ چھپانے کے لئے اپنی بے احتیاطی کا شکار ہونے والے مریضوں کو کبھی بتانے کا رسک مول نہیں لیتے۔ سویڈ کے چہرے کی ہوائیاں ایک مرتبہ پھر اڑی تھیں۔

آپریشن کے دوران ڈاکٹر ناہید نے ذرا سی لاپرواہی کے باعث غلط آنت کاٹ کر عبیرہ کی زندگی کو خطرے سے دوچار کر دیا تھا، جس کا پتہ انہیں تیسرے روز لگا تھا، جب عبیرہ کے آدھے جسم کا خون بہہ گیا تھا۔ راحیلہ بی، دل آویز جعفری کو سویڈ کی زندگی سے بے دخل کرنا چاہتی تھیں مگر کاتبِ تقدیر نے اس سے قبل ہی کہانی اپنی رضا سے ترتیب دے ڈالی تھی۔ سویڈ خون کا انتظام کر رہا تھا اور ادھر۔۔۔۔۔ دوبارہ آپریشن کے دوران عبیرہ زندگی کی بازی ہار گئی۔

ملک میں روزانہ ڈاکٹرز کی لاپرواہی کے باعث پیش آتے حادثات میں وہ بھی ایک معمولی سا حادثہ تھا جس سے کہیں کسی ملکی نظام میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اس ایک حادثے نے کسی ایک شخص سے اس کے زندہ رہنے کا مقصد ہی چھین لیا تھا۔ نہ کہیں کوئی آسمان پھٹا، نہ صدائے احتجاج بلند ہوئی اور سویڈ کی بیہ اپنے سارے ارمان دل میں لئے اسے اپنی محبت کی نشانی دے کر ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گئی۔ سویڈ کتنے ہی دنوں تک چوبیس گھنٹے کمرے میں بند پڑا روتا رہا تھا۔ ڈاکٹر ناہید کے خلاف اس نے ایف آئی آر کٹوا کر



اسے عبرت ناک سزا بھی دلوائی تھی مگر اس کے باوجود وہ دل جو پھٹ چکا تھا، دوبارہ کسی طور نہ سل سکا۔ راحیلہ بی اس اچانک حادثے سے الگ بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

ایسے میں دل آویز جعفری نے سوید آزر کے بیٹے کو سنبھالا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز، وہ نیم پاگل سی لڑکی، اس ننھے کو مل سے پھول کو روتے دیکھ کر تڑپ اُٹھی تھی۔ سوید اُس روز درد سے پھٹتے سر سے مجبور ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بیٹے کو اس کم گو سی لڑکی کی آغوش میں سکون سے سوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دل آویز نے ہلکی سی آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا، وہ سرخ آنکھوں اور بھگیے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ”آزر!“ اس کے لب ہلے تھے۔ سوید آزر کے اندر کوئی سسک اُٹھا۔ ”ہاں۔ میں آزر ہی ہوں۔ وہ آزر جو مر چکا ہے۔“ دل آویز اس کے قریب آئی تھی اور پھر بہت اپنائیت سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ”آؤ میں سلا دوں۔“ اس نے آفر کی تھی۔

سوید جو بے سکونی سے تنگ آچکا تھا، اس کی آفر پر آنسو پیتے ہوئے پلکیں موند گیا۔ عبیرہ کے بعد اس رات پہلی بار وہ بہت پُر سکون ہو کر سویا تھا۔ دل آویز کی آغوش کے لمس نے اسے ایک عجیب سے سرور سے متعارف کروایا تھا۔ جبکہ وہ چپ چاپ بے آواز دل ہی دل میں روتی رہی۔

☆...☆...☆

سوید آزر کی آنکھ گہری نیند سے کھلی تھی۔

اس کا دو سالہ بیٹا اس کے سینے سے لگا مزے کی نیند سو رہا تھا۔ مگر دل آویز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ وہ اُٹھا تھا اور بستر چھوڑ کر بیڈ روم سے ملحقہ ٹیرس کی جانب چلا آیا تھا، جہاں اس کی توقع کے عین مطابق سادہ سے کپڑوں میں ملبوس دل آویز جعفری خاموش کھڑی، ذرا سا سر اٹھائے اوپر آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھرتا آگے بڑھا اور چپکے سے اس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔

”دل آویز!“ بھرپور محبت کے ساتھ بہت قریب سے پکارا تھا اُس نے۔ وہ اُس کی پکار پر چونک کر پلٹی۔

”اب بھی اس ستارے کو رات میں اُٹھ اُٹھ کر تلاش کرتی ہو پاگل!“

”ن۔۔۔۔۔ نہیں۔“ وہ ذرا سی نروس ہوئی تھی۔ پھر سر جھکاتے ہوئے نم لہجے میں بولی۔ ”وہ ستارہ جسے دیکھنے کی میں عادی تھی، وہ تو کب کا ٹوٹ چکا۔“ پلک جھپکنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔ سوید آزر نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

”پھر یوں گہری نیند سے اُٹھ کر یہاں کسے تلاش کر رہی ہو؟“ اس کا لہجہ گمبھیر ہوا تھا۔ دل آویز اس کے مضبوط بازو پر سر ٹکا کر سکون سے پلکیں موند گئی۔

”ایک نئے ستارے کو آزر!۔۔۔۔۔ جس کی روشنی کے لئے اس ٹوٹے ہوئے ستارے نے قربانی دی تھی۔“ اس کے لہجے کی نمی سوید آزر کا دل جکڑ گئی تھی۔ اس نے ذرا سی گردن گھما کر ایک نظر سامنے لگے وال کلاک پر ڈالی، جہاں رات کے بارہ بجنے میں کچھ ہی سیکنڈز باقی تھے۔

”دل آویز۔“ اس بار اس کی پکار میں زیادہ محبت تھی۔ وہ آہستہ سے اس کے بازو سے سر اٹھا گئی۔

”ہوں۔“

”پیپی برتھ ڈے ٹو یو۔“ وہ چونکی تھی اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”آپ کو کیسے یاد رہا کہ آج۔۔۔۔۔“

”یاد رہتا نہیں اچھی لڑکی!۔۔۔۔۔ یاد رکھنا پڑتا ہے۔“

”اچھا تو پھر پچھلے سال یاد کیوں نہیں رکھا؟“ اس نے گلہ کیا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”پچھلے سال میں آزر کب تھا دل! پچھلے سال تو میں سوید تھا۔ عبیرہ کا سوید۔“

”ہوں۔ آپ مرد لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہیں۔ فقط چند دنوں میں اس لڑکی کو بھی بھول جاتے ہیں جو آپ کی خوشی کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے۔“ اس کا مقصد سوید کو ہرٹ کرنا نہیں تھا مگر۔۔۔۔۔ وہ ہرٹ ہو گیا تھا۔

”صحیح کہتی ہو تم۔ میں خود بھی سوچتا ہوں تو خود سے شرمندگی ہوتی ہے کہ میں اس کے بعد زندہ کیوں رہا۔ مر کیوں نہیں گیا اس کے ساتھ۔ مگر کیا

کروں کوئی خود کش حملہ، کوئی بم دھماکہ، کوئی کار ایکسیڈنٹ مجھے نکلتا ہی نہیں۔“ وہ اندر سے اب بھی زخمی تھا۔ دل آویز تڑپ کر رہ گئی۔

”ایم سوری آزر! میرا کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا۔ پچھلے دو سال میں جیسے ہم ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، جیسے ہم نے تقدیر کے لکھے پر صبر کرتے ہوئے ایک دوسرے کو سمجھا ہے، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ بہت ناز اٹھاتے ہیں پچھلے دو سال میں، میں نے آپ کے اپنا آزر سمجھ کر بہت خیال رکھا ہے آپ کا۔ اور آپ نے بنا مجھ پر اور میری دیوانگی پر ترس کھائے ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر، بے قصور، بے حساب تھپڑ مارے ہیں۔ دو سال لگ گئے مجھے اس حقیقت کا یقین کرنے میں کہ میں جسے اپنا آزر عباس سمجھ رہی ہوں۔ وہ آزر عباس نہیں ہے۔ وہ صرف سویڈ آزر ہے۔ عبیرہ کا سویڈ آزر۔ مجھے محبوب کے ساتھ ساتھ شوہر کا ساتھ بھی بٹا ہوا ہی ملا۔ اور اب جبکہ ہمیں ایک ہی دکھ میں جیتے ہوئے اڑھائی سال ہو گئے ہیں، میں یہ جان گئی ہوں ہمارے لئے اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دینا ممکن نہیں۔ لیکن اگر اسی ڈھب سے جینا نصیب ٹھہرا تو کیوں نارب کی رضا میں راضی ہو کر میں آپ کے لئے

آپ کی عبیرہ بن جاؤں اور آپ۔۔۔۔۔ آپ میرے لئے میرے آزر۔“ وہ سنجیدہ تھی۔ آزر نے سر بیڈ کی پٹی سے ٹکا دیا۔

”سو جاؤ دل آویز! مجھے نیند آرہی ہے۔“

”مگر مجھے نیند نہیں آرہی۔۔۔۔۔ پچھلے کئی سالوں سے۔“

اُس کی آواز پھر بھرائی تھی۔ سویڈ آزر خاموش لیٹا رہا۔

عبیرہ کی رحلت کے بعد اس لڑکی نے جیسے اس کی بکھری ذات کو سمیٹا تھا۔ وہ واقعی اس کا معترف تھا۔ اس نے نہ صرف سویڈ کی نفرت سہی تھی، بلکہ اس کے اور عبیرہ کے بیٹے کے لئے اپنا غم بھی بھول گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا پاگل پن بھی جاتا رہا تھا۔ آزر عباس کی ذات سے اس کی دیوانگی میں بھی کمی آتی گئی تھی۔ ہر دکھ، ہر حقیقت سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنی زندگی کا محور صرف ننھے سعد کو بنا لیا تھا۔ جو اس ماں کا بیٹا تھا، جسے اس لڑکی سے نفرت تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنی ذات کو پس پشت ڈالے، سگی ماں کی طرح اسے پال رہی تھی، لبوں پر خاموشی کا قفل لگائے، بنا کسی واہ واہ کی تمنا کئے اس نے راحیلہ بی جیسی پتھر عورت کا دل بھی جیت لیا تھا۔

پورے دو سال بعد سوید آزر کو اپنی زندگی میں اس کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ عبیرہ نے ہاسپٹل میں آپریشن سے پہلے جو چند باتیں اس سے کی تھیں، وہ باتیں اب اس کے اندر نئے احساسات کو جنم دے رہی تھیں۔ دل آویز جعفری نے اس سے پچھلے دو سال کے کسی لمحے کا حساب نہیں لیا تھا مگر۔۔۔۔۔ اب وہ خود کو تعلق نبھانے کے بجائے تعلق کو مضبوط بنانے کے لئے تیار کرتے ہوئے اپنا احتساب کر رہا تھا تو دل آویز نامی اس لڑکی کے بہت سے قرض اس پر واجب ہو رہے تھے۔

وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ جبکہ وہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹکی بہت اُداسی سے پلکیں موند گئی تھی!

☆...☆...☆

اگر یہ جان جاؤ تم، کوئی کیسے اُجڑتا ہے  
کوئی کیسے بکھرتا ہے

تو میرے پاس آنا تم، میری بنجر ہوئی آنکھوں میں

جلے خواب کو تنکنا، ان کا مرثیہ سننا

اگر ایسا ممکن نہیں تو میری زندگی کی ڈائری کو کھول کر پڑھنا کہ اس کے ہر ورق پر آنسوؤں سے بات لکھی ہے جو تم سے کہہ نہیں پائی، وہی ہر بات لکھی ہے تمہاری چاہتوں کے نام اپنی ذات لکھی ہے اگر یہ ڈائری پڑھ کر بھی تم انجان بنتے ہو تو اس کا ہے یہی مطلب

میری سب التجائیں بس ہواؤں میں معلق ہیں  
ابھی کچھ وقت باقی ہے، بدل جاؤ، پگھل جاؤ  
کہیں ایسا نہ ہو، یہ وقت ہاتھوں سے نکل جائے  
ہماری آرزوئیں اپنا رستہ ہی بدل جائیں

وہ کمرے میں نہیں تھی۔ مگر اُس کی ڈائری ضرور سوید کے ہاتھوں میں تھی، جس نے بیدار ہوتے ہی اسے اپنے کاموں میں اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ مومی کی ڈائری میں تحریر تازہ نظم بار بار پڑھنے کے بعد مبہم سا مسکراتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے آیا اور اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے لگا۔



”لیکن یہ ناشتہ۔۔۔۔۔۔“

”تم ابھی تیار نہیں ہوئیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ، میں۔۔۔۔۔“

”بس کوئی وضاحت نہیں۔“ وہ رُوٹھ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا تھا جب وہ پریشان سی پیچھے لپکی۔

”کیا کہا؟۔۔۔۔۔ پھر سے کہنا ذرا پلیز۔“

”مم۔۔۔۔۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“ گھبرا کر کہتی وہ فوراً کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

ہلکے پھلکے کام والے کپڑوں میں ہلکی پھلکی تیار ہو کر جس وقت سوید کی ہدایت پر وہ باہر گاڑی کی طرف آئی، سوید سیل فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔ دل آویز کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے فون آف کر دیا۔

”کس کا فون تھا؟“

”میری ایک دوست کا۔ بہت پسند کرتی ہے مجھے۔ سوچا چلو آج تم سے بھی ملوا  
ہی دوں۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ دل آویز کے لبوں کو چپ لگ  
گئی۔

”آؤ۔“ تقریباً بیس منٹ بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو سوید کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ مگر یہ کیا، گاڑی سے قدم باہر رکھتے ہی اس کا جسم جیسے پتھر ہو گیا تھا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ آزر عباس۔۔۔۔۔“

”ہوں، یہ اسی کا تاج محل ہے۔ وہ تاج محل، جس سے اس کے ہزاروں خواب جڑے تھے مگر بے رحم موت نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس خوابوں کے نگر کو تکمیل تک پہنچا سکتا۔ مجھے مریم نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ اسی سے یہ بھی پتہ چلا کہ یہ محل میری مومی کے نام ہے۔ اسی لئے صرف اور صرف تمہاری خوشی کی خاطر میں نے اس ادھوری عمارت کو آزر کی اُمنگوں اور خوابوں کے عین مطابق مکمل کروا لیا ہے اور اب۔۔۔۔۔ میری مومی گڑیا اسی محل میں رہے گی۔ کیوں، ہے نا شاندار گفٹ اور سرپرائز۔“ وہ مسرور تھا۔ مومی وہیں کھڑے کھڑے رو پڑی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو؟ ابھی کوئی پاس سے گزرے گا تو سمجھے گا، میں اتنی خوب صورت لڑکی کو کڈنیپ کر لایا ہوں۔ اندر چلو۔ پھر جو دل چاہے کر لینا۔“

وہ لپک کر پاس آیا تھا جبکہ اس کی بانہوں میں مقید اُس کا بیٹا بھی ہُمک کر مومی کی طرف آنا چاہ رہا تھا۔ وہ سوید سے بچے کو لے کر چپ چاپ اندر بڑھ آئی۔ تبھی وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا تھا۔

”کل ماں اور بابا بھی شہر آرہے ہیں اور آج۔۔۔۔۔ آج رات میں کسی بھی وقت عقیل انکل، آنٹی اور مریم کی آمد بھی متوقع ہے۔ سب یہیں آئیں گے تم سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے۔“

”مجھ سے دو دو ہاتھ۔۔۔۔۔ کیوں؟“ وہ بولی نہیں تھی مگر اُس نے اُجھن آمیز نگاہوں سے سوید کو دیکھا ضرور تھا، وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے رُک کر مسکرا دیا۔

”پچھلے دو سالوں میں میری سالگرہ پر تم نے مجھے سوائے ایک پیالی چائے کے اور کچھ بھی نہیں دیا ہے۔ ایک کیوٹ سی، پیاری سی بیٹی بھی نہیں دی تو دو دو ہاتھ کرنا تو فرض ہونا ان پر۔“ وہ اب پُرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مومی کا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔

ساتھ اس کی منتظر تھی اور اسے اس بار خوابوں کی اُن گلی تھام کر ان کے پیچھے چلنا تھا۔

☆ . . . ☆ . . . ☆

بن تیرے زندگی  
دائی راستوں اور موسموں کے ساتھ چلتی ہے  
اُداسی آسمانوں کی طرح بے انت ہوتی ہے  
دلوں میں پھیل جاتی ہے  
ہوا کے کینوس پہ درد کی تصویر بنتی ہے  
بچھڑنا ہی مقدر ہو

تو آنکھوں میں اُمڈتی بارشوں کو روک لیتے ہیں  
 سلگتی ریت کے بوسے عجب تسکین دیتے ہیں  
 لبوں پہ ذائقہ نمکین پانی کا  
 ہمیشہ یاد رہتا ہے

”چلو یہیں کھیک کاٹتے ہیں۔ پھر میں تم سے اپنی پسند کی ٹریٹ لوں گا۔ اس کے بعد پھر اپنے ہاتھوں سے وہ نیکلس پہناؤں گا، جو سعد کی پیدائش پر بڑی چاہ سے کسی اور کے لئے خریدا تھا اور پھر مہمانوں کو لینے ایئرپورٹ جائیں گے، پھر اس کے بعد۔۔۔۔۔۔“ مومی کا ہاتھ تھامے چہرہ اس کے قریب کئے وہ اسے اپنی پلاننگ بتا رہا تھا اور وہ کانپ رہی تھی۔ سر اٹھا کر سویڈ کی نگاہوں میں دیکھنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔

”سوید! مم۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔“ ذرا سی ہمت کرتے ہوئے اس کے لبوں  
نے ہلکی سی جنبش کرنے کی کوشش کی تھی جب سوید نے اپنا ہاتھ اس کے  
ہونٹوں پر رکھ دیا۔

”اب نہیں مومی!۔۔۔۔۔ کوئی ایکسکیوز، کوئی بہانہ نہیں۔“ وہ اپنا کنٹرول کھو رہا تھا۔ مومی گھبرا کر، سرسری سی ایک نگاہ اس پر ڈالتی، سر جھکا گئی کہ اب واقعی فرار کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ وہ تاج محل جہاں آزر عباس کے خواب دفن تھے، اسی تاج محل میں ایک نئی زندگی، اپنے نئے خوابوں کے

شب کے تقریباً پونے دو بج رہے تھے، جب اس نے تھکے تھکے سے نڈھال انداز میں اپنے گھر کے وسیع لاؤنج میں قدم رکھا۔ حسبِ توقع نگاہوں سے کچھ ہی فاصلے پر سر نیہوڑائے بیٹھی وہ یقیناً اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔

”آج۔۔۔۔۔ پھر بہت دیر کر دی آپ نے؟“

ہر روز کی طرح اس وقت بھی اس کے قدموں کی آہٹ پر، یمنی رحمن کی سماعتیں فوراً بیدار ہوئی تھیں۔ خمار آلود نگاہوں میں تفکرات کی گہری پرچھائیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر روز کی طرح اس وقت بھی وہ اس کی بے داری پر خفا ہوتے ہوئے اسے لتاڑ بیٹھا۔

”تو کیا کروں؟ سورج چھپتے ہی آکر تمہارے قدموں میں بیٹھ جایا کروں؟ کام کاج چھوڑ کر ہر وقت تمہاری اس منحوس صورت کو تکتا رہوں۔ اور کوئی کام نہیں ہے مجھے؟“

درشتی سے کہتے ہوئے کندھے پر پڑا کوٹ اس نے قریبی صوفے کی طرف اُچھال دیا تھا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر وہ تیزی سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا تو یمنی رحمن بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔

”کھانا گرم کروں آپ کے لئے؟“

یہ سوال اس کے معمولات میں شامل تھا۔ خواہ عون احمر جعفری کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہی ہوتا۔

”نہیں۔“ ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے اس نے یمنی رحمن کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

”اور چائے؟“

”چائے بھی پی کر آیا ہوں میں۔ آپ برائے مہربانی میرے لئے کوئی زحمت نہ کریں۔ ویسے بھی میں آل ریڈی بہت تھکا ہوا ہوں۔ جائیں جا کر اپنا کام کریں۔“

قطعی رُود لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی توجہ سامنے اسکرین پر موجود مختلف خوب صورت لڑکیوں پر مرکوز کر دی تو وہ لب بھینچ کر کچھ پل اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے کے بعد چپکے سے اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔



”جس سے پیار کرتے ہو، کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت اور آپ کا خیال رکھنے والی ہے؟ ایسا کیا ہے اس میں عون! جو آپ کو مجھ میں دکھائی نہیں دیتا؟“

بہت دھیمے لہجے میں اس نے استفسار کیا تھا۔ جواب میں ہمیشہ کی طرح وہ جیسے چُخ کر رہ گیا۔

”تم اس بات سے انجان نہیں ہو کہ میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔“  
انگارے چباتا لہجہ کسی نشتر کی طرح اسے اپنی روح میں اُترتا محسوس ہوا تھا۔  
مگر اس نے لب بھینچ کر سینے میں اودھم مچاتی ٹیسوں کو ضبط کر لیا۔  
”آپ مجھ سے صرف اس لئے نفرت کرتے ہیں نا کہ میں، آپ سے شدید محبت کرتی ہوں۔“

”میں“ پر زور دیتے ہوئے اس نے جانے کس ضبط سے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ مزید تلخ ہوتے ہوئے بولا۔

”تم سے نفرت کے لئے یہی وجہ کافی ہے کہ تمہاری وجہ سے میری پوری زندگی ڈسٹرب ہو کر رہ گئی ہے۔ ترس گیا ہوں میں دلی سکون اور ذہنی راحت کے لئے۔ صرف تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث آج میں اپنی محبت سے کوسوں دُور ہوں۔“

”زندگی میں انسان بہت سی چیزوں کی خواہش کرتا ہے۔ مگر وہ سب چیزیں اسے مل تو نہیں جاتیں عون! کچھ چیزوں کے لئے انسان کو ہمیشہ ترسنا پڑتا ہے۔“ اب بھی اس کا لہجہ بے حد دھیمہ تھا۔

”ہاں۔ مگر دانیہ خان کوئی چیز نہیں ہے میرے لئے۔ زندگی ہے وہ میری۔ میری ہر خوشی، ہر راحت، ہر خواب اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور یہ بات میں نے کبھی تم سے نہیں چھپائی۔ مگر اس کے باوجود تم نے جان بوجھ کر میری زندگی کو عذاب بنا ڈالا۔ اب گلہ کیسا محترمہ؟ یہ سب ہونا تو طے تھا۔ اب ترستی رہو ساری عمر میری محبت کے لئے۔“ تلخی سے کہتے ہوئے وہ اس کے پہلو سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”مانتی ہوں کہ میں نے آپ پر ظلم کیا ہے، مگر میری محبت بھی تو دیکھیں  
 عون! صرف ایک آپ کو پانے کے لئے کیا سے کیا ہو کر رہ گئی ہوں  
 میں۔“ اب کے اس کے لہجے میں نمی در آئی تھی۔ مگر عون احمر جعفری نے  
 اس کے نڈھال چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔

”تم مجھے کبھی نہیں پا سکتیں یعنی! اس بات کا اندازہ یقیناً بہت جلد تمہیں ہو  
 جائے گا۔ بہر حال اس وقت میں تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میرے  
 سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“

بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے گداز تکیے پر سر ٹکا کر پلکیں موند لیں تو  
 ناچار اسے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں واپس آنا پڑا۔ سرخ سرخ آنکھیں آنسو  
 لٹانے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ اعصاب کے ساتھ اب تو زندگی بھی جیسے اس  
 کے اندر تھکنے لگی تھی۔ ایک گہری سانس خنک فضاؤں کے سپرد کرتے ہوئے  
 اس نے شکستگی کے انداز میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آہستہ سے پلکیں  
 موند لیں۔

بھر کے ماہتاب سن

ہم بھی ہیں تیرے ہم سفر  
 ہم سے نہ اجتناب کر  
 جب بخت میں نہ چین ہو  
 کسی سے کیا گلہ کریں  
 راہ میں ان کو روک لیں  
 کیسے یہ حوصلہ کریں  
 ☆...☆...☆

عشق اگر حُسن کا محتاج ہوتا تو یقیناً وہ اس کے عشق میں اب تک اپنے حواس  
 گنوا چکا ہوتا۔ کیونکہ وہ حُسن و رعنائی میں بے مثال تھی۔ محبت اگر سلیقے، ہنر  
 مندی یا وفا سے مشروط

ہوتی تو اب تک شاید یعنی رحمن کی محبت اس کے دل میں اپنی جڑیں مضبوط  
 کر چکی ہوتی۔ کیونکہ یہ سب خوبیاں بھی بدرجہ اتم اس میں موجود تھیں۔ مگر  
 عون احمر جعفری کا عشق حُسن کا محتاج نہیں تھا۔ اس کی محبت سلیقے، ہنر مندی

یا وفا سے مشروط نہیں تھی۔ نتیجتاً اس کی زندگی میں آنے کے بعد یمنی رحمن کو سوائے آنسوؤں کی سوغات کے اور کچھ نہیں ملا تھا۔

تین سال ہو گئے تھے ان کی شادی کو مگر ان تین سالوں کے ایک ایک پل میں یمنی رحمن نے سوائے ذہنی اذیت اور دلی کرب کے اور کچھ بھی نہیں پایا تھا۔ تین سال سے وہ اپنے ملک، اپنے گھر والوں سے دور صرف اپنے محبوب شوہر کا دل جیتنے کی ضد میں کانٹوں پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ اجنبی دیس کی بے درد فضاؤں اور بے باک ماحول میں ہر پل اکیلی، سلگتے آنسوؤں کا زہر پی رہی تھی۔ زندگی اور تقدیر کی بے حسی سے مقابلہ کر رہ تھی۔ لیکن اب گزشتہ کچھ دنوں سے جانے کیوں یہ احساس اسے اندر ہی اندر تھکانے لگا تھا کہ وہ زندگی سے کبھی نہیں جیت سکتی۔

کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہونے کے باوجود، صرف ایک عام سے شخص کی محبت میں اس نے اپنا آپ روند ڈالا تھا۔ اپنی ہر خوشی، پسند، ضد، فرمائش، راحت کو خود اپنی ہی ذات کی تجوری میں رکھ کر لاک کر ڈالا تھا۔

عون احمر جعفری نامی اس شخص کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی

اپنی دسترس میں لے لینا اس کی زندگی کا واحد نصب العین بن چکا تھا۔ خواہ اس کامیابی کے لئے اسے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرنا پڑتی، کتنا ہی لہو لہان کیوں نہ ہونا پڑتا۔ وہ کسی قیمت پر بھی شکست کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں تھی۔

تیار ہوتی بھی کیسے؟ زندگی میں ہار کا ذائقہ اس نے کبھی چکھا ہی نہیں تھا۔ جس وقت، جس چیز کے لئے اس کا دل مچلا، اسی وقت وہ چیز اس کی دسترس میں آ جاتی تھی۔ نتیجتاً آج وہ خود سری کی انتہا پر تھی اور خود اپنی زندگی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

وسیع کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی نے تین بجے کا الارم بجایا تھا۔ تبھی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

”سنو یمنی!۔۔۔۔۔ جس سے پیار کرتی ہو، کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ مجھ سے زیادہ خیال رکھتا ہے تمہارا؟“ میران شاہ کی دھیمی مانوس آواز قریب سے اُبھری تھی۔ جواب میں وہ بری طرح چونک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی۔

”تم نے محبت کا دل دکھایا ہے یمنی! میں خدا سے دعا کرتا ہوں، محبت تمہارا دل کبھی نہ دکھائے۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔ تب ہی وہ ایک دم سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اُٹھی۔

”مجھے کسی کی نہیں، صرف تمہاری بد دعا لگی ہے میرا شاہ! صرف تمہاری آہ لگی ہے مجھے۔“ جو آنسو اس وقت اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، وہ آنسو میرا شاہ کی آنکھوں کے آنسو تھے۔ یہ وہ آنسو تھے، جنہیں وہ پچھلے تین سال سے نہایت بے دردی کے ساتھ اپنی آنکھوں سے در بدر کر رہی تھی۔ گو پچھلے تین سال سے بابا اور میرا شاہ سے اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا مگر پھر بھی وہ ہر پل اس کے ساتھ تھے۔ جب بھی کبھی وہ کرب کی شدت سے گھبرا کر رونے بیٹھتی تھی، میرا شاہ فوراً نم آنکھوں کے ساتھ چپکے سے اس کے پہلو میں آ بیٹھتا تھا۔

”رو کیوں رہی ہو یمنی؟۔۔۔۔۔ جانتی ہو نا، میرا شاہ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“

”ہاں، جانتی ہوں میں کہ تم میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے میرا! تبھی تو تم سے اتنی دُور چلی آئی۔ کیونکہ یہ آنسو میں نے خود اپنے لئے خریدے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ وقت بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اب اگر وہ یاد نہ بھی کرتی، تب بھی اسے یاد رہتا تھا کہ اس نے کس دیوانگی کے ساتھ ”عون احمر جعفری“ کو چاہا تھا۔ حالانکہ عون احمر جعفری کو دیکھنے سے قبل وہ سرے سے محبت کے وجود کو ماننے سے انکاری تھی۔

میرا شاہ، جو اس کا فرسٹ چچا زاد کزن، منیگر اور سب سے قریبی دوست تھا، اس کی رفاقت بھی کبھی یمنی رحمن کے دل کے تاروں کو منتشر نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ دونوں میں انڈر اسینڈنگ تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ کبھی میرا شاہ کو محبوب کی حیثیت سے تسلیم نہیں کر سکی تھی۔

بچپن سے لے کر جوانی تک، وہ عجیب عادتوں کی مالک رہی تھی۔

قدرتی طور پر اس کی شخصیت میں شدت پسندی کا عنصر غالب رہا تھا۔ کبھی معمولی سی تکلیف پر رو رو کر آنکھیں سرخ کر لیتی تو کبھی لہو لہان ہو کر بھی لب سے ”سی“ نہیں نکالتی تھی۔ جو چیز دل کو بھا جاتی، پھر اسے پانے کے لئے



خواہ اسے آگ کے دریا میں ہی کیوں نہ کودنا پڑتا، وہ پیچھے ہٹ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ حد درجہ حساس، حد درجہ خود سر، حد درجہ ضدی۔۔۔۔۔ یہ تھی اس کی شخصیت۔

رحمن صاحب اپنی اکلوتی لخت جگر کی ان حرکتوں کے باعث خاصے پریشان رہا کرتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ یمنی کے وجود میں ان کی جان تھی۔ حقیقت میں عائشہ بیگم کی وفات کے بعد ان ہی کے بے جا لاڈ پیار نے یمنی رحمن کے مزاج ساتویں آسمان پر پہنچا دیئے تھے۔ وہ اتنی توجہ و اہمیت پر خود کو عام انسانوں سے ماورا سمجھنے لگی تھی۔ ان لوگوں میں شامل ہو گئی تھی جو ایک پل کے لئے بھی نظر انداز ہونا گوارا نہیں کرتے۔ اس کی اسی عادت کے باعث میران شاہ نے بھی اس سے ہٹ کر کسی اور لڑکی کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی غیر دانستہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔

تین سال قبل ہی وہ لوگ ایک طویل عرصہ شارجہ میں رہنے کے بعد پاکستان واپس لوٹے تھے۔ میران شاہ کو رحمن صاحب کی طرح اپنی مٹی سے بہت لگاؤ

تھا۔ مگر یمنی رحمن پاکستانی کلچر کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ لہذا وہ پاکستان آ کر کچھ خاص خوش نہیں تھی۔ مزید یہاں آ کر نئے گھر اور نئے آفس کی سیٹنگ کی مصروفیات نے میران شاہ کو اس قدر بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ شدید بے زار رہنے لگی تھی۔ اس روز بھی ان دونوں کے مابین غالباً ایسا ہی کوئی جھگڑا ہوا تھا۔

☆...☆...☆

کل شام میران نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے آفس سے واپسی کے بعد ڈنر کے لئے لے جائے گا۔ ساتھ میں آفس کریم اور لانگ ڈرائیونگ کے دوران پورا شہر گھمانے کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ لہذا یمنی نے خوب دل لگا کر تیاری کی۔ مگر آفس میں مصروفیات کے باعث رات بہت دیر سے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اوپر سے اس نے اپنا موبائل بھی مسلسل آف کر رکھا تھا۔ نتیجتاً یمنی کا موڈ آف ہونا یقینی بات تھی۔

شدید ناراضگی کے اظہار کے طور پر اس نے خود کو کمرے میں مقید کر کے اگلی صبح کا ناشتہ بھی گول کر دیا تھا۔ تب مجبوراً میران شاہ کو اس کا موڈ بحال

کرنے کے لئے آفس سے چھٹی کرنا پڑی۔ کیونکہ یمنی کی ناراضگی اور آنسو، یہ دونوں چیزیں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ صبح کے تقریباً دس بج رہے تھے جب وہ اس کی ناراضگی کو دور کرنے کے لئے معذرتی الفاظ سوچتا اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ نظروں سے کچھ ہی فاصلے پر گداز بستر میں وہ میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ دراز پلوں کے ساتھ، گالوں پر بے دردی سے بہائے گئے آنسوؤں کے نشانات رقم تھے۔ ایک پل کے لئے میران کو اپنی غفلت پر افسوس ہوا۔ اگلے ہی پل وہ فریج کی طرف بڑھا اور اس میں سے ٹھنڈے بیج پانی کی بوتل نکال کر بے خبر سوئی یمنی حرمین پر انڈیل دی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سرخ سرخ سی، خمار آلود نگاہیں جو نہی بیڈ کے قریب کھڑے میران شاہ کے مسکراتے چہرے کی طرف اٹھیں وہ تپ کر رہ گئی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے مانی؟۔۔۔۔۔۔ اور کسی کو نیند سے جگانے کا یہ کون سا مہذب طریقہ ہے؟“ ترش لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے چہرے کا رخ پھیر لیا تو ایک دھیمی سی مسکراہٹ میران شاہ کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ کان پکڑ کر سوری کرتے ہوئے بولا۔

”معاف کر دو نا یار!۔۔۔۔۔۔ اصل میں رات کچھ دوستوں کے ساتھ نئے پراجیکٹ کے سلسلے میں ایک بلڈنگ کی لوکیشن دیکھنے چلا گیا تھا۔ موبائل تو آن تھا، مگر وہاں سگنل سسٹم کام نہیں کر رہا تھا۔ سروس نہ ہونے کے باعث تم سے رابطہ نہ ہو سکا۔ یقین مانو، مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ میں نے تمہیں لانگ ڈرائیونگ کے ساتھ ڈنر کے لئے بھی لے جانا ہے۔“

”ہاں، باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔“

میران شاہ کی وضاحت پر سارا غصہ پل میں رفع ہو گیا تھا۔ مگر آنکھوں میں اب بھی ہلکی سی خفگی کی جھلک بخوبی دیکھی جا سکتی تھی۔

”پاگل۔۔۔۔۔۔ اور پاگل بنانا تم سے۔۔۔۔۔۔“ اب کے اس کی چھوٹی سی ناک دباتے ہوئے اس نے سکون کا سانس لیا۔

”اوکے، لیکن کل چونکہ تمہاری وجہ سے میرے اتنے قیمتی آنسو ضائع ہوئے، لہذا تمہیں فائن تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ اور تمہارا فائن یہ ہے کہ تم آج مجھے

دوپہر میں لنچ کے ساتھ ساتھ ڈھیر ساری شاپنگ بھی کراؤ گے۔ اور رات میں  
ڈنر اور پورا شہر دکھاؤ گے۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اوکے!“

☆...☆...☆

وہ اکیلی گاڑی لے کر وسیع سڑکوں پر نکل کھڑی ہوئی۔ وہ ریش ڈرائیونگ  
کرتے ہوئے گھر واپس پلٹ رہی تھی، جب اچانک سامنے سے آتی ہوئی  
میرون سوک سے بری طرح ٹکرا گئی۔

پل دو پل کے لئے آنکھوں کے سامنے جیسے تارے جھلملا گئے تھے۔ سر  
اسٹیرنگ سے ٹکرانے کے باعث یقیناً زخمی ہو گیا تھا۔ نچلا ہونٹ بھی دانتوں  
تلی آکر کچلا جا چکا تھا۔ صد شکر کہ سامنے والے نے فوراً ہوشیاری سے کام لیتے  
ہوئے گاڑی کا رخ سڑک کی سائیڈ پر کچے راستے کی جانب موڑ دیا تھا، وگرنہ  
آج یمنی کا جلال نہ جانے کیا قیامت لاتا۔

میرون سوک میں بیٹھا خوب صورت سا اجنبی نوجوان تین چار جھٹکے کھانے کے  
بعد بمشکل گاڑی پر کنٹرول حاصل کر پایا تو غصے سے سرخ یمنی رحمن اپنی

تکلیف کو پس پشت ڈال کر فوراً تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس کے سر پر  
جا پہنچی۔

”او مسٹر ایکس، وائی، زیڈ! آپ کیا نشے میں گاڑی چلا رہے ہیں یا گھر سے نکلتے  
وقت آنکھیں ساتھ لانا بھول گئے ہیں جو سڑکوں پر چلتی پھرتی اتنی بڑی بڑی  
گاڑیاں آپ کو دکھائی نہیں دے رہیں؟“

ہر ایرے غیرے پر اپنا رعب جمانے کی لت پڑ چکی تھی۔ تبھی سوک میں بیٹھے  
اس نوجوان کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی تو اجنبی نوجوان نے  
بھی اسے منہ توڑ جواب دینے میں قطعی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

”محترمہ! میرے خیال سے آپ نے کسی کے ساتھ ریس لگا رکھی تھی۔ یا پھر مجھ  
غریب کے ساتھ کوئی دیرینہ دشمنی نکالتے ہوئے صاف پھانسی پر چڑھ جانے کا  
ارادہ تھا آپ کا۔“

”شٹ اپ! صرف آپ کی وجہ سے مجھے اتنی چوٹیں آئی ہیں۔ اور گاڑی کا  
نقصان الگ ہو گیا۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟“ نوجوان کے سرد لہجے پر  
تپتے ہوئے وہ اس کی بات کاٹ کر بولی تو وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گیا۔

”کمال ہے۔ خود کشی کی دانستہ کوشش آپ کر رہی تھیں اور الزام میرے سر ڈال رہی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہو گئی کہ الٹا چور کو توال کو ڈانٹے۔ ویسے میرے خیال سے سوسائٹیڈ کرنے کا یہ طریقہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

گداز گلابی لبوں پر آنے والی مسکراہٹ اس کا خون جلا رہی تھی۔ تبھی وہ ایک زبردست ٹھوکر اس کی گاڑی کو رسید کر کے خاصے سلگتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”سوسائٹیڈ کریں میرے دشمن۔ خوب جانتی ہوں میں، آپ جیسے مردوں کو۔ راہ چلتی خوب صورت لڑکیوں کے منہ لگنے کا تو بہانہ چاہئے آپ کو۔“

”اللہ رے خوش فہمی! مائنڈیو میڈم! میں آپ جیسی لڑکیوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔“ وہ بھی شاید اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ ذرا جو اس کے جلال سے مرعوب ہوا ہو۔

”بس، بس۔۔۔۔ دیکھتے ہیں بہت آپ جیسے۔ ہونہہ!“

تیوری چڑھا کر رخ پھیرتے ہوئے وہ دھیمے سے بڑبڑائی تھی جب وہ اجنبی نوجوان سرعت سے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

”ایکسیکوز می میڈم! خاکسار کو عون احمر جعفری کہتے ہیں۔ حال ہی میں ایم بی بی ایس اور ایم پی پی ایس کی شاندار ڈگری لے کر وطن واپس لوٹا ہوں۔ یقیناً آپ نے بہت سے ڈیشننگ مرد دیکھے ہوں گے۔ مگر مائنڈیو میم! ان میں کوئی بھی عون احمر جعفری نہیں ہو گا۔ کیونکہ میں آپ جیسی نک چڑھی لڑکیوں کو سیدھا کرنے کا فن بخوبی جانتا ہوں۔“

”شٹ اپ! ڈاکٹری کی شاندار ڈگریاں لے کر بھی آپ کو عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں آتی۔“

”عورت کا احترام کرنا میں بخوبی جانتا ہوں۔ مگر معذرت کے ساتھ، آپ جیسی عورت کے ساتھ بات کرنے کے لئے مجھے ایسا ہی لہجہ اپنانا پڑتا ہے۔“

دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ اب عین اس کے مقابل کھڑا تھا۔



”واٹ۔۔۔۔۔ مجھ جیسی کیا؟۔۔۔۔۔ آپ کو جرأت کیسے ہوئی مجھ سے یہ بات کہنے کی؟“ یمنی کے تو گویا تلوؤں سے لگی، سر پر بجھی۔

”آپ خوا مخواہ بات کو بڑھا کر اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کر رہی ہیں میڈم! مہربانی فرما کر یہ فضول کی بک بک بند کریں اور اپنا راستہ ناپیں۔ بصورت دیگر میں آپ جیسی لڑکیوں سے نمٹنا بخوبی جانتا ہوں۔“

بہت معمولی سا تناؤ آیا تھا اس کے چہرے پر۔ شاید وہ فضول کی اس بک بک سے اُکتا گیا تھا۔ سدا کی ایموشنل یمنی رَحْمَن کی آنکھوں میں اس وقت جیسے خون اُتر آیا۔

”یُو اسٹوپ۔۔۔۔۔ کیا آپ جیسی، آپ جیسی کی رٹ لگا رکھی ہے آپ نے؟۔۔۔۔۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، جن عورتوں پر محض آپ کے ناموں کی مہر لگی ہے، وہی پاک دامن ہیں، باقی ہر عورت آپ کے لئے کوئی چلتا پھرتا ایڈ ہے۔ جسے آپ دیکھیں، چھیڑیں اور لطف اُٹھائیں۔ مسٹر عون احمر جعفری صاحب! آپ مردوں کی غیرت کی کہانی محض اتنی سی ہے کہ آپ لوگ صرف اس عورت کے لئے مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں جس کی ذات پر کسی نہ کسی

حوالے سے آپ کے تعلق کا لیبل لگا ہوتا ہے۔ مگر ایسی ہی دوسری پرانی عورت کے متعلق نہایت پست انداز میں سوچتے ہوئے آپ خاصا لطف محسوس کرتے ہیں۔ وجہ محض اتنی سی ہے کہ آپ کے اندر کی انسانیت بے موت مر گئی ہے۔“

کوئی اس وقت اس کے تنفر سے پُر لہجے کو محسوس کرتا، اس کے چہرے پر بکھری سرخی کو دیکھتا، آنکھوں سے چھلکتے غصے کو دیکھتا تو بخوبی جان لیتا کہ وہ کس حد تک ایموشنل لڑکی ہے۔

”ایکسیکوزمی میڈم! آپ ضرورت سے زیادہ ایموشنل ہو رہی ہیں۔ محض آپ کے اندھا دھند گاڑی چلانے کی وجہ سے دیکھتے میری گاڑی کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ اوپر سے میں اپنے باپ کا بے چارہ اکلوتا بیٹا، میں ہزاروں لوگوں کا مسیحا، ذرا سوچئے آپ کی اس ذرا سی حماقت کی وجہ سے اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو آپ کا کیا بنتا؟ میرے ڈیڈی تو بدلہ لئے بغیر ہرگز آپ کو معاف نہیں کرتے۔“ ارد گرد سے گزرتے لوگ اب قدرے مشکوک ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ تبھی وہ کن آنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مصاحبتی لہجے میں بولا تو یمنی بھی

اکڑے تیوروں کے ساتھ گھورنے کے بعد سر جھٹکتی، جلتی کڑھتی واپسی کے لئے پلٹ گئی تو اس کی صدا سنی۔

”ایکسیوز می میڈم! آپ پسند کریں تو میں آپ کو، آپ کے گھر ڈراپ کر سکتا ہوں۔“

مگر یمنی نے اس کی آفر پر کان نہیں دھرے۔

عون احمر جعفری سے اس کی دوسری ملاقات تقریباً تین ماہ بعد دوبارہ اسی روڈ پر ہوئی تھی، جس روڈ پر تین ماہ قبل ان کا ایکسیڈنٹ ہو چکا تھا۔

☆...☆...☆

اس روز موسم بہت خوب صورت تھا۔ پاپا اپنے آفس میں مصروف تھے۔ جب کہ میران شاہ بزنس ٹور کے سلسلے میں آسٹریلیا جا رہا تھا۔ میران شاہ کی فرمائش پر وہ اسے ڈراپ کر کے آئی تو دل بے ساختہ اپنی نئی فرینڈ معطر آفندی سے ملنے کو مچل اٹھا۔

معطر آفندی سے اس کی پہلی ملاقات ڈھائی ماہ قبل ایک بک شاپ میں ہوئی تھی۔ دونوں کو اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ایک ہی کتاب درکار تھی۔ اور

اتفاق سے اس وقت اس شاپ میں بہت تلاش کے بعد وہ کتاب ایک ہی دستیاب ہو سکی تھی۔ لہذا یمنی تو کسی صورت اس کتاب سے دستبردار ہو کر مزید خوار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ جب کہ معطر آفندی کو

بھی اپنی فرینڈ کے برتھ ڈے گفٹ کے لئے اس سے بہتر تحفہ کوئی نہیں لگ رہا تھا۔ لہذا دونوں میں تھوڑی دیر معمولی سی تکرار ہوئی، بالآخر معطر نے وہ کتاب خود خرید کر خاصے دوستانہ انداز میں یمنی رحمن کے سپرد کر دی۔ یہی پہلی ملاقات ان دونوں کی دوستی کا باعث بنی تھی۔ جس کے بعد ملنے ملانے اور فون کالز کرنے کا سلسلہ خود بخود شروع ہو گیا تھا۔ اس روز یمنی کے پاس اپنی گاڑی نہ ہونے کے باعث معطر نے اسے اپنی گاڑی میں خود اس کے گھر ڈراپ کیا تھا بعد ازاں یمنی بھی کئی بار اس کے گھر جا چکی تھی۔ چند ہی دنوں میں دونوں ایک دوسرے کے خاصی قریب آ چکی تھیں۔

اس روز بھی یمنی کا ارادہ کچھ ایسا ہی تھا۔ نیلے آسمان پہ چھائے کالے بادل اور رم جھم برستی بارش کی ننھی ننھی پھواریں اس کے اعصاب پر خاصا خوشگوار اثر ڈال رہی تھیں، جب اچانک ایک دم سے سامنے سے آتے ایک ٹرک کو سائیڈ

دیتے ہوئے جو نہی اس نے اپنی گاڑی کا رخ سڑک کے بائیں جانب کچے راستے کی طرف کیا، جانے کہاں سے نکل کر بھیڑوں کے پیچھے بھاگتا ایک چھوٹا سا بچہ اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ تب بدحواسی کے عالم میں اس نے اس ممکنہ حادثے سے بچنے کی پوری کوشش کی مگر بچہ اس کی گاڑی سے ٹکرا کر زمین پر گر چکا تھا۔ جب کہ کچھ ہی فاصلے پر لگے درخت سے ٹکرا کر گاڑی بھی حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ایک جم غفیر وہاں جمع ہو چکا تھا۔ سب یمنی رحمن کی لاپرواہی کو نشانہ بنا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو باقاعدہ اسے پولیس کیس قرار دیتے ہوئے یمنی کو پولیس حراست میں دینے کی تجویز پیش کر دی تھی۔ جس کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ جب کہ نیچے زمین پر پڑا بچہ فوری امداد کے لئے تڑپ رہا تھا۔

سہمی سہمی سی یمنی رحمن نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی ایسا خطرناک سانحہ نہیں دیکھا تھا۔ لہذا لوگوں کے گھیراؤ میں کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔ پولیس کے نام سے ہی اس کا خون

خشک ہو رہا تھا۔ ٹانگیں مزید بوجھ سہارنے سے قاصر دکھائی دے رہی تھیں۔ موبائل کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں گر گیا تھا۔ جب کہ مشکل کی اس گھڑی میں کسی بھی طریقے سے میران شاہ کو پکارنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

ہر طرف اجنبی لوگ تھے اور ان کے روح فگار جملے۔۔۔ عجیب بے بسی کی کیفیت تھی۔

اس سے قبل کہ وہ رو پڑتی، خدا نے عون احمر جعفری کو رحمت کا فرشتہ بنا کر وہاں بھیج دیا تھا۔ گو عون نے وہاں جمع لوگوں کی وجہ سے محض سرسری انداز میں واقعہ کی تحقیقات کے لئے اپنی گاڑی روکی تھی، تاہم اصل صورت حال جاننے کے بعد وہ سرعت سے نکل کر سڑک پر بے یار و مددگار پڑے بچے کی طرف لپکا۔

بچے کی پیشانی سے بہتا خون شدید خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اسے فوری ٹریٹ منٹ دے کر گاڑی میں لٹانے کے بعد اس نے اپنی توجہ لوگوں کے بیچ سر جھکائے کھڑی یمنی رحمن کی جانب مبذول کی تھی۔ ہوائیاں اڑاتے چہرے کے

عون کے سرد لہجے پر اس نے فوراً سے پیشتر اپنے آنسو رگڑ ڈالے تھے۔

”میں گاڑی چلانا بخوبی جانتی ہوں۔ مم۔۔۔۔۔ مگر اچانک بریک فیل ہو گئے تھے۔“ نم پلکوں کی جھال سے سچی، بلوریں نگاہیں باقاعدہ اس کی آنکھوں میں ڈال کر اس

نے وضاحت پیش کی تھی۔ جب وہ دھیمے سے سر جھٹک کر ذرا سا رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

”آج گاڑی اور اُس روز غالباً آپ کے دماغ اور زبان کا بریک فیل ہو گیا تھا۔ ہے نا؟“

”آئی ایم سوری فار دیٹ۔“

پلیکیں جھپک کر قدرے شرمندہ لہجے میں اس نے کہا تو وہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر گہری سانس فضا کے سپرد کر گیا۔

”پتہ نہیں، کیا چیز ہیں آپ؟ لڑکیوں کو غیر ذمہ دارانہ عادات بالکل سوٹ نہیں کرتیں۔“

ساتھ متفکر کھڑی وہ اسے اس یمنی رحمن سے بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی کہ جس سے ابھی تین ماہ قبل اس کی خاصی ناخوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خود اس وقت زخمی تھی مگر زخموں کی تکلیف سے زیادہ رسوائی کا خوف اس پر غالب آ رہا تھا۔ تبھی عون احمر جعفری نے وہاں موجود لوگوں سے اپنا تعارف کروا کے بچے کی ذمہ داری خود پر ڈالی اور یمنی رحمن کو اپنی ایک عزیزہ کی حیثیت سے متعارف کروا کے لوگوں کی بھیڑ سے نکال لایا۔ یمنی تو اُس کے اس اقدام پر ٹکر ٹکر اُس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ جب کہ وہ بڑے آرام سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ آیا۔

بچے کو ہسپتال میں داخل کر کے وہ فارغ ہوا تو اس کی توجہ یمنی پر گئی۔

یمنی کی آنکھیں اب آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔ چہرے اور جسم پر لگے زخموں کی تکلیف کا احساس بھی جاگ اُٹھا تھا۔ تبھی وہ ایک دم سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”اب رو کیوں رہی ہیں؟ جب ڈرائیونگ کرنا آتی ہی نہیں تو گاڑی لے کر گھر سے نکلنا سراسر حماقت کے سوا اور کیا ہے؟“



اس روز کی نسبت آج اس کا لہجہ خاصا سخت تھا۔ یمنی چپ چاپ آنسو بہانے میں مصروف رہی۔

”شکر کریں خدا کا کہ بچے کو زیادہ خطرناک چوٹ نہیں لگی۔ وگرنہ اس معصوم کی جان تو جاتی ہی، ساتھ ہی آپ کو سزائے موت کی بھینٹ چڑھنے سے بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔“

آج اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر وہ دل کا غبار نکالنا چاہ رہا تھا۔ پھر دفعۃً نگاہ اس کی پیشانی پر جمے خون، پھٹے ہونٹ او چہرے پر لگی جابجا خراشوں کی طرف اٹھی تو مزید ”گل فشانوں“ سے احتراز برت کر فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لیا۔

موسم کے تیور گزرتے ہر پل کے ساتھ بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندوں نے اب تیز بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ قوی امکان تھا کہ اگلے کچھ لمحوں میں تیز جھکڑ بھی چلنا شروع ہو جاتے۔ خراب موسم کے باعث دن کے اُجالے تیزی سے رات کی تاریکیوں کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔

”آپ کے چہرے پر کافی زخم لگے ہیں۔ لایسے، میں ڈرینگ کر دیتا ہوں۔“

جو نہی اس نے اپنی توجہ آنسو بہاتی یمنی رحمن کی جانب مبذول کی، وہ ایک دم سے بوکھلا کر رہ گئی۔

”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ جلدی سے مجھے گھر پہنچا دیجئے پلیز۔“

”گھر کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ ویسے بھی اس حال میں گھر جائیں گی تو گھر والے زیادہ پریشان ہوں گے۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے یمنی کی پیشانی پر لگا زخم کاٹن سے صاف کرنا شروع کر دیا تو وہ مزید احتجاج نہ کر سکی۔

”اتنے خراب موسم میں بھلا گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو؟“ اس کی پیشانی کی ڈرینگ کرتے ہوئے اس نے پھر ڈپٹا تھا۔

”جب میں گھر سے نکلی تھی تو موسم اتنا خراب نہیں تھا۔“

ساری بولڈنیس، تیزی، طراری اس پل جیسے ہوا ہو کر رہ گئی تھی۔

”تھینکس۔ آج آپ کی وجہ سے میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ گئی۔ پتہ نہیں آج اگر آپ یہاں میری مدد کے لئے نہیں آتے تو

میرے ساتھ کیا ہوتا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کے حالات کا سامنا نہیں کیا۔“

رحمن صاحب سے بات کرنے کے بعد اس کا اعتماد خاصا بحال ہو چکا تھا۔ تبھی عون کو موبائل واپس کرتے ہوئے وہ متانت سے بولی تو وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔

”اُس اوکے۔ لیکن آپ سے ہمدردی کرنے کی پاداش میں اس وقت جو نقصان مجھے ہوا ہے، آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“ اس کے تصور میں اس وقت دانیہ خان کا غصے سے سرخ چہرہ گھوم رہا تھا، جسے وہ قریبی ریسٹورنٹ میں چائے پینے کی دعوت دے کر آیا تھا۔ اور اب یقیناً وہ وہاں اکیلی بیٹھی اس کے انتظار میں گڑھ رہی تھی۔ مگر یمنی رحمن کو اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا۔ لہذا وہ ذرا سا چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھی نہیں۔“

”آپ سمجھ بھی کیسے سکتی ہیں محترمہ!۔۔۔۔۔ یہ پیار محبت کی کہانیاں بھلا سب کی سمجھ میں کہاں آتی ہیں؟“

”آئیں، آپ کو چھوڑ آؤں۔“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

عون کی مکمل توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ وہ اس کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے الفاظ پر ٹھٹک گئی تھی۔

”میرا شام سلونا شاہ پیا

سانوں مار گئی تیری چاہ پیا“

اپنی ہی رو میں گم وہ گنگنا رہا تھا اور ادھر یمنی رحمن حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے الجھ رہی تھی۔

’عون یہ سب کس کے لئے کہہ رہا ہے؟ کہیں۔۔۔۔۔ کہیں یہ بھی تو میرے ملکوتی حُسن سے انسپائر نہیں ہو گیا؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ تبھی تو اس نے مجھے عزیزہ کہا۔ بچے کی ساری ذمہ داری خود پر ڈالی۔ کوئی یونہی تو کسی کے لئے اتنا نہیں کرتا۔ ہاں! ضرور میرے حُسن نے اس خوبرو سے شخص پر بھی اپنا سحر پھونک دیا ہے۔‘

نگاہیں مسلسل اس کے خوبصورت چہرے پر مرکوز کئے وہ سوچ رہی تھی جب اس نے پھر سے اسے مخاطب کر ڈالا۔

”آپ کی گاڑی کا خاصا نقصان ہو چکا ہے۔ میں اپنے ڈرائیور سے بات کر لوں گا۔ وہ آپ کی گاڑی کو ایک دو روز میں ٹھیک کروا کے آپ کے گھر پہنچا دے گا۔ تاہم گاڑی میں اگر آپ کا کوئی سامان نہ ہو تو سیدھے گھر چلیں۔“

”میرا پرس اور موبائل گاڑی میں رہ گیا ہے۔“

”اوکے۔“ یمینی کی نشاندہی پر دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گاڑی کو ریورس کیا تھا۔ جب کہ بارش کی شدت میں تاحال کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

عون احمر جعفری نے گاڑی کو بیک کر کے عین اسی جگہ روک دیا تھا کہ جہاں درخت سے ٹکرانے کے بعد یمینی کی کار خود بخود رک گئی تھی۔ وہ عون کی گاڑی سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تو تیز بارش کے موٹے موٹے قطروں نے لمحے میں اسے اچھا خاصا بھگو ڈالا۔ اوپر سے بجلی کی خوفناک کڑک۔۔۔۔۔

یمینی تو اس موسم میں اپنے بستر سے ایک پل کے لئے بھی باہر نہیں نکلتی تھی۔ کجا کہ یوں سڑکوں پر اجنبی لوگوں کے ساتھ خوار ہونا۔

گاڑی کی لائٹس چونکہ فیوز ہو چکی تھیں، لہذا اسے اندر اپنا پرس تو آسانی سے سیٹ پر پڑا مل گیا مگر موبائل کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ اسی تگ و دو میں مصروف وہ مایوس ہو کر جو نہی اپنی گاڑی سے باہر نکلی، ایک دم سے آسمانی بجلی کی تیز لائٹ اس پر پڑی اور حلق کے بل چلاتے ہوئے عون کی طرف دوڑی جو ابھی اس کی پر اہلم جاننے کے لئے اپنی گاڑی سے باہر نکلا تھا۔ مگر اب وہ اس کے بازو سے ٹیک لگاتے کھڑی سوکھے پتے کی مانند تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ بھی ٹھٹک گیا تھا۔ لرزتا کانپتا نازک وجود، طوفانی موسم میں ایک امتحان ہی ثابت ہوا تھا اس کے لئے۔ مگر اس نے اس امتحان میں اپنے کردار کی مضبوطی کو ڈولنے نہیں دیا۔ تب ہی بازو سے تھام کر آہستگی سے خود کو علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔

”کم آن پلیز۔۔۔۔۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ آپ گاڑی میں بیٹھئے، میں آپ کا سامان دیکھتا ہوں۔“ یمینی رحمن کے دھڑ دھڑ کرتے دل کا شور اسے

اب بھی اپنی سماعتوں میں اُترتا محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے سرعت سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس احساس کو جھٹک دیا۔ پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس کا موبائل ڈھونڈ کر گاڑی کو لاک کرتے ہوئے خود بھی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

”میرا خیال ہے اس وقت آپ کو گھر پہنچنا چاہئے۔ بچے کی پرابلم میں سنبھال لوں گا۔“ سرسری سی ایک نگاہ اس کے بے حال سراپے پر ڈالتے ہوئے اس نے کہا تو یمنی کی آنکھیں مزید تشکر سے بھر آئیں۔

”تھینک یو سو مچ۔ میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”احسان کیسا محترمہ! مشکل میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ بہر حال اس سفر کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“ اس وقت عون احمر جعفری کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ چونک کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر مختصر سی ڈرائیونگ کے بعد جب اس نے ”رحمن کاٹیج“ سامنے اپنی گاڑی روکی تو یمنی کا دل بے ساختہ ہی اس سے ہچکھڑنے کے احساس پر اداس ہوا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اس جیسی پتھر دل، بے حس، خود سر لڑکی فقط چند گھنٹوں میں کسی سے اتنی متاثر ہو

گئی تھی کہ اب وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا تو اس کا دل پھر کبھی نہ ملنے کے احساس سے مچل رہا تھا۔

”اوکے میم! زندگی رہی تو پھر کہیں کسی موڑ پر دوبارہ ملیں گے۔ اپنا خیال رکھتے گا پلیز۔ خدا حافظ!“ جگمگاتی روشن نگاہوں والا وہ خوب صورت سا شخص نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ جبکہ وہ کتنی ہی دیر وہیں کھڑی بارش میں بھیگتی رہی تھی۔

☆...☆...☆

اگلے روز میران شاہ آسٹریلیا سے واپس آیا تو اسے از حد مضطرب و اداس دیکھ کر جیسے کھل اُٹھا۔

”تم آگئے مانی!“ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

”ہاں۔ لیکن لگتا ہے، کچھ جلدی واپس آ گیا ہوں۔“

”کیوں؟“ بھنویں اچکا کر اس نے پوچھا۔ جب وہ سرد آہ بھر کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔



”کیوں کا مطلب تو شاید تم بہتر جانتی ہو۔ زندگی میں پہلی بار یقیناً تم نے میری کمی کو محسوس نہیں کیا۔“ اس کے شکوے پر وہ کچھ لمحوں کے لئے ضرور گڑبڑا کر رہ گئی۔ فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”طویل سفر نے یقیناً تمہارے اعصاب ٹھکانے پر نہیں چھوڑے۔ خیر تم بیٹھو، تب تک میں تمہارے لئے ایک گرما گرم چائے کا کپ بنا لیتی ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ہو سکتا ہے پاپا بھی اپنے دوست کے گھر سے آجائیں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تو میران شاہ نے بھی دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر پلکیں موند لیں۔

”پچھلے دو روز سے میں تمہیں مس کر رہا ہوں یمنی!“ پلکیں موندے موندے ہی اس نے با آواز بلند کہا تھا۔

”باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے مانی!“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس کے جواب میں اپنے نظریات بھی میں کبھی بار پیش کر چکا ہوں۔“

کچن میں کھٹ پٹ کے دوران بھی وہ اس کا جواب صاف سن سکتی تھی۔ تب ہی سر جھٹک کر مسکراتے بغیر نہ رہ سکی۔

”آسٹریلیا میں قیام کے دوران تم نے میری چائے کو تو یقیناً مس کیا ہو گا۔“ بالکل۔ محض چائے ہی کیا، تمہاری فون کال، تمہارے ایس ایم ایس، کس کس کو مس نہیں کیا میں نے۔ اور ادھر تم جیسی بے حس لڑکی نے محض ایک مرتبہ بھی خود سے کال کر کے حال تک پوچھنا گوارا نہیں کیا۔“

اب کے وہ پلکیں موندے شکوہ کر رہا تھا۔ تب ہی وہ بھاپ اڑاتی چائے کے گرم کپ تھام کر لاؤنج میں واپس آتے ہوئے بولی۔

”میں نے دو تین مرتبہ تمہارے سیل پر کال کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بار تمہارا نمبر مصروف ملا۔ اب بتاؤ بھلا میں کیا کرتی؟“

اس نے چائے کا کپ میران شاہ کی طرف بڑھایا تو بے دھیانی سے تھامنے پر گرم گرم چائے کپ سے چھلک کر یمنی کے ہاتھوں اور پاؤں کو جلا گئی۔ بمشکل ایک ہلکی سی سسکاری اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ مگر میران شاہ پریشان ہو گیا۔

”او گاڈ!۔۔۔۔۔ سو سوری یمنی! تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“

بجلی کی تیزی سے لپک کر وہ واش روم سے پیسٹ اٹھا لایا تھا۔ یمنی تو اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ معمولی سے پاؤں اور ہاتھ کے جلنے پر وہ جیسے تڑپ اٹھا تھا۔

”سوری یمنی! میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔“

اپنے ہاتھوں سے اس کے زخم پر پیسٹ لگانے کے باوجود وہ اس سے شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ جو کچھ بھی ہوا تھا، قطعی نادانستگی کے عالم میں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی میران شاہ بے قرار ہو گیا تھا۔ محبت کا حصول اگر محبوب کی تکلیف، تڑپ سے مشروط ہوتا تو یقیناً میران شاہ کی بے لوث محبت یمنی رحمن کے دل میں اپنا گھر ضرور کر لیتی۔ مگر اس کی محبت کا حصول میران شاہ کی آنکھوں کے اضطراب اور اس کے دل کی تڑپ سے مشروط نہیں تھا۔ سو وہ خالی ہاتھ، بے مراد رہا۔

☆...☆...☆

پیار کے سمندر میں ہر اُترنے والے کو  
کشتیاں نہیں ملتیں

دُور دُور تک جاناں دھوپ کی مسافت ہے  
اور کہیں بھی پل بھر کو دھوپ کے مسافر پر  
ساتباں نہیں کھلتے

اس عجب سمندر میں عمر کی ریاضت کے  
بعد ہم نے جانا ہے  
جس طرح فضاؤں میں اُڑنے والے پنچھی پر  
برس ہا برس میں بھی بھید، بھید رہتا ہے  
رازداں نہیں ملتے، بام و در نہیں کھلتے  
اس طرح محبت کے ہجر بے کراں میں بھی  
ہر اُترنے والے کو کشتیاں نہیں ملتیں  
اور مل بھی جائیں تو بادباں نہیں کھلتے  
پیار کے سمندر میں بھید، بھید رہتا ہے

رات دھیرے دھیرے بھگ رہی تھی مگر یادوں کے سمندر سے اُٹھتے تلاطم اسے نیند کی مہربان آغوش میں جانے سے روک رہے تھے۔ کھڑکی سے باہر برستی بارش کا شور سن کر آج بہت دنوں کے بعد اسے اپنا وطن، اپنے گھر والے شدت سے یاد آ رہے تھے۔

”کہاں چلے گئے ہو میرا شاہ! کبھی تو آ کر میری آنکھوں سے برستے آنسوؤں کا نظارہ دیکھو۔ کبھی تو دیکھو کہ تم سے بچھڑ کر میں ہنسنا بھول گئی ہوں۔ کبھی تو آ کر دیکھو میرا شاہ!“

بہت آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے وہ سسکی تھی۔ آنسوؤں کے چند نمکین قطرے پھسل کر اس کے گال بھگو گئے تھے۔ بکھرتے آنسوؤں میں ہی ماضی کی یاد کا ایک اور چراغ روشن ہوا تھا۔

”میمنی۔۔۔۔۔ یار کہاں ہو تم؟“

وہ بڑے مزے سے اپنے بیڈ پر لیٹی مووی دیکھ رہی تھی جب میرا شاہ اسے بلند آواز میں پکارتا ہوا وہیں اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

”میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں میمنی! اور تم ہو کہ اس میں گم ہو۔“ ہمیشہ کی طرح وہ اسے انڈین مووی میں گم دیکھ کر قدرے سٹپٹایا تھا۔ تب ہی وہ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

”کیوں پکار رہے تھے مجھے؟“

”وہ۔۔۔۔۔ میں مارکیٹ سے تمہارے لئے کچھ خرید کر لایا تھا۔“

”او ریسی۔۔۔۔۔ لیکن ابھی تو آسٹریلیا سے تم میرے لئے اتنا کچھ خرید کر لاتے تھے۔“ وہ پل میں خاصی پُر جوش ہو گئی تھی، تب ہی وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”تحفہ دیتے رہنے سے محبت بڑھتی ہے میمنی! لیکن میری محبت کی گہرائی کا اندازہ لگانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم واپس بال کی طرف بڑھا دیئے تو میمنی بھی اس کے پیچھے سے کمرے سے نکل آئی۔

”دکھاؤ نا، کیا تحفہ لائے ہو تم میرے لئے؟“

تحائف کی دلدادہ تو وہ بچپن سے ہی تھی، تب ہی قدرے بے تاب ہوئی تو میران نے تھوڑے سے انتظار کے بعد اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کر دی۔

”یہ لو۔۔۔۔۔ اس مٹھی میں جو چیز بھی ہے، وہ میں خلوصِ دل سے تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔“ اس وقت وہ بے حد سیریس تھا۔ تب ہی یمنی رحمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی گلابی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ مگر یہ کیا؟۔۔۔۔۔ ہتھیلی پر بجائے کسی انمول گفٹ کے ایک موٹا تازہ کاروچ رینگ رہا تھا جس کے لمس کو محسوس کر کے یمنی نے فوراً اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا پھر ہتھیلی پر رینگتے زندہ کاروچ کو دور پھینک کر زور سے چلا اُٹھی۔ پہلو میں دھڑکتے نازک دل کی دھڑکنیں ایک دم سے منتشر ہو گئی تھیں۔

”یہ کیا یمنی!۔۔۔۔۔ کوئی خلوص سے تحفہ دے تو اس کو سنبھال کر رکھتے ہیں۔ دُور نہیں پھینک دیتے۔“

میران اس وقت اسے ستانے کے موڈ میں تھا، لہذا مسکرا کر پھر سے زمین پر بے یارو مددگار چلتے زندہ کاروچ کی طرف بڑھا تو یمنی رحمن فلک شگاف چیخ مارتی ہوئی قریبی صوفے پر چڑھ دوڑی۔

”خبردار مانی!۔۔۔۔۔ اگر تم نے یہ کاروچ مجھ پر پھینکا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔“

بلند آواز میں چلاتے ہوئے اس نے وارننگ دی تھی۔ جواب میں تمام ملازمین بدحواس ہو کر لاؤنج کی طرف دوڑے آئے۔

”او مانی گاڈ یار!۔۔۔۔۔ عجیب چیز ہو تم بھی۔ بھلا یہ چھوٹا سا کاروچ تم جیسی اونچی لمبی دوشیزہ کو نگل سکتا ہے، خود ہی سوچو تم۔“ اسے روہانسی میں رونے پر آمادہ پا کر وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

”یمنی!۔۔۔۔۔ تمہارے پاؤں میں کاروچ۔“

میران کے کہنے کی دیر تھی کہ وہ پھر سے چلاتے ہوئے قطعی بدحواسی کے عالم میں لاؤنج سے باہر لان کی طرف دوڑ گئی اور یہیں عون احمر جعفری سے اس کا تیسرا ٹکراؤ ہوا تھا۔ کاروچ کے خوف سے لان کی طرف بھاگتے ہوئے



وہ سامنے سے آتے عون احمر جعفری کو قطعی نہیں دیکھ پائی تھی، تب ہی اس سے بری طرح ٹکرا گئی تو عون کے ساتھ چلتے رحمن صاحب اپنی بیٹی کی اس درجہ بد حواسی پر ٹھٹک کر رک گئے۔

”یمنی!۔۔۔۔۔ کیا ہوا بیٹے؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“

متوحش نگاہوں سے اپنی بیٹی کے سرخ چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ عون احمر جعفری کو اپنے گھر میں اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر شاکد رہ جانے

والی یمنی رحمن نے بمشکل چونکتے ہوئے گم صم سے انداز میں جواب دیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ مانی مجھے تنگ کر رہا تھا پاپا!“

”او گاڈ۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کب سدھرو گے تم دونوں۔ میں یہاں کیا پلان کر رہا ہوں لیکن تم دونوں کا بچپنا ہے کہ رخصت ہونے کا نام نہیں لے رہا۔“

قدرے جھنجھلاتے ہوئے وہ لان سے لاؤنج کی طرف بڑھ گئے تھے۔ جب عون احمر جعفری اپنی ستارہ سی روشن نگاہیں اس کے چہرے پر بغور جمائے عین اس کے مقابل آؤں۔

”لگتا ہے ایڈونچرز کی بہت دلدادہ ہیں آپ۔ لیکن یہ ہر بار مجھ سے ہی ٹکرانا کیوں فرض کر لیا ہے آپ نے؟“

”محض اتفاق کہہ لیجئے اسے، وگرنہ میں ایسا کوئی شوق نہیں رکھتی۔“

دل کی منتشر دھڑکنوں کا عکس اس نے اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دیا تھا، تب ہی سہولت سے کہہ کر واپس لاؤنج کی طرف بڑھ گئی تو عون احمر جعفری بھی بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

”میراں!۔۔۔۔۔ ان سے ملو بیٹے! عون احمر جعفری نام ہے ان کا۔ ابھی حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹے ہیں۔ میرے قریبی دوست رضا جعفری کو تو جانتے ہو تم، انہی کے بیٹے ہیں یہ۔“

پاپا، میراں شاہ سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بہت مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ تب ہی نہ جانے کیوں ایک ہلکے سے سرور کی لہر یمنی رحمن کے دل میں بھی سرایت کر گئی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ”اپنے کارنامے“ کی روداد سنانے کا جو خوف اسے عون کو اچانک دیکھ کر لاحق ہوا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔

رضا انکل کو وہ جانتی تھی۔ وہ ان کا بیٹا ہو گا، یمنی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

”ہیلو۔ مجھے میراں کہتے ہیں۔ انکل نے یقیناً میرے بارے میں آپ کو بتایا ہو گا۔“

عون احمر جعفری سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ جواب میں وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ جہاں تک میرا خیال ہے، انکل کی ہر بات آپ کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔“ یمنی دیکھ سکتی تھی کہ اس کے الفاظ نے میراں شاہ کے چہرے پر کیسے خوبصورت رنگ بکھیر دیئے تھے۔

”اور عون! یہ میری بیٹی ہے یمنی۔ انگلش میں ماسٹرز کیا ہے۔ آج کل فارغ ہے۔“

”نائنس ٹو میٹ یو مس یمنی!“

سنجیدہ نگاہیں بغور اس کے خوب صورت چہرے پر جمائے وہ گمبھیر لہجے میں کہتا اس کی طرف متوجہ ہوا تو ناچار یمنی رحمن کو بھی خوش دلی سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنا پڑا۔

”تھینکس۔ مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بہر حال میرا خیال ہے اب مجھے آپ لوگوں کے لئے گرما گرم چائے لے آنا چاہئے۔“

وہ اس ساحر کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی، تب ہی سرعت سے کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تو رحمن صاحب بولے۔

”میری یما بہت سمجھ دار بچی ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں آل ریڈی ان کی سمجھ داری کے مظاہرے دیکھ چکا ہوں۔“ اپنے پیچھے عون احمر کے ان الفاظ پر اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ بھی با آواز بلند کہتے ہوئے اسی کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

رحمن صاحب یا میراں شاہ نے اس کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ تب ہی وہ اطمینان کا سانس بھرتے ہوئے سرعت سے کچن میں گھس گئی۔

اتوار کا دن تھا، لہذا میران شاہ کی آفس سے بھی چھٹی تھی، تب ہی یمنی نے ساحل سمندر پر چلنے کی فرمائش کر دی تو بنا چوں چرا کئے ہمیشہ کی طرح وہ اس کی فرمائش پر فوراً اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہواؤں کے ساتھ وسیع سمندر کی پُر سکون موجوں کا رقص اعصاب پر اچھا اثر ڈال رہا تھا۔ یمنی رحمن گاڑی سے اپنا ضروری سامان نکال کر معطر آفندی سے بات کرنے کے بعد میران شاہ کی طرف آئی تو وہ کھویا کھویا سا ریت پر بیٹھا نہ جانے کیا لکھ رہا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے مانی؟“ وہ اسے چونکے کچھ لکھتے دیکھ چکی تھی، تب ہی اس کے مقابل بیٹھے ہوئے پُر شوق لہجے میں پوچھا تو جواب میں وہ ذرا سا رخ پھیر کر دھیمے سے بڑبڑایا۔

”ہو نہیں رہا یمنی! ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“ اس کا اشتیاق مزید بڑھا تھا۔

”محبت ہو گئی ہے۔“ اب کے اس نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”واہٹ؟۔۔۔۔۔ کس سے محبت ہو گئی ہے؟“ وہ واقعی بری طرح سے چونک اُٹھی تھی، جب وہ پھر سے رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

”ہے ایک حسین دوشیزہ۔ تم جان کر کیا کرو گی؟“

”کچھ نہیں۔ مگر اس حسین دوشیزہ کا کوئی نام بھی تو ہو گا کہ نہیں؟“

”نام تو بہت خوب صورت ہے اس کا لیکن تمہیں بتا دیا تو خوا مخواہ جلیس ہوتی پھرو گی۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں آج تم سے اس کا نام جانے بغیر تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔“ اس کے الفاظ پر وہ بڑے محفوظ کن الفاظ میں دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

”بتاؤ نا مانی! کیا نام ہے اس کا؟“

باوجود اس کے کہ وہ میران شاہ سے دلی وابستگی نہیں رکھتی تھی، اس کے دل میں اضطراب نے گھر کر لیا تھا، تب ہی شاید وہ کچھ پل اس کے چہرے کی جانب بغور دیکھنے کے بعد آہستہ سے بولا۔

”یمنی۔۔۔۔۔ یمنی رحمن نام ہے اس کا۔“

اپنی توقع کے عین مطابق میران شاہ کا جواب پا کر اس نے بے ساختہ اطمینان بھری گہری سانس فضا کے سپرد کی تھی۔ وہ اس سے ہٹ کر کسی اور کے لئے سوچتا، کسی اور کی جھولی میں چاہے جانے کا اعزاز پھینکتا، یمنی رحمن کی خود پسند فطرت کو یہ بات بھلا کب گوارا تھی؟ تب ہی گہری سانس بھرنے کے بعد دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”میرا اور تمہارا جو تعلق ہے، اسے محبت کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے مانی!“

”یہ محض تمہارا نظریہ ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔“ میران شاہ نے بھی اپنی رائے پیش کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟“

”ہاں۔ ہو بھی سکتا ہے۔“ اس کی نگاہیں اب بھی پُرسکون سمندر کی لہروں پر جمی تھیں۔

”جواب میں مجھ سے کیا چاہتے ہو میران؟“

”کیا دے سکتی ہو تم مجھے؟“ یمنی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔

”جو بھی تم مجھ سے چاہو۔ ماسوائے محبت کے۔“ بہت دھیمہ لہجہ تھا اس کا مگر میران شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”محبت کا حق کسے دان کرو گی یمنی!“ وہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر پوچھ بیٹھا تھا۔ جواب میں وہ قدرے مضطرب ہوتے ہوئے بولی۔

”محبت دانش مندوں کا ورثہ نہیں ہے میران! اور نہ ہی اسے باقاعدہ پلاننگ کے بعد خوب سوچ سمجھ کر کسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ یہ تو بس ایک نظر کا سوال ہے۔ کہاں، کب، کس نظر کی بھینٹ چڑھ جائے، کیا خبر۔“ وہ اس وقت غالباً اپنے حواس میں نہیں تھی۔



تاہم اس سے پہلے کہ میران شاہ جواب میں اس سے کچھ کہتا، یمنی رحمن کی نگاہیں قطعی بے ساختگی کے عالم میں کچھ ہی فاصلے پر اکیلے بیٹھے عون احمر جعفری کے خوبصورت سراپے پر جا پڑیں۔ اس وقت وہاں اچانک عون احمر جعفری کو دیکھ کر جس طرح سے وہ مسرور ہوئی تھی، اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں اٹھاتے میران شاہ پر بہت کچھ منکشف ہو چکا تھا۔ صرف ایک پل لگا تھا اسے مسمار ہونے میں۔ عرش سے فرش پر آنے میں۔ ابھی چند سیکنڈ قبل جو ٹھنڈی ہوائیں اسے کپکپانے پر مجبور کر رہی تھیں، انہی ہواؤں میں ایک دم سے گویا آگ بھر آئی تھی۔

”میرا شام سلونا شاہ پیا

سانوں مار گئی تیری چاہ پیا“

بہت دھیمے سے یمنی کے لبوں نے جنبش کی تھی۔ جواب میں میران شاہ کی سانسیں جیسے سینے میں اٹکنے لگیں۔ عون احمر جعفری ان کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر پھر بھی اس لمحے یمنی کی آنکھوں کی چمک نے اس کی پلکوں کو بھگو ڈالا تھا۔ اسے رہ رہ کر سوچنے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کی محبتوں میں کہاں

کمی رہ گئی تھی کہ اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ اس کے بے لوث جذلوں سے منہ پھیر کر کسی اور کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ دل کا اضطراب حد سے سوا ہوا تو ایک دم سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم یہیں بیٹھو یمنی! میں آئس کریم لے کر آتا ہوں۔“

بجھے بجھے سے لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا نگاہوں سے اوجھل ہوا تو یمنی ایک دم سے اپنے حواس میں واپس لوٹ آئی۔ عون احمر جعفری موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

اسی اثناء میں یمنی کے عقب میں بیٹھے دو نوجوان لڑکے آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے۔ بات غصے و اشتعال اور گالی گلوچ سے بڑھ کر مار کھائی تک آ پہنچی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان نے اپنی جینز کی پاکٹ سے پسٹل نکال لیا۔ کراچی جیسے شہر میں اس طرح کے معاملات معمول کا حصہ تھے مگر یمنی رحمن کے لئے یہ صورت حال قطعی متوقع اور نئی تھی۔ لہذا وہ بد حواس ہو کر چلا اٹھی تھی۔ تب ہی عون احمر جعفری نے موبائل آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی وہ خوف سے زرد پڑ رہی تھی جبکہ اس کے قریب بیٹھے نوجوان نے شدید مشتعل ہو کر اپنے ساتھی لڑکے پر فائر کر دیا تھا۔

اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ چلا رہی تھی، جب عون احمر جعفری تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

اچانک پسٹل والے لڑکے نے ان کی پشت پر کھڑے اپنے ساتھی کو پسٹل کی زد میں لے لیا اور پھر اس سے پہلے کہ یمنی اسے اس بات سے آگاہ کرتی، اس لڑکے کے پسٹل سے نکلتی گولی پشت پر کھڑے لڑکے کے بھاگ جانے پر سیدھی عون احمر جعفری کے کندھے کو چیر گئی۔

یقیناً اس وقت اگر وہ اس کے سامنے نہ آتا تو یہ گولی یمنی رحمن کے دماغ میں گھس کر اپنا کام دکھا چکی ہوتی۔ ایک دم پتھر ہوئی بصارتوں کے ساتھ اس نے عون کے کندھے سے نکلتے خون کی سرخی کو دیکھا۔ لوگ بد حواس ہو رہے تھے جبکہ دونوں لڑکے لمحوں میں وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ مگر یمنی کے حواس جیسے سن ہو گئے اور پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھالتا، وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر نیچے زمین پر گر پڑی تھی۔

وہ دوبارہ اپنے حواس میں واپس لوٹی تو اس کے لبوں پر سب سے پہلا ذکر عون احمر جعفری کا تھا۔

”پاپا!۔۔۔۔۔ پاپا!۔۔۔۔۔ عون کیسا ہے؟ اُسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

اپنی حالت سے یکسر بے خبر وہ عون احمر جعفری کے لئے رو رہی تھی اور اس کے یہ آنسو سیدھے میران شاہ کے دل پر گر رہے تھے۔ تب ہی وہ لپک کر اس کی سمت بڑھا۔

”عون ٹھیک ہے یمنی! ابھی یہاں سے گیا ہے۔ تم اپنا حال دیکھو، کتنی دیر کے بعد ہوش میں آئی ہو۔“ پریشان کھڑے رحمن صاحب کی جگہ میران شاہ نے اسے جواب دیا تھا۔

وہ اس کے لئے متفکر ہو رہا تھا اور ادھر یمنی رحمن کے آنسو اس کے رقب کے لئے بہہ رہے تھے۔

سائل سمندر پر ہوئے اس چھوٹے سے واقعہ نے یمنی رحمن کے دل کی دنیا کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ نہ بھی سوچنا چاہتی، تب بھی عون احمر جعفری کا تصور رہ رہ کر اسے بے قرار کرتا رہتا تھا۔ دل کی شوریدہ سری نے

محض چند ہی دنوں میں خاصا نڈھال کر چھوڑا تھا اسے۔ رحمن صاحب اس کی وجہ سے خاصے پریشان تھے۔ جبکہ میران شاہ تو جیسے جینا ہی بھول گیا تھا۔

رات رات بھر جاگنے سے اس کی سرخ سوچی ہوئی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ جو ہر روز لباس تبدیل کرنے کا عادی تھا، اب پچھلے چار روز سے ایک ہی سوٹ میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔ بزنس کی طرف سے بھی اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ گھر سے بھی زیادہ وقت باہر ہی گزارتا تھا۔ خوب صورت ”رحمن کاٹیج“ میں اچانک سناٹے در آئے تھے۔

اس تمام صورتِ حال سے گھبرا کر ہی رحمن صاحب نے ان دونوں کی جلد شادی کا فیصلہ کیا تھا اور آج کل وہ اپنی سرگرمیوں میں بری طرح مصروف دکھائی دے رہے تھے۔

اس روز بہت دنوں کے بعد یمنی اپنے سلوٹوں سے پُر کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے درست کرتی، منہ ہاتھ دھ کر لان کے قریب آئی تو وہاں میران شاہ کو

موجود پا کر ٹھٹک گئی۔ کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو، میلے لباس اور بکھرے اعصاب کے ساتھ بیٹھا وہ شخص میران شاہ نہیں ہو سکتا تھا۔

”آؤ یمنی! پلیر بیٹھو نا۔“

میران کی نظر جو نہی اس پر پڑی، وہ فوراً پکار اٹھا۔ جواب میں وہ تھکے تھکے سے  
قدم اٹھاتی عین اس کے مقابل جا بیٹھی۔

”ایک سوال پوچھوں یمنی! سچ سچ جواب دو گی؟“ عجیب بکھرا ہوا لہجہ تھا اس کا۔ وہ بے اختیار ہی نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گئی۔

”تمہیں یاد ہے یمنی! ابھی چند روز قبل تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے کچھ بھی مانگوں تو تم دو گئی، ماسوائے محبت کے۔ کہا تھا نا تم نے؟“

”ہاں!“ چہرے کا رخ پھیر کر عجیب شکستہ سے انداز میں اس نے اقرار کیا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ میں تم سے تمہارا عمر بھر کا ساتھ مانگتا ہوں یمنی!۔۔۔۔۔ دے دو اپنا ساتھ مجھے۔“ میران کے سوال پر اس نے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا۔

”میری محبت کے بغیر میرا ساتھ پانا چاہتے ہو تم؟“

”آئی ڈونٹ نو۔ میں بس تمہیں کھونا نہیں چاہتا یمنی! مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں کسی اور کے سپرد کر دوں۔“

چینتے لہجے میں احتجاج کیا تھا اس نے۔ جواب میں وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”میرا دل میرے اختیار میں نہیں ہے مانی! میں اگر اسے حاصل نہ کر پائی تو مر جاؤں گی۔“

”اور تمہیں نہ پا کر میں مر جاؤں گا یمنی!“

اب کے میران شاہ کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ آنسو چھلکاتی آنکھیں سراپا سوال بن کر اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

”تم اعلیٰ طرف ہو مانی! مضبوط دل ہے تمہارا۔ تم یہ درد اٹھا سکتے ہو۔ مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے۔“ آنسوؤں نے اس کے پورے چہرے کو بھگو ڈالا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔

”میری آدھی ادھوری ذات کا کیا کرو گے میران! مت آزمائش میں ڈالو مجھے، پلیز۔“

میران شاہ کا رہا سہا بھرم بھی مٹی میں مل گیا تھا۔ ذرا سی خوش فہمی کے ٹٹماتے چراغ کو یمنی رحمٰن کی آنکھوں سے عون احمر جعفری کے لئے بہتے آنسوؤں نے ایک دم سے بجھا ڈالا تھا۔

”میں نے کبھی تمہارے بغیر اکیلے جینے کا تصور نہیں کیا یمنی! تمہیں خود سے الگ رکھ کر جینے کی عادت نہیں ہے مجھے۔“

”تمہیں یہ عادت اب ڈالنا ہو گی میران! کیونکہ عون احمر جعفری کو بھلانے کا اختیار اب میرے پاس نہیں رہا ہے۔“

میران شاہ کی سرخ نگاہوں کی طرف دیکھے بغیر اس نے کہا۔ جب اس نے نڈھال لہجے میں سوال کیا۔

”جس سے پیار کرتی ہو، کیا وہ مجھ سے زیادہ خیال رکھتا ہے تمہارا؟“



”میں کچھ نہیں جانتی میراں! لیکن میں اسے اپنے دل اور اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتی۔“ قدرے چلا کر کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، جب اس نے پھر سے شکستہ لہجے میں سوال کیا۔

”انکل اس بات کے لئے نہیں مانیں گے یمنی! ان سے کیا کہو گی؟“  
میراں شاہ کے سوال پر فوراً پلٹتے ہوئے وہ خاصی بے دردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”ان سے میں نہیں، تم کہو گے مانی! اور یاد رکھنا، اگر مجھے عون احمر جعفری نہیں ملا تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ پھر کسی کے پاس سوچنے اور پچھتانے کا موقع بھی نہیں رہے گا۔“

☆...☆...☆

محبت دشتِ فراق میں

بنا رختِ سفر چلتے، کسی مجذوب کے دل سے

نکلتا ایک نوحہ ہے

محبت راستوں کے جال میں بھٹکا ہوا راہی

کسی کے بام پر ٹھہرا ہوا اک اجنبی چہرہ  
محبت خواب بن جائے تو تعبیریں نہیں ملتیں  
محبت ایک بارش ہے

جو اک اک بوند کر کے تن سے من میں جب اُترتی ہے  
سریلے ساز بجتے ہیں، انوکھے باب کھلتے ہیں  
کسی فنکار کے ہاتھوں سے چھڑتا بے خودی کا راگ  
محبت بارشوں کے موسموں میں یاد کی کایا  
محبت جلتے تپتے راستوں پہ پھیلتا سایہ  
محبت اک اداسی ہے، بلا کی خاموشی بھی ہے

محبت پت جھڑوں کا نام، محبت اک سلگتی شام

شب آہستہ آہستہ بھینگتے ہوئے، آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ مگر آج بھی نیند یمنی رحمن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ قطار در قطار آنسوؤں کے پھسلنے کا سلسلہ تاحال جاری تھا۔

نظر کے کینوس پر اس وقت تین سال کا وہ سین ابھر رہا تھا، جب وہ عون احمد جعفری کو پانے کے لئے ہسٹریک ہوئی تھی۔ رحمن صاحب اُس کی اور میران شاہ کی شادی کے بارے میں بہت سنجیدہ تھے۔ وہ جلد از جلد اس فریضے کو سرانجام دے کر پُرسکون ہو جانا چاہتے تھے جب عین وقت پر اس نے بغاوت کر ڈالی۔

”میں مانی سے شادی نہیں کر سکتی پاپا!“

”کیوں؟“ ان کی آنکھیں از حد حیرانی سے سکڑی تھیں۔ جب کہ قریبی صوفے پر بیٹھے میران شاہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

”کیونکہ میں مانی کو صرف اپنا اچھا دوست اور کزن سمجھتی ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“ خود سری انتہا پر تھی۔

”میران ایک دوست اور کزن کے علاوہ تمہارا فیانسی بھی ہے یم! اس بات کو مت بھولو تم۔“

”میں اس بات کو سرے سے مانتی ہی نہیں ہوں پاپا! بھلانے کا سوال تو بعد میں اٹھتا ہے۔“

وہ اس وقت بے حسی کی ہر انتہا کو پھلانگتی میران شاہ کی ذات کو پستیوں میں دھکیل رہی تھی۔

”تم بے وقوفی کر رہی ہو یم! میں نے اگر آج تک تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے دل میں جو آئے، تم وہی کرو۔ ابھی میں تمہارا برا بھلا سوچنے کے لئے زندہ ہوں۔ جس دن مر جاؤں، اس دن کرتی رہنا اپنی من مانیاں۔“ رحمن صاحب کو جلال آ گیا۔ یمنی رحمن نے ان کے کسی لفظ کی پروا نہیں کی۔

”پاپا! آپ نے آج تک اگر میری ہر خواہش کو پورا کر کے میری ذات پہ احسان کیا ہے تو اس احسان کا شکریہ۔ لیکن میں اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اپنی مرضی کے خلاف نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے مانی سے بات کر لی ہے۔ جب اسے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟“

”اپنی آواز نیچی رکھو یمنی! مت بھولو کہ اس وقت تم اپنے باپ سے مخاطب ہو۔ جہاں تک میران کا سوال ہے تو اس پاگل لڑکے کے ظرف پر سوال

مت اٹھاؤ۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا ہے یہ تمہیں۔ کفرانِ نعمت مت کرو بیٹے! بہت پچھتاؤ گی۔“

شکستہ لہجہ تھا ان کا۔ شاید اولاد خود سر ہو جائے تو والدین کے لہجے ان کے مان کے ساتھ یونہی بکھر جایا کرتے ہیں۔

اس کی آنکھوں میں واضح آنسو چھلک آئے تھے۔ تبھی رحمن صاحب نے نڈھال لہجے میں پوچھا تھا۔

”کون ہے وہ؟“

”آپ اسے جانتے ہیں پاپا! بہت پسند بھی کرتے ہیں اسے۔“

”عون۔۔۔۔۔ عون کی بات کر رہی ہو تم؟“ ایک مرتبہ پھر وہ از حد حیران رہ گئے۔ جواب میں یمنی رحمن نے پلکیں جھکا کر چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں اسے تمہارا اٹل فیصلہ سمجھوں یا محض جذباتیت؟“

”زندگی میں پہلی بار میں نے جذبات سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کیا ہے پاپا! مجھے

لگتا ہے میں عون کے ساتھ بہت خوش رہوں گی۔“

اس کے پاس گویا ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ تبھی رحمن صاحب نے تھکے تھکے سے انداز میں خود کو صوفے پر گراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ جانے کیوں اس وقت ان کا دل درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اعصاب جیسے لمحوں میں شل ہو گئے تھے۔ آج انہیں خود اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا، شرمندگی محسوس ہو رہی تھی اپنی تربیت پر۔ اکلوتی بیٹی کی ہٹ دھرمی پر، ایک لمحے میں جیسے وہ صدیوں کا سر طے کر آئے تھے۔ آج انہیں پچھتاوا ہو رہا تھا، کاش وہ اپنی بیٹی کو اتنی آزادی نہ دیتے۔ اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری نہ کرتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ محض یمنی کی ضد اور اصرار پر انہوں نے نہ جانے کس دل سے اپنے دوست رضا جعفری کے سامنے اپنا سوال رکھا تھا۔ جواب میں انہوں نے نہایت محبت کے ساتھ انہیں رشتہ پکا سمجھنے کی یقین دہانی کروا دی۔ یمنی تو انہیں بھی دل سے بے حد پسند تھی۔ دوسرا انہیں اپنے بیٹے کی فرمانبرداری پر بڑا مان تھا، لہذا اپنی طرف سے انہوں نے بات کو تقریباً پکا کر دیا تھا۔

☆...☆...☆

رحمن صاحب کے کہنے پر رضا جعفری صاحب نے عون سے بات کی تو وہ شکوہ رہ گیا۔ یمنی رحمن جیسی لڑکی کے بارے میں سوچنا اسے خواب میں بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے لحاظ کئے بغیر صاف انکار کر دیا۔ دل کے اندر اگر کسی لڑکی کو ہم سفر بنانے کی خواہش پنپ بھی رہی تھی تو وہ صرف دانیہ خان تھی۔ اس کی یونیورسٹی فیلو، جو یورپ میں تعلیم کے دوران اس سے ملی تھی۔ دھیمہ مزاج رکھنے والی سادہ سی دانیہ فقط تھوڑے سے عرصہ میں ہی اس کی روح و اعصاب پر بری طرح قابض ہو چکی تھی۔ تاہم ابھی وہ یہ بات اپنے ڈیڈ کے سامنے نہیں کر سکا تھا۔ لہذا تعلیم کی آڑ لے کر اس جھنجھٹ سے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر زبان پر قائم رہنے والے رضا احمد جعفری صاحب کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ زبردستی کی صورت میں جہاں اس نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی، وہیں رحمن صاحب نے اس کی نافرمانی پر اپنی جان سے گزر جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ نتیجتاً وہ بے بسی کے عالم میں، پنجرے میں قید پہنچی کی مانند محض پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

دانیہ خان کی جگہ کسی اور کو زندگی کا حصہ بنانا گویا موت کے مترادف تھا۔

اس کے ذہن میں ڈائریکٹ یمنی رحمن سے بات کرنے کا خیال آیا تھا۔ اگر وہ اس پر تمام حقیقت کھول کر رکھ دیتا تو یقیناً وہ خود اس رشتے سے انکار کر کے اس کا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے یمنی رحمن سے اس کے پرسنل سیل پر بات کر کے اسے قریبی ریسٹورنٹ میں ملنے کی دعوت دی تھی۔

☆...☆...☆

وہ اگلے روز شام میں، شاندار ریسٹورنٹ کے پُرسکون ماحول میں، ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے یمنی!“ ٹیبل پر موجود اپنے سامنے رکھے مشروب کے گلاس کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے بالآخر اس نے بولنے میں پہل کی تھی۔ جب وہ اپنا گلاس ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے دلکشی سے مسکرا کر بولی۔

”تو کہہ ڈالئے نا عون! میں یہاں آپ کی بات سننے ہی تو آئی ہوں۔“



اس وقت سچ سنور کر عون احمر جعفری کی قربت میں، اس کے مقابل بیٹھنا اسے کتنی بڑی خوشی سے ہم کنار کر رہا تھا، یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔ بلیک جینز پر لائٹ گرے شرٹ میں ملبوس اس کے عین مقابل بیٹھا وہ تیکھے نقوش والا خوب صورت شہزادہ، آنکھوں کے راستے سیدھا اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”آج میں آپ سے جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں، سمجھ لیجئے کہ بے حد مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔“ عون نے ایک مرتبہ پھر سرسری سی ایک نگاہ اس کے سبے سنورے سراپے پر ڈالتے ہوئے جیسے تمہید باندھی تھی۔

”میں اچھی طرح جانتی ہوں عون! کہ آپ آج مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“

وہ چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اپنی لائبی پلکیں جھکا کر مدہم لہجے میں بولی۔

”آپ مجھ سے یہی کہنا چاہتے ہیں نا، کہ میری طرح آپ کو بھی مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ آپ بھی رات بھر مجھے سوچ کر جاگتے رہتے ہیں۔ آپ کے دل

میں بھی اضطراب نے گھر کر لیا ہے۔ آپ بھی جلد از جلد مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہے نا؟“

کتنے رسان سے رخساروں پر جھکی پلکیں اٹھا کر اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں عون احمر جعفری کے سر پر جیسے ساتوں آسمان ایک دم سے گر پڑے۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے یمنی رحمن کے خوب صورت چہرے پر دل کش رنگوں کو دیکھا تھا۔

”آپ ضرور کسی بہت بڑی غلط فہمی، بلکہ خوش فہمی کا شکار ہیں مس یمنی!“

چند پل ضبط کے کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد اس نے بے حد سرد انداز میں کہا۔ وہ جیسے ساکت رہ گئی تھی۔

”میں نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی آپ کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا مس یمنی! میں نے آج یہی بات کلیئر کرنے کے لئے آپ کو یہاں بلایا ہے۔“ قطعی سرد انداز میں بنا اس کی طرف دیکھے وہ کہہ رہا تھا اور ادھر اس کے مقابل بیٹھی یمنی رحمن گویا مٹی کا بت بن کر رہ گئی تھی۔

”پلیز مائنڈ اٹ! میں زبردستی کے بندھن کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک شادی جیسے مقدس اور مضبوط بندھن کا تعلق محض دو جسموں کا ملاپ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں دو انسانوں کی دلی خوشی، ذہنی آسودگی اور روح کا قرار بھی شامل ہونا ضروری ہے۔ لہذا میں آپ کے سامنے یہ اعتراف کرنے میں قطعی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی اور لڑکی کو پوری ایمان داری کے ساتھ چاہتا ہوں۔ اور زندگی بھر چاہتا رہوں گا۔ میری زندگی میں کسی دوسری لڑکی کی گنجائش نہیں ہے۔ میرے ساتھ اگر آپ کی شادی ہو بھی گئی تو میں آپ کو کچھ نہیں دے سکوں گا۔ نہ محبت، نہ عزت و احترام، نہ کوئی مقام اور۔۔۔۔۔ نہ ہی آپ کا حق۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ آپ دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس یکطرفہ محبت کے سلسلے کو یہیں ختم کر کے، اس شادی سے انکار کر دیں۔ بصورتِ دیگر آپ اپنی دشوار ترین زندگی کے ذمہ دار خود ہوں گی۔“

اپنے دل کا غبار اس کی سماعتوں میں انڈیلنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔ سرعت سے کرسی کھسکا کر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ وہ ساکت بیٹھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دُور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

خالی ذہن، خالی روح اور خالی نگاہوں کے ساتھ ساکت بیٹھی وہ جیسے کچھ بھی سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو گئی تھی۔

میرا شام سلونا شاہ پیا

سانوں مار گئی تیری چاہ پیا

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے کسی چیز کی خواہش کی اور وہ چیز اس کی دسترس سے دور تھی۔ اپنے ٹھکراتے جانے پر اس کا دل جیسے غم و غصے کا الاؤ بن کر رہ گیا تھا۔ نڈھال قدموں کے ساتھ گم سم سی وہ گھر واپس آئی تو سامنے لان میں ہی میراں شاہ کو اپنے لئے خاصا متفکر پایا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں یمنی!۔۔۔۔۔ بتا کر بھی نہیں گئیں۔ اور یہ۔۔۔۔۔ یہ

اس حال میں کہاں سے آرہی ہو تم؟“

میران شاہ کے متفکر انداز نے بالآخر اس کے ضبط کے سارے بند توڑ ڈالے تھے۔ وہ بے اختیار ہو کر اس کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے سسک پڑی۔

”مانی!۔۔۔۔۔ مانی! وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ وہ کسی اور کو چاہتا ہے مانی!۔۔۔۔۔ وہ کسی اور کو چاہتا ہے۔“ ایک وہی تو غمگسار تھا اس کا، اس کی خوشیوں میں ہنسنے والا اور دکھوں میں رونے والا۔

”پلیز یمنی! رو مت۔ تم جانتی ہو نا، میران شاہ کو تمہارے آنسو بہت تکلیف دیتے ہیں۔“ محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے اس نے التجا کی تھی۔ وہ نڈھال سے انداز میں نیچے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں اسے کھونا نہیں چاہتی مانی! مر جاؤں گی میں اس کے بغیر۔“

اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ مگر کوئی اس وقت میران شاہ کی آنکھوں میں تیرتے درد کا نظارہ کرتا تو شاید یہ جان لیتا کہ اس کے دل میں پلنے والا درد، یمنی رحمن کے اندر موجود درد سے کتنا بڑھ کر ہے۔

”ایک بات کہوں یمنی! مائنڈ تو نہیں کرو گی؟“

برا ماننے کے لئے اس کے پاس رہ ہی گیا تھا۔ لہذا سُن دماغ کے ساتھ بھگی پلکیں اٹھا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”پتہ ہے یمنی! یہ جو محبت ہے نا، یہ اس شخص کے ساتھ کبھی نہیں کرنی چاہئے جسے محض آپ ٹوٹ کر چاہتے ہوں، مگر اسے آپ کی کوئی پروا نہ ہو۔ آپ کے جذبات و احساسات، آپ کے آنسو اس پر کوئی اثر نہ کرتے ہوں۔ یہاں تک کہ

ایک دن اس کے موم ہونے کا انتظار کرتے کرتے آپ خود پتھر کے ہو جائیں۔ ایسی یکطرفہ محبت سے کیا حاصل یمنی! کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم دل کا رشتہ اسی شخص کے ساتھ جوڑ لیں، جو ہم سے پیار کرتا ہو۔ چاہے ہم اسے چاہیں نہ چاہیں، وہ ہماری فکر کرتا ہو۔ ہمارا خیال رکھتا ہو۔ ہمارے آنسو اسے تکلیف پہنچاتے ہوں۔ ہماری ذرا سی توجہ اسے خوشی سے بے حال کر دیتی ہو۔ جو ہمارے مزاج کے ہر موسم سے آشنا ہو۔“

وہ خود غرض نہیں تھا۔ محض اپنے دل کی خوشی کے لئے یمنی رحمن کو آزمائش میں ڈالنا اسے پسند نہیں تھا۔ مگر اس وقت سوال اس کے دل کی خوشی کے

ساتھ ساتھ یمنی کے بہتر مستقبل کا تھا۔ اس کی مستقل خوشیوں کا تھا۔ سو اس نے تھوڑا سا خود غرض بن کر اسے سمجھانے میں قطعی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔ تاہم جواب میں یمنی رحمن کے الفاظ نے اُسے دُکھی ضرور کر ڈالا تھا۔

”میں اس وقت کچھ بھی سوچنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مانی! مجھے ہر قیمت پر عون احمر جعفری کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے لئے چاہے مجھے اپنی جان سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے، میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”تم پچھتاؤ گی یمنی!“ میران نے اسے اس فیصلے سے باز کھنے کی کوشش کی۔

”پروا نہیں مانی! ایک بار وہ میری دسترس میں آجائے، پھر اس کا دل اپنی طرف مائل کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔“

عجیب ضدی لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

☆...☆...☆

پورے وجود میں عجیب سی آگ دہک رہی تھی۔ اس وقت وہ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت وہ نہیں جانتی تھی کہ بعض خوش نما نظر آنے والی چیزیں زندگی کا حصہ بن جائیں تو جینا دُشوار کر دیا کرتی ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ خیر کے بجائے شر کو طلب کر رہی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔ خیر کے بجائے شر کو مانگنے والی۔ اندھا دھند اندھی محبت کی دلدل میں پھنسنے والی۔ نفس کی منہ زور آندھی میں بہہ کر، خود کو سلگتے لمحوں کی آگ کے سپرد کرنے والی۔ یہ سمجھ کر خود کو مطمئن رکھنے والی کہ دنیا میں محبت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ دل کی خوشی سے بڑھ کر دنیا کی کوئی راحت نہیں، کوئی دولت نہیں۔

اگلے ہی روز عون احمر جعفری نے اسے کال کی تھی۔

وہ اس وقت اپنے بستر پر لیٹی، اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

”ہیلو مس یمنی!۔۔۔۔۔ پھر آپ نے کیا سوچا؟“

رسمی دعا سلام کے بعد اس نے خاصے بے تاب لہجے میں پوچھا تھا۔ جب وہ قطعی انجان بنتے ہوئے بولی۔



”کس بارے میں؟“

”میں نے آپ پر جو حقیقت کھولی تھی، اس کے بارے میں۔“ قدرے چبا چبا کر اس نے کہا تھا۔ وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا عون! ویسے بھی آج کل ہر کوئی شادی سے پہلے ایسی سرگرمیوں میں مصروف دکھائی دے رہا ہے۔ آپ نے اگر کسی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ لیا تو کیا ہوا؟ نصیب تو میرا ہی بنیں گے آپ۔“

”جسٹ شٹ اپ مس یمنی!۔۔۔۔۔ میں دل کی گہرائیوں سے دانیہ خان کو چاہتا ہوں۔ اس سے ہٹ کر کسی اور لڑکی کے ساتھ زندگی بتانے کا تصور بھی نہیں کیا ہے میں نے۔“

یمنی رحمن کے ہٹیلے پن کی انتہا پر تپتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ جب وہ دل میں اُٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے بولی۔

”آئی ڈونٹ کیئر۔ میں آپ سے اتنی محبت کروں گی کہ آپ دانیہ خان تو کیا، خود اپنے آپ کو بھی بھول جائیں گے۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔ کیوں میرے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کو بھی عذاب بنانے پر تلی ہوئی ہو تم؟“

”میں آپ سے پیار کرتی ہوں عون! بے حد، بے تحاشا۔“

”جسٹ شٹ اپ۔ میں زبردستی کے رشتے کا قائل نہیں ہوں۔ نہیں دے سکتا تمہیں کوئی خوشی، پھر اتنی سی بات کیوں سمجھ میں نہیں آرہی تمہارے؟“

عون احمر جعفری کا ضبط جیسے جواب دے گیا تھا۔ تاہم یمنی رحمن کے جنون میں قطعی کوئی کمی نہیں آئی۔

”اتنی ہی نفرت تھی مجھ سے، تو میری بجائے خود اپنے کندھوں پر گولی کیوں کھالی تھی آپ نے؟ کیوں اس حادثے کا شکار ہونے والے، بے یار و مددگار بچے کی ذمہ داری خود اُٹھائی تھی؟ بولئے، کیوں کیا تھا یہ سب کچھ آپ نے؟“

اپنی دانست میں اس نے عون احمر جعفری کو لاجواب کرنا چاہا تھا۔ جب وہ قطعی روکھے لہجے میں بولا۔

”میں نے یہ سب محض انسانی ہمدردی کے تحت کیا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ صلے میں خود میری زندگی داؤ پر لگ جائے گی۔“ یمنی نے اس کا جواب بہت صبر سے سنا تھا۔ پھر اسی طرح ٹھہرے ہوئے مدہم لہجے میں بولی۔

”محض انسانی ہمدردی میں مجھ سے محبت بھی کر لیں نا عون پلیر!“

التجا پر وہ ایک مرتبہ پھر ضبط کھونے لگا۔ مگر سنبھل گیا۔ تبھی چمکتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولا۔

”محبت اگر کوئی بھیک ہوتی تو میں اسے ضرور آپ کی جھولی میں ڈال دیتا مس یمنی! مگر اس وقت سوال میرے دل، میری زندگی کا ہے۔ آپ میں اگر ذرا سی بھی عزت نفس ہے تو اپنے ڈیڈی کو اس رشتے سے منع کر دیجئے۔ بصورت دیگر میں ان پر ساری حقیقت کھول کر رکھ دوں گا۔ کیونکہ میں محض آپ کی خوشی کے لئے اپنی پوری زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔“

”اگر یہ آپ کی نفرت ہے تو میں اسے شہد سمجھ کر گھونٹ گھونٹ پی جاؤں گی عون! لیکن اگر یہ آپ کا چیلنج ہے تو جابیے، جو کر سکتے ہیں کر لیں۔ آپ

کو میرا نصیب بننے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے موبائل آف کر ڈالا تھا۔

عون احمر جعفری نے ”رحمن کاٹیج“ میں آ کر رحمن صاحب کو تمام حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جس کے بعد ان کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ وہ ہرگز جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دینا چاہتے تھے جو اس کی خوشیوں کی ضمانت بھی نہیں دے سکتا تھا۔

عون احمر جعفری کی صاف گوئی انہیں اچھی لگی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حتمی فیصلہ کر پاتے، اچانک یمنی رحمن وہاں چلی آئی۔ رحمن صاحب نے عون کے سامنے ہی اس سے تمام بات کلیئر کرنے کا اراد کیا تھا۔ مگر وہ تو جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ مسلسل ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی کہ اسے ہر قیمت پر عون احمر جعفری کا ساتھ چاہئے۔ خواہ کچھ ہو جائے، وہ اپنی خواہش سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس کی اس درجہ ہٹ دھرمی پر جہاں عون احمر جعفری طیش میں آیا تھا، وہیں رحمن صاحب کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ تب اس موقع پر روایت کے مطابق اپنی بیٹی کو سرکشی سے روکنے کے

لئے انہوں نے بھی وہی داؤ آزمایا تھا، جو اس موقع پر اکثر والدین آزمایا کرتے ہیں۔

”یاد رکھو یمنی! اگر تم نے اس سلسلے میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے فیصلے سے انحراف کیا تو میں اپنی جان سے گزر جاؤں گا۔ میں اپنے جیتے جی تمہیں یہ احمقانہ فیصلہ کرنے کا اختیار قطعی نہیں دوں گا۔“

وہ جانتی تھی کہ رحمن صاحب اسے اس طریقے سے بلیک میل ضرور کریں گے۔ تبھی اس نے پہلے سے ہی اس کا جواب سوچ لیا تھا۔

”اوکے پاپا! اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں ہرگز کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی جو محض میری وجہ سے آپ کو کسی بھی قسم کی تکلیف سے دوچار کرے۔“

اتنی جلدی ہتھیار پھینک دینے پر جہاں رحمن صاحب حیران ہوئے تھے، وہیں عون احمر جعفری بھی اپنی جگہ گویا شاکڈ رہ گیا تھا۔ مگر وہ محض ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رُکی تھی۔

”میں سرکش نہیں ہوں پاپا! لیکن عون کو حاصل کرنا اب میرا جنون بن گیا ہے۔ اب یہ تو طے ہے کہ میں انہیں کھو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر جب یہ طے ہے تو یہ زندگی بھی کس لئے پاپا؟“

اپنا جملہ مکمل کرنے کے فوراً بعد اس نے صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر دھرے ٹیبل پر سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھا کر سرعت سے اپنی بائیں کلائی کو کاٹ ڈالا تھا۔ اس سے قبل کہ رحمن صاحب یا عون احمر جعفری کچھ کر پاتے، وہ لہو میں نہا گئی تھی۔

آناً فاناً ہی وہ بات ہو گئی تھی کہ جس کا ان دونوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس معاملے میں وہ اس حد تک جذباتی واقع ہو گئی، رحمن صاحب کے ساتھ عون احمر جعفری کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ تبھی دونوں بدحواس ہو کر اس کی طرف لپکے تھے۔ لمحوں میں وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

میران شاہ کو اس واقعے کی بابت علم ہوا تو وہ رحمن صاحب اور عون احمر جعفری کے ساتھ اُلجھ پڑا۔

یمنی رَحْمَن کی خوشی، اس کی زندگی اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز اور قیمتی تھی۔ اس کی خوشی کے لئے وہ ہر امتحان سے گزر سکتا تھا۔ لہذا اس وقت بھی صرف اس کی خوشی کے لئے اس نے اپنے دل کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے ان دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

دو دن ہوش و حواس سے بے گانہ رہنے کے بعد تیسرے دن وہ ہوش میں آئی تو میران شاہ اس کے بستر کے قریب دھری کرسی پر الرٹ بیٹھایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی وحشت تھی اس وقت اس کی آنکھوں میں۔ سرخ سرخ سوجی ہوئی آنکھوں میں تیرتا پانی، عجیب سے درد کی کہانی سنا رہا تھا۔ تبھی وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بچوں کی مانند پھر سے رو پڑی۔

”مانی!۔۔۔۔۔ مانی! مجھے عون احمر جعفری چاہئے۔ پلیز ہیلپ می مانی! پلیز۔“

”یمنی! پلیز رو مت۔ میں ہوں نا۔ میں کرواؤں گا عون سے تمہاری شادی۔“

اس وقت اس کا ہر لفظ رو رہا تھا۔ مگر وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”پرامس۔۔۔۔۔؟“

”ہاں پرامس۔ لیکن آئندہ ایسی حرکت مت کرنا یمنی! تم جانتی ہو نا، میران شاہ کی زندگی کا محور صرف تمہاری ذات ہے۔ کیوں بار بار آزمائش میں ڈالتی ہو تم مجھے؟“

بھراتے ہوئے زخمی لہجے میں کہتا وہ اس کے پہلو سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆...☆...☆

بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں، جنہیں مضبوط کرتے کرتے انسان خود ٹوٹ جاتا ہے۔ یمنی رَحْمَن کے ساتھ میران شاہ کا رشتہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی ذات سے وابستہ وفا کے بندھن کو مضبوط کرتے کرتے وہ خود ٹوٹ رہا تھا۔ یمنی رَحْمَن کو ”رَحْمَن کاٹیج“ سے رخصت کرتے وقت بظاہر مختلف کاموں میں مصروف دکھائی

دینے کے باوجود وہ بار بار اپنی بھیگتی پلکوں کو رگڑ رہا تھا۔ پرپل کلر کے

نہایت دیدہ زیب لہنگا گرتی میں ملبوس، زیورات سے لدی پھندی، گہرا میک اپ کئے وہ اسے دنیا کی سب سے حسین ترین لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

آنسوؤں کے جس ریلے پر وہ کب سے بند باندھے ہوئے تھا، اس وقت اسے

مقابل پا کر وہ ضبط کھو بیٹھا۔



”تھینک یو مانی! مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے بہت پیار کرتے ہو۔ شاید اس پیار سے بھی زیادہ، جو میں عون سے کرتی ہوں۔ لیکن آئی ایم سوری مانی! میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکی۔ ہو سکے تو میری اس خود غرضی کو معاف کر دینا۔ اور پاپا کے ساتھ ساتھ اپنا بھی خیال رکھنا، پلیز۔“

خوب صورت بلوریں آنکھوں سے آنسو چھلاکتی، سرگوشیانہ لہجے میں وہ اس سے التجا کر رہی تھی۔ بنا کچھ کہے وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆...☆...☆

”رحمن کاٹیج“ سے وہ بڑی دھوم دھام سے رخصت ہوئی تھی۔ اور ادھر ”احمر پیلس“ میں اس کا استقبال یوں کیا گیا تھا، گویا کسی ریاست کی راج کمارى ہو۔ رضا احمر جعفرى صاحب کے پاؤں تو مارے خوشی کے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ سب یمنی رحمن کے حُسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ ہر ایک زبان

پر اس کی خوب صورتی کا ذکر تھا۔ سب ان دونوں کو چاند سورج کی جوڑی سے تشبیہ دے رہے تھے۔

”احمر پیلس“ میں ہونے والے اس شاندار استقبال نے یمنی رحمن کا مزاج مزید ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ عون احمر جعفری کو اپنے حُسن سے شکست دینے کا سوچ کر مسرور ہو رہی تھی۔ آنے والی ساعتوں کے بارے میں سوچ کر اس کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ چہرے پر ان گنت رنگ بکھر رہے تھے۔ لرزتی پلکیں اس کے اندر کا حال بخوبی عیاں کر رہی تھیں۔

”احمر پیلس“ میں بے شمار رسومات کی ادائیگی نے اسے بری طرح تھکا ڈالا تھا۔ عون احمر جعفری کے سراپے کو محض تصور میں لا کر ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ٹک ٹک سیکنڈز گراتی گھڑی اس کے دل کی دھڑکنوں پر چل رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ انتظار بنا ہوا تھا، مگر۔۔۔ ساڑھے گیارہ سے بارہ۔ اور دو سے ڈھائی بج گئے تھے۔ جب بھی وہ بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔

مسلسل بیٹھے بیٹھے یمنی ر حمن کی کمر تختہ بن چکی تھی۔ کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔ شب کے ڈھائی بجے عون کی کسی کزن نے آ کر اطلاع دی تھی کہ عون کے ایک قریبی دوست کی اچانک طبیعت خراب ہو جانے کے باعث عون ابھی تک ہسپتال سے گھر نہیں آ پایا ہے۔ وہ اس سے معذرت کر رہی تھی۔ اور ادھر یمنی ر حمن کی دھڑکنیں جو دروازہ کھلنے کی آہٹ پر بری طرح منتشر ہو گئی تھیں، ایک دم سے تھم گئیں۔ آنکھوں میں بے ساختہ ساون اُمڈ آیا تھا۔

”پذیرائی“ کے حوالے سے کوئی خاص اُمید اسے بھی نہیں تھی۔ مگر اتنی تذلیل، اس قدر اہانت کہ لمحوں میں ہی اس کے رخسار جیسے تپ اٹھے تھے۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی، مگر بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

عین اسی پل شب کے تقریباً ساڑھے تین بجے عون احمر جعفری نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ بظاہر خوب نک سک سا تیار ہوا وہ خوبو مرد، اس وقت بہت نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔

یمنی ر حمن اسے دیکھ کر اپنی جذباتی فطرت پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ تبھی اسے صوفے پر سکون سے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ بنا اپنی پوزیشن کا لحاظ کئے، بھاری بھر کم لباس سنبھالتی اگلے ہی پل اس کے عین مقابل جا کھڑی ہوئی تھی۔

”کہاں تھے آپ اب تک؟“

بھرپور استحقاق کے ساتھ قطعی درشت لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ وہ ایک اچلتی سی نگاہ اس کے شاندار سراپے پر ڈالتے ہوئے آہستگی سے پلکیں موند کر بولا۔

”میں اپنے کسی عمل کے لئے تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“

”کیوں نہیں ہیں؟ میں بیوی ہوں آپ کی۔ میرے حقوق کی پاسداری آپ کا فرض ہے۔“

”شٹ اپ۔۔۔۔۔ کس حق کی بات کر رہی ہو تم؟ بولو۔۔۔۔۔ کیا میں نے وارن نہیں کیا تھا کہ میں تمہیں اپنی ذات سے کچھ نہیں دے سکوں گا۔ پھر کس منہ سے حق کی

بات کر رہی ہو تم؟“ اس کے ہٹیلے انداز پر لمحوں میں جیسے وہ سلگ اٹھا تھا۔

دانیہ خان کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں سارے فنکشنز کو چھوڑ کر ہسپتال بھاگا تھا۔ پچھلے تین چار گھنٹوں سے وہ اس کے پاس ہی تھا۔ اس وقت اسے کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ رضا احمر جعفری صاحب کے بھرپور اصرار اور سختی کے باوجود وہ اسے خطرے سے باہر لا کر الگ روم میں منتقل کروانے کے بعد ہی گھر واپس لوٹا تھا۔

اسے اپنی ضد میں اٹل پا کر وہ نرم پڑی۔ تبھی لہجے میں ترشی کے بجائے عاجزی سمٹ آئی تھی۔ جواب میں وہ فوراً اس کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

”آئی ڈونٹ کیئر۔ مجھے اس قصے سے دلچسپی نہیں ہے۔ اور ویسے بھی میں بہت زیادہ تھک چکا ہوں۔ لہذا پلیز مجھے مزید ڈسٹرب مت کرو۔“

سنگ دلی سے کہنے کے ساتھ وہ وارڈ روم سے اپنے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا تو یمنی رحمن بھی ایک دم سے جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔ سارا جسم جیسے لمحوں میں تنھکن کا شکار ہو چکا تھا۔ قدم گھسیٹتی وہ آئینے کے

سامنے کھڑی ہو گئی۔ قدرت نے اسے حُسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ مگر آج اس کا سارا حُسن بے کار گیا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ یمنی رحمن نے زندگی میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا عون! تمہیں اگر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے حاصل کر لیا ہے تو اب تمہارے دل تک رسائی بھی حاصل کر کے رہوں گی میں خواہ اس کے لئے مجھے اپنی زندگی کو ہی داؤ پر کیوں نہ لگانا پڑے۔ میں تم سے ہار نہیں مانوں گی عون! نہیں روؤں گی میں اب۔“

بے دردی سے آنسو رگڑ کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

☆...☆...☆

اگلے روز صبح ہی صبح رحمن صاحب اور میران شاہ اس سے ملنے چلے آئے تھے۔ یمنی انہیں دیکھ کر بے تابی سے رحمن صاحب کے کشادہ سینے میں جا چھپی تھی۔

”آئی مس یو پاپا!“

رحمن صاحب اس کی دیوانگی پر بے بسی سے مسکراتے تھے۔

”مس یو ٹو بیٹے!۔۔۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟“ پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔

”ٹھیک ہوں پاپا! آپ کیسے ہیں؟ اور مانی! تم کیسے ہو؟“

رحمن صاحب سے فوراً نظریں چراتے ہوئے وہ میران شاہ کی طرف متوجہ ہوئی جو اپنی اداس نگاہوں سے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں کیسا لگ رہا ہوں؟“ کسی قدر بجھے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

جواب میں وہ ایک مرتبہ پھر نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس سے مزید کوئی سوال کرتی، آسمانی گرتا شلوار میں ملبوس نکھرا نکھرا سا عون احمر جعفری اپنے بیڈ روم سے نکل کر ان سے ملنے چلا آیا۔ رضا احمر جعفری، رحمن صاحب کے پہلو میں موجود تھے۔

”کیسے ہو عون بیٹا!“ بھرپور محبت کے ساتھ اسے بانہوں میں بھر کر انہوں نے پوچھا تھا۔ وہ رسمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

”فائن انکل! آپ کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہوں بیٹے! لیکن یمنی کے بغیر پورا گھر جیسے سونا سونا دکھائی دے رہا تھا تو صبح ہی صبح ہم دونوں ملنے چلے آئے۔ اصل میں اسے کبھی نظروں سے دور کیا نہیں ہے نا۔ خیر اب تو اپنے جگر کا ٹکڑا تمہارے سپرد کر ہی چکا ہوں، کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا بہت خیال رکھنا عون! پلینز۔۔۔۔۔“

یمنی نے آج دوسری مرتبہ اپنے پاپا کی پلکیں بھگی ہوئی دیکھی تھیں۔ کیا سوچا تھا انہوں نے مگر کیا ہو کر رہ گیا تھا ان کے ساتھ۔ وہ جسے انہوں نے کبھی ایک پل کے لئے خود سے الگ کرنے کا نہیں سوچا تھا، آج ان کی وہی اکلوتی لخت جگر ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی ان سے فاصلے پر تھی۔

”رحمن! کم آن یار! یمنی یاب میری بیٹی ہے۔ اور تم دیکھنا، میں اپنی بیٹی کا خیال تم سے زیادہ رکھوں گا۔ یہ یہاں اتنی خوشیاں پائے گی کہ تمہارا گھر اسے کبھی بھولے سے بھی یاد



نہیں آئے گا۔“ رضا احمر نے اپنا بازو ان کے شانوں کے گرد پھیلاتے ہوئے اطمینان سے کہا تو ان کے لبوں نے بے ساختہ ”آمین“ کہا۔

”پاپا! مجھے اس وقت ذرا ہسپتال تک جانا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، کل میرے ایک عزیز دوست کی طبیعت خراب تھی۔ لہذا ابھی میں اس کی عیادت کرنے جا رہا ہوں۔ ہسپتال سے واپس آ کر آپ لوگوں کو جوائن کروں گا۔ اوکے، بائے۔“ مروت، لحاظ رکھے بغیر دو ٹوک لہجے میں کہتا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ عین اسی پل رحمن صاحب اور میران شاہ کی نگاہیں ایک ساتھ یمنی رحمن کے چہرے کی طرف اٹھی تھیں۔ جواب میں اس نے ذرا سا گڑبڑاتے ہوئے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔

وہ پورا دن یمنی کی فرمائش پر رحمن صاحب اور میران شاہ نے ”احمر پیلس“ میں اس کے ساتھ ہی بتایا تھا اور اس دوران انہوں نے ہر ممکن طریقے سے عون کی فرمانبرداری اور اسے خوش رکھنے کی کوئی ہزار نصیحتیں اس کے پلو سے باندھ دی تھیں۔

عون کی واپسی کے انتظار میں شام ڈھلے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

☆...☆...☆

ادھوری باتیں ہی زندگی ہیں

وہ گزری باتیں ہی زندگی ہیں

اگرچہ دل کی اداس اُجڑی ہوئی رُتوں میں بکھر گئی ہیں

کئی زمانوں سے ساری باتیں، وہ گزری باتیں

سلگتی شاموں کے جلتے بجھتے الاؤ میں ہی پگھل گئی ہیں

ادھوری باتیں، ضروری باتیں

عون احمر جعفری سے اس کی شادی کو یہ دوسرا ہفتہ تھا اور اس دوسرے ہفتے میں اس نے ہر ممکن طریقے سے اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر طریقے سے خود کو بنا سنوار کر دیکھ لیا تھا مگر وہ ایسا پتھر کا بت ثابت ہوا تھا کہ سرسری سی ایک غیر اتفاقی نگاہ بھی اس پر ڈالنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ رات کو دیر سے آنا اور صبح ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکل جانا اس نے اپنا روز کا معمول بنا لیا تھا۔ اپنی اپنی جگہ جیسے دونوں ہی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔

”یمنی رحمن کو اس کی بے حسی نے خاصا ہرٹ کیا تھا۔ مگر وہ چہرے پر ”خوش ہوں“ کا لیبل چپکا کر سارے آنسو اندر ہی اندر گراتی رہی۔ زبردستی خوش نظر آنے کی کوشش میں اب جیسے وہ خود بے زار ہو گئی تھی۔ رضا احمر جعفری، رحمن صاحب اور میران کی خوشی کے لئے اس نے اپنے آپ کو ”صبر و ضبط“ کا چلتا پھرتا اشتہار بنا لیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ٹوٹ جاتے ہیں مگر کبھی جھکنا گوارا نہیں کرتے۔

وہ بھی میران کے سامنے شکستگی کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتی تھی، لہذا جب بھی ”رحمن کاٹیج“ کا چکر لگاتی، بات بے بات مسکراتی رہتی تھی۔

اس روز وہ دن ڈھلے میران شاہ کے ساتھ واپس ”احمر پیلس“ آئی تو ایک نیا شاک اس کا منتظر تھا۔ میران شاہ اس کے ہزار اصرار کے باوجود اسے گھر سے باہر ہی اتار کر واپس پلٹ چکا تھا۔ لہذا وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی طویل راہ داری عبور کر کے وسیع ہال میں داخل ہوئی تو سامنے ہی صوفے پر رضا احمر اور عون کو بحث کرتے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

”تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو عون! مت بھولو کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ یمنی بیٹی کے ساتھ جو سلوک تم کر رہے ہو، میں اس سے ہرگز غافل نہیں ہوں۔“ رضا احمر کو اتنے شدید غصے میں دیکھنے کا اتفاق اسے پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ تب ہی اسے عون کی بلند آواز سنائی دی تھی۔

”سو وہاٹ پاپا!۔۔۔۔۔ میری زندگی پر میرا اپنا کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟ میں جس لڑکی کو ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، آپ نے بلاوجہ ضد کر کے اسے میری زندگی کا حصہ بنا دیا۔ اب آپ مزید مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لوں، یونہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟“

اس سے زیادہ اہانت کیا ہو سکتی تھی اس کے لئے۔ یکدم ہی دل جیسے بوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔

”یمنی میں کس چیز کی کمی ہے عون؟۔۔۔۔۔ خوب صورت ہے، پڑھی لکھی، باشعور لڑکی ہے۔ ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور کیا چاہتے تمہیں؟“ رضا احمر جعفری بھی اس کے جواب سے جیسے ہرٹ ہوئے تھے۔

تم اسے بھی ساتھ لے کر جاؤ۔ بصورتِ دیگر کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

قطعی دو ٹوک لہجے میں اپنی بات کہنے کے بعد وہ وہاں رُکے نہیں تھے۔ جبکہ  
عون احمر جعفری شدید بے بسی کے عالم میں قریبی صوفے کو ٹھوکر مار کر رہ  
گیا تھا۔

زندگی کے اس موڑ پر یمنی رحمن نے ایک اور امتحان کا سامنا کیا تھا۔ ایک طرف اگر عون احمر جعفری تھا تو دوسری طرف اس کے پایا رحمن صاحب اور میران شاہ تھے۔ اگر وہ عون احمر جعفری کے ساتھ یورپ جانے سے انکار کر دیتی تو یہ جان بوجھ کر سب کچھ اپنے ہاتھوں گنوا دینے والا معاملہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ عون اسٹیٹس کیوں جانا چاہ رہا ہے۔

دوسری طرف اگر وہ اس کے ساتھ چلی جاتی تو پھر اپنے نہایت مشفق پایا اور بے حد مہربان دوست، میران شاہ کو دیکھنے کے لئے ترس جاتی۔ وہ اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ کتنے ہی دنوں تک وہ اللہ سے دعا مانگتی رہی تھی کہ عون احمر جعفری

”میں اسے پسند نہیں کرتا پایا! اور اس ناپسندیدگی کی میرے پاس کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ وہ مرد ہو کر بھی اپنے دل کی حکایت اپنے باپ پر نہیں کھول پا رہا تھا۔ اور ادھر اس نے ایک عورت ہو کر اپنا وقار اپنے باپ کی نظروں میں گرا ڈالا تھا۔

”او کے۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اکیلے باہر نہیں بھیج سکتا۔“ اب کے رضا صاحب کے جملے نے ساکت کھڑی یمینی رَحْمَن کو چونکا دیا تھا۔

”میں وہاں اسٹڈی کے سلسلے میں جا رہا ہوں پایا! ہنی مون منانے نہیں جا رہا جو اس دُم چھلے کو ساتھ رکھوں۔“ رضا جعفری کے اٹل لہجے کے جواب میں اس نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ جب وہ سختی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”میں یمنی کے لئے ایسے الفاظ پسند نہیں کرتا عون!۔۔۔۔۔ مت بھولو کہ وہ میرے انتہائی قریبی دوست کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ میری بہو بھی ہے۔ لہذا یورپ جانے کی اجازت اب تمہیں محض اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ

اپنے اسٹیٹس جانے کا ارادہ ترک کر دے مگر اس کی دعائیں مستجاب نہیں ہوئی تھیں۔ دل کے ہزار نہ چاہنے کے باوجود صرف عون احمر جعفری کے دل تک رسائی پانے کی لگن میں اسے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ شکاگو آنے کی تیاری کرنا پڑی تھی۔

وقت رخصت جب وہ ”رحمن کاٹیج“ سے نکل رہی تھی تو جانے کس احساس سے مغلوب ہو کر میران شاہ نے اس کے آنچل کا کونہ تھام لیا تھا۔ ضبطِ گریہ سے سرخ آنکھیں آج باقاعدہ آنسو لٹا رہی تھیں۔

”میران شاہ کے گھر سے تو دور چلی گئی ہو یمنی! اب اس کا شہر چھوڑ کر تو مت جاؤ پلیز۔“

ضبط کے سارے بند جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ رحمن صاحب کا حال بھی دیکھنے لائق تھا مگر اس نے ان جذباتی لمحوں میں خود کو کمزور پڑنے نہیں دیا۔ تب ہی دل کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

”میں مجبور ہوں مانی! کہ یہاں رکنے کا کوئی اختیار اب میرے پاس نہیں ہے۔“

”اختیار تھا بھی تو تم کب رک گئی تھیں؟“

جواب میں یمنی رحمن کی ساری ہمتیں بھی جیسے ریت کی بھر بھری دیوار کی مانند ڈھے گئی تھیں۔

”مجھے معاف کر دو مانی! پلیز۔۔۔۔۔۔“ اس کے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھتی ہوئی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو نڈھال سے میران شاہ نے التجائی۔

”یمنی! پلیز ایسے مت روؤ۔ تم جانتی ہو نا کہ میران شاہ کو تمہارے آنسو کتنی تکلیف دیتے ہیں۔“

دو زانو ہو کر اس کے مقابل بیٹھے ہوئے وہ جیسے گر گڑایا تھا۔ جواب میں یمنی نے فوراً اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

کتنے طرف کا حامل شخص تھا وہ۔ مگر غلط دل سے لو لگا بیٹھا تھا۔ تب ہی تو ہر قدم پر ضبط کے کڑے مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا اسے۔

”اوکے۔۔۔۔۔۔ میں اب نہیں روؤں گی۔ مگر پاکستان واپسی پر مجھے تم کمزور یا دکھی ملے تو میں تمہارا یہ قصور کبھی معاف نہیں کروں گی۔“



دونوں طرف برسات ہو رہی تھی اور اس برسات میں بھیگتے ان کے دل ایک دوسرے سے عہد لے رہے تھے۔

شکاگو میں ایک دردناک اور روکھی زندگی باہیں پھیلائے جیسے اس کی منتظر کھڑی تھی۔ عون احمر جعفری کا دل اپنی ”محبت“ سے جیتنے کی ضد میں وہ سرتا پا بدل کر رہ گئی تھی۔ مگر دانیہ خان کی محبت میں مدہوش وہ اپنی عادتوں میں ایک انچ بھی فرق نہیں کر پایا تھا۔ ایک اچھی بیوی ہونے کا ہر فرض وہ بخوبی نبھا رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کی ”بیوی“ نہیں بن سکی تھی۔ شادی کی پہلی رات سے لے کر اب تک عون احمر جعفری نے اس سے خود کو ایسے دُور رکھا تھا، جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔

پاکستان میں اسے جو عون احمر جعفری کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کا شاندار اعزاز حاصل تھا، یہاں آ کر وہ اعزاز بھی اس سے چھن چکا تھا۔ عون احمر جعفری نے اسے اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے کمرے اور آنکھوں سے بھی دُور کر دیا تھا۔ پورا دن وہ مختلف کاموں میں جتی رہتی اور رات میں بستر پر

جیسے کانٹے اگ آتے تھے۔ صبر و ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے گزرتے وہ اب جیسے تھکنے لگی تھی۔

عون کی نظروں کے حصار میں رہنے کے لئے اس نے اپنا سراپا ہی بدل ڈالا تھا۔ لمبے گھنے بالوں کو کٹوا کر شولڈر تک لے آئی تھی۔ مشرقی سوٹ کی جگہ اب اس نے زیادہ تر ٹراؤزر، جینز اور سیلو لیس شرٹس کو زیب تن کرنا شروع کر دیا تھا۔

فقط تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک مشرقی دوشیزہ سے مغربی حسینہ کے روپ میں ڈھل گئی تھی۔ مگر عون احمر جعفری نہ جانے کس مٹی سے بنا تھا کہ اس کا دل اب بھی یمنی رحمن کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ گزرتے ہر دن کے ساتھ ان کے رشتے میں وہی فاصلہ، وہی سرد مہری اور وہی اجنبیت قائم تھی جو کہ پہلے روز ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ دانیہ کے شکاگو آنے کے بعد تو اس کے رویے میں اور اجنبیت آ گئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ عون کو یمنی رحمن کے ساتھ اپنائے گئے اپنے سنگ دلانہ رویے کا احساس نہیں تھا یا اسے تکلیف دے کر وہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ ظلم

ڈھانے کا وہ ہرگز شوقین نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ یمنی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر مجبور تھا۔ جب بھی یمنی کی طرف اس کی نگاہ اٹھتی تھی، بے ساختہ وہ لمحات اسے یاد آ جاتے تھے کہ جب وہ زبردستی اس کی زندگی کا حصہ بننے کے لئے بضد ہو گئی تھی۔

انسانی فطرت ہے کہ جو چیز زبردستی جھولی میں آگرے، قابل توجہ نہیں لگتی۔ یمنی رحمن بھی اس کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی مانند زبردستی آگری تھی۔ لہذا اسے اس کی شخصیت سے ایک عجیب قسم کی چڑ ہو گئی تھی۔ جب بھی وہ اس کے سامنے آتی تھی، اس کے اعصاب تن جاتے تھے۔ ایک بھاری بوجھ کی مانند وہ اسے اپنی روح پر مسلط محسوس ہوتی تھی۔ اس کا ہوش ربا حُسن، سلیقہ، وفا شعاری، دیوانگی، سب ناپسندیدگی کی بھینٹ چڑھ کر رہ گیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ بہت کوشش کرتا تھا کہ اگر اسے محبت کے جواب میں محبت نہیں دے سکتا تو نفرت بھی نہ دے۔ مگر چاہ کر بھی ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ بے باک، بولڈ لڑکیوں سے وہ ہمیشہ خار کھاتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی اپنی ماں کا کردار تھا۔ بچپن ہی میں اپنی ماں کی حد

سے زیادہ بولڈ نیس اور آزاد روش نے اسے شدید احساس بنا دیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد جب وہ اس کے پاپا سے ڈائیورس لے کر اپنے بچے کی پروا کئے بغیر چلی گئیں تو اسے ایسی عورتوں کے تصور سے بھی گھٹن آنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اپنی ماں کو یاد نہیں کیا تھا۔ باہر کے آزاد ماحول میں رہ کر بھی اس نے اپنا دامن صاف رکھا تھا۔ دانیہ خان کی ذات سے اس کی بے تحاشا محبت کی وجہ اس کی سادگی اور مضبوط کردار ہی تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے علاوہ کسی تیسرے فرد سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جبکہ یمنی رحمن نے تو کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اپنے کزن کے ساتھ ایگج ہونے کے باوجود وہ

اسے پانے کے لئے ہر حد سے گزر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دل میں تاحال اسے کوئی باعزت مقام دینے پر خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔

سفر آسان لگتا تھا

دلِ برباد تجھ کو یہ سفر آسان لگتا تھا

ادھر تو سوچتا تھا اور ادھر

آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا

دل برباد ہم نے تو کہا تھا

یہ سفر آسان لگتا ہے

مگر-----

آنکھیں بدن سے چھین لیتا ہے

اس وقت بھی وہ اس پر سرسری سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قدموں کی آہٹ پر فوراً بیدار ہو کر اس کی طرف لپک آئی۔

”آج پھر آپ لیٹ ہو گئے عون! میں نے کتنی محنت سے آپ کے لئے پاسٹا بنایا تھا۔“

خالص بیویوں والے انداز میں اس کی بے نیازیوں سے قطع نظر وہ کتنے مان سے گلہ کر رہی تھی۔ مگر عون کا دل چونکہ دانیہ خان کی وجہ سے پریشان تھا، لہذا وہ اپنے قدم آگے بڑھاتا لاپرواہی سے بولا۔

”کتنی بار کہوں تم سے کہ مت انتظار کیا کرو میرا۔ مت بنایا کرو کوئی چیز میرے لئے۔ مگر تم نہ جانے کب سمجھو گی۔“

”میں آپ کی بیوی ہوں عون!“

اس کے بیڈ روم کی طرف اٹھتے قدموں کو دھندلائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے قدرے گھٹے گھٹے انداز میں اس نے کہا تھا۔ جب وہ فوراً پلٹ کر ایک استہزائیہ نظر اس کے بکھرے سراپے پر ڈالتے ہوئے حیرانگی سے بولا۔

”تمہیں اب بھی یہ گمان ہے کہ تم میری بیوی ہو؟“

کتنی گہری چوٹ کی تھی اس نے کہ وہ بلبلا کر رہ گئی تھی۔ پچھلے تین سال سے جو ”کردار“ وہ نبھا رہی تھی، اس کے جواب میں جو ”حق“ اسے مل رہا تھا، وہ ایک بیوی کا تو ہرگز نہیں تھا۔ عون احمر جعفری کے عشق میں وہ دیوانگی کی حدوں سے نکل کر جنونیت کے دائرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اپنا آپ مٹا کر اس پر قربان ہو گئی تھی۔ ”میں“ سے نکل کر ”تم“ ہو گئی تھی۔ وہ جو اپنے

لئے چائے بھی ملازمین سے بنوا کر پیتی تھی، پچھلے تین سال سے خود کسی ملازمہ کی طرح اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھی، صرف اس کی محبت اور دل

کے حصول کے لئے کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی وہ۔ مگر پھر بھی عون نے اسے اس کے ”حق“ سے نہیں نوازا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر تا حال دانیہ خان کا قبضہ تھا۔ اسی کے ساتھ آفس میں بریک فاسٹ کرنا، دوپہر میں لنچ اور شام میں ڈنر کرنا، دل کی ہر بات، ہر مسئلہ اسی کے ساتھ شیئر کرنا، اسی کی تعریف میں رطب اللسان رہنا، اسی کے لئے شاپنگ کرنا، غرضیکہ اس کی شب و روز کی ہر مصروفیت کا محور دانیہ خان کی ذات بن کر رہ گئی تھی۔

پچھلے تین سال میں اس نے ایک مرتبہ بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ جس عورت نے اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے، اس کی اب کیا فیملنگز ہیں۔ وہ کیا سوچتی ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ اسے کس چیز کی ضرورت ہے؟ وہ ٹائم پر کھانا بھی کھاتی ہے یا نہیں؟ اسے سکون سے نیند بھی آتی ہے یا نہیں؟ کبھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اس نے۔

آسان لفظوں میں اس نے جیسے ”قید تنہائی“ دے رکھی تھی۔

پچھلے تین سال سے کیا دے رہا تھا وہ اُسے؟۔۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ذرا سی خوشی بھی نہیں۔ اپنی شادی کی ویڈنگ اینورسری کا دن بھی وہ دانیہ خان کی قربت میں بسر کرتا تھا۔ مگر جانے ضبط کی کس مسند پر بیٹھی ہوئی تھی وہ کہ ہارنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

ہر روز معمول کی مانند صبح سویرے جاگ کر واش روم میں عون کے پریس شدہ کپڑے رکھنا، اس کے بوٹ پالش کر کے رکھنا، اس کا بریف کیس تیار کرنا، پرفیوم، ٹائی، برش سنگھار میز پر نکال کر رکھنا، مختلف مریضوں کی پیچیدہ بیماریوں سے متعلق ضروری رپورٹس اور فائلز سنبھال کر رکھنا، ہر روز اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ تیار کرنا اور ہر روز ہی اس کا پنا ناشتہ کتنے گھر سے نکل جانا، لنچ اور ڈنر کے لئے بھی اس کا لاحقہ انتظار کرنا گو لمحہ بہ لمحہ اُسے تھکا رہا تھا۔ اندر سے دیمک کی مانند کھاتے ہوئے کھوکھلا کر رہا تھا۔ مگر وہ پنا آنسو بہاتے پوری تندہی کے ساتھ اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف تھی۔



میران شاہ اور رحمن صاحب پچھلے دو سال سے پاکستان چھوڑ کر دوحہ جا بسے تھے۔ عون احمر جعفری شکاگو آکر اپنی مصروفیات میں اس قدر گم ہو کر رہ گیا تھا کہ اسے پیچھے رہ جانے والوں کی کوئی فکر ہی نہیں رہی تھی۔ مگر وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی، ختم ہو رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں پیار سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ محبت میں وہ طاقت ہے کہ بڑے سے بڑے سورما بھی پگھل کر موم ہو جائے۔ مگر عون احمر جعفری اس کے بے تحاشا پیار پر بھی موم نہیں ہوا تھا۔

”آج میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں عون!“ ہمیشہ کی طرح اپنی عزت نفس کو کچل کر آنسوؤں کے گولے کو حلق میں انڈیتے ہوئے وہ اس کے پیچھے ہی روم میں چلی آئی تھی۔ جواب میں وارڈروب کی طرف بڑھتے عون نے پیچھے پلٹ کر قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم پاکستان کب واپس چلیں گے؟“

عون کی خاموش استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

”آئی ڈونٹ نو۔ دانیہ کی خواہش ہے کہ اس سے شادی کے بعد میں یہیں سیٹل ہو جاؤں۔ ہاں البتہ تم پاکستان جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں بھجوا دیتا ہوں۔“

اس کے دل کو زخم زخم کر کے وہ کس قدر اطمینان کا مظاہرہ کر رہا تھا، تب ہی وہ آگے بڑھ آئی۔

”آپ۔۔۔۔۔ میرے ساتھ پاکستان واپس چلیں گے۔ کبھی کوئی دانیہ نہیں آئے گی ہمارے بیچ۔ سنا آپ نے؟“ اب کے اس کے لہجے کی کرخنگی پر وہ واقعی شکاڈ رہ گیا تھا۔ تب ہی تو گردن گھما کر کس قدر حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں اب گلابیوں کی جگہ زردیاں بکھر کر رہ گئی تھیں۔

”کس مٹی کے بنے ہیں آپ۔۔۔۔۔ کہ آپ پر میرے آنسو، میرا صبر، میری وفا کچھ بھی اثر نہیں کر رہا؟ مانا کہ میں نے غلط قدم اٹھایا ہے، اپنی ہی منہ زور خواہشات کے ریلے میں بہہ کر اپنے اصل سے بھٹک گئی ہوں میں۔ لیکن اس کی اتنی کڑی سزا تو نہیں دیں عون! صرف ایک آپ کی محبت پانے کے لئے میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئی ہوں۔ ایک محض آپ کو پانے کی چاہ میں اپنے پیچھے کتنی پُر خلوص محبتوں کے دروازے بند کر آئی ہوں میں۔ آپ

کا دیا ہر دکھ اٹھا کر بھی کبھی اُف تک نہیں کیا میں نے۔ ہر پل، ہر لمحے آپ کو سوچا ہے۔ آپ کو چاہا ہے عون! آپ کے تصور سے پیار کیا ہے۔ مگر پھر بھی آپ کے لئے قابل توجہ نہ بن سکی۔ کیوں عون؟۔۔۔۔۔ لوگ اپنے گھر میں کسی جانور کو پالیں تو اس سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ پھر میں تو ایک انسان ہوں۔۔۔۔۔ اپنی بیوی نہ سہی، ایک انسان سمجھ کر ہی مجھ پر نگاہ ڈال لیجئے۔ اپنے دل میں نہ سہی، اپنے قدموں میں ہی تھوڑی سی جگہ دیجئے پلیز!“

آج اس نے اپنی خود داری، اپنی عزت نفس، اپنا وقار سب اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ عون احمر جعفری کی غلافی آنکھوں میں تا حال حیرانی بچکولے لے رہی تھی۔

”لگتا ہے، تم آج اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

اس کے زرد چہرے سے نگاہیں ہٹا کر رخ پھیرتے ہوئے اس نے کہا، جب وہ سرعت سے اس کے مقابل آ کر بولی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ نہیں ہوں میں اپنے حواس میں۔ کیونکہ میرے حواس پچھلے تین سالوں کے دوران سُن ہو چکے ہیں عون! تھک گئی ہوں میں تمہارے واپس

پلٹنے کا انتظار کرتے کرتے۔ کب سزا ختم کرو گے میری؟ کب میری طرف آؤ گے عون؟“ درد چھلکاتی نگاہیں عجیب پیاسے انداز میں اس کے چہرے پر دوڑاتے ہوئے اس نے عون کا بازو تھاما، جب وہ اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔

”اس خوش فہمی میں جینا چھوڑ دو یمنی رحمن! کہ میں کبھی پلٹ کر تمہاری طرف واپس آؤں گا۔ یہ سزا جو آج تمہاری سانسوں کو اُلجھا رہی ہے، یہ سزا میں نے تمہیں نہیں دی بلکہ تم نے خود اسے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ خود چنا ہے یہ راستہ تم نے۔ پھر اب روح لہو لہان ہو رہی ہے تو گلہ کیسا؟ مس یمنی رحمن! میں نے تو سب کچھ واضح کر دیا تھا آپ پر۔ کچھ بھی نہیں چھپایا تھا آپ سے۔ مگر پھر بھی آپ نے مجھے پانے کی ضد کی۔ میرے دل کے بجائے جسم کو حاصل کرنا آخری خواہش بن گیا تھا آپ کی۔ پھر آپ مجھے الزام کیوں دے رہی ہیں؟ جب مجھے آپ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تو آپ خواہ میرے لئے کچھ بھی کریں، آئی ڈونٹ کیئر۔ اب پلیز جاؤ یہاں سے۔ میں آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہوں۔“

قطعی روڈ لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ جبکہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے بکھرے وجود کی کرچیاں سمیٹتی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

محبت کب سمجھتی ہے

محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی دشتِ وحشت ہے

جو خوابوں میں بسی آنکھوں کو، جانے کب کہاں جھنجھوڑ ڈالے گا

محبت کب سمجھتی ہے کہ ان شفاف رستوں سے

کوئی دکھ درد کی جانب اسے نہ موڑ ڈالے گا

محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی توڑ ڈالے گا

بیڈ کی پیٹی سے ٹکرانے کے باعث یمنی رحمن کی پیشانی بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ لمحوں میں اس کا چہرہ خون سے بھیگ چکا تھا۔ مگر اس وقت اسے اپنے دل کی تکلیف، اپنے چہرے کی تکلیف سے بڑھ کر محسوس ہو رہی تھی۔ قطعی لٹے پٹے نڈھال سراپے کو بمشکل گھسیٹتی وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی، جہاں اس کا اپنا ہی عکس آئینے سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

میک اپ سے لتھڑا چہرہ، ترشی ہوئی بھنویں، لپ لائٹر اور لپ اسٹک سے سجے ہونٹ، ترشے ہوئے شولڈر کٹ بال، سیلولیس عریاں بازو، ٹائٹ شرٹ، ٹراؤزر، دوپٹے کی حرمت سے بے نیاز وجود، بڑھے ہوئے لمبے ناخنوں پر لگی کیوٹکس۔ یہ یمنی رحمان تو نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور لڑکی تھی۔ عشق میں نڈھال کوئی دیوانی لڑکی، جس نے محض ایک انسان کی محبت میں اپنا آپ بھلا ڈالا تھا۔

سُن اعصاب کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی وہ ٹکر ٹکر اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ لکپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو بے ساختہ چہرے پر پھیرتے ہوئے ہراساں ہو رہی تھی۔ فقط چند ہی سالوں میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی وہ۔۔۔۔۔ ایک دم ہی اسے یوں محسوس ہوا، گویا آئینے سے اس کا عکس نکل کر اس پر ہنس رہا ہو۔ اس سے پوچھ رہا ہو۔

”اب کہو یمنی رحمن! یکطرفہ محبت کے اس جنونی کھیل میں تم نے کیا پایا؟“

اور جواب میں وہ اپنے سراپے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ کس قدر نا آشنا تھی وہ محبت کے حقیقی مفہوم سے۔ قطعی مدہوشی کے عالم میں صرف ایک سراب کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی رہی۔ صرف ایک بار ملنے والی زندگی کے انمول دن

ضائع کرتی رہی۔ محض اپنی خواہش، اپنی ضد، اپنے جنون سے اس دل میں زبردستی گھسنے کی کوشش کرتی رہی کہ جہاں پہلے ہی کسی اور کا قیام تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی اپنے کسی معاملے میں کمپروماز نہیں کیا تھا۔ مگر یہاں زندگی کے اس موڑ پر وہ اپنے دل سے ہار گئی تھی۔ اندھی محبت کی بھینٹ چڑھ کر غلط

راہ گزر پر بھٹک گئی تھی۔

محبت تو وہ تھی، جسے وہ سکتے ہوئے پاکستان میں اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ پیشانی سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ مگر وہ دل کے خون پر سکتے ہوئے بلک ہی تھی۔ پورے کمرے کا سامان اس نے تہس نہس کر دیا تھا۔ اپنی شادی کی تمام تصاویر، مووی، شادی کے ملبوسات، عون احمر جعفری سے جڑا اپنا ہر احساس وہ وہیں کمرے میں آگ کی نذر کر چکی تھی۔

زندگی میں غالباً آخری بار وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اپنی شکست کا ماتم منا رہی تھی۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ چاہے کچھ بھی

کرے، عون احمر جعفری پلٹ کر اس کی طرف نہیں آئے گا۔ اسی احساس کے زیر اثر اس نے ہسٹریکل ہو کر آئینہ پاش پاش کر ڈالا تھا۔ مگر اس کا اپنا ہی عکس برہنہ ہو کر اب بھی اس پر نہیں رہا تھا۔ ہنسی کی اس بازگشت میں اب میران شاہ کے قہقہے بھی شامل ہو گئے تھے۔ تب بے ساختہ اس نے دوپٹے کی تلاش میں اپنی نگاہیں ادھر ادھر دوڑائی تھیں مگر وہاں عون احمر جعفری کے بیڈ روم میں اس کا آنچل کہیں نہیں تھا۔ زخمی، متوحش نگاہیں تھک کر ناکام واپس پلٹ آئی تھیں۔

برسوں پہلے اس نے میران شاہ سے کہا تھا۔

”میں اسے کھو کر نہیں جی سکتی مانی! مر جاؤں گی میں اس کے بغیر۔۔۔۔۔“

لیکن آج وہ بظاہر اس کے ساتھ ہو کر بھی اسے ہمیشہ کے لئے کھو چکی تھی اور پھر بھی زندہ تھی۔

روح برہنہ ہو رہی تھی، نازک پاؤں جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے لمحوں میں آبلہ پائی کا درد سمیٹ لائے تھے۔ مدہوشی کا خول جیسے ٹوٹ چکا تھا۔



آنکھوں پر بندھی محبت کی اندھی پٹی اُتر چکی تھی۔ اب اسے سب کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

آج اسے یہ احساس تڑپا رہا تھا کہ وہ محض ایک انسان کے عشق میں مدہوش ہو کر گمراہ ہو گئی تھی۔ مگر صلے میں اسے سوائے آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ جتنی شدت سے اس نے عون احمر جعفری کو چاہا تھا، اگر اتنی ہی شدت سے وہ اپنے پاک پروردگار سے محبت کرتی تو کیا وہ اسے ٹھکرا دیتا؟

جس انسان کی رضا اور محبت کے لئے وہ اپنے اصل سے بھٹک گئی تھی، جس کے حصول کے لئے اس نے خدا کے احکامات کو یکسر فراموش کر دیا تھا، آج اسی انسان کی محبت میں وہ اوندھے منہ زمین پر آگری تھی۔ روح کے ساتھ ساتھ سارا جسم تمھکن سے چور ہو رہا تھا۔ محبت کے حقیقی مفہوم سے قطعی نا آشنا وہ اندھا دھند جس راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی، اس راستے کی منزل کیا تھی؟۔۔۔۔۔ محض تمھکن؟

لہو لہو احساس اور برہنہ روح کے ساتھ سسکتے ہوئے وہ نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کا عکس اب بھی اس پر طنز کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب میں توڑ پھوڑ مچا رہا تھا۔

’اب کہو یمنی رحمن!۔۔۔۔۔ اس ”لاحاصل محبت“ کے سودے میں کیا حاصل کیا تم نے؟ عشق کے اس خاردار راستے پر ننگے پاؤں چل کر بھی کیا فتح کر لیا تم نے؟۔۔۔۔۔ کیا تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتی ہو کہ محبت خدا کی دین ہے، کوئی بھی ذی روح اسے زبردستی اپنی میراث نہیں بنا سکتا۔ حسین سے حسین تر چہرے رُل کر رہ جاتے ہیں۔ آنکھوں میں حُسن نہ ہو تو چہرے کی خوب صورتی یا دلکش سراپا کیا معنی رکھتا ہے۔ تم نے اپنے حُسن اور ضد کی بنا پر عون احمر جعفری کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا نا۔ دیکھ لو، تم اپنے تکبر میں خود منہ کے بل آگریں۔ خیر کے بجائے شر کو پا لیا تم نے۔ کبھی خدا کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، اس سے اپنی بھلائی نہیں مانگی۔ اس نے تمہارے لئے خیر لکھا تھا، مگر تم خود اس کی قائم کردہ حدود سے نکل کر جلتے ہوئے شعلوں کو ہاتھ

میں لے بیٹھیں۔ اپنے نصیب کے لکھے پر صبر نہیں کیا تم نے۔ پھر اب یہ آنسو کیوں یمنیٰ رحمٰن؟۔۔۔۔۔ اب یہ تھکن کا احساس کیوں؟

بکھرے اعصاب اور ٹڈھال سراپے کے ساتھ وہ زمین پر بیٹھی ہچکیاں لے رہی تھی اور اس کا ضمیر اس سے کہہ رہا تھا۔

’تم اب بھی محض ایک انسان کی محبت نہ پانے کے دکھ میں ٹڈھال ہو یمنیٰ رحمٰن! کیا تمہیں یہ احساس تکلیف نہیں پہنچاتا کہ جس بزرگ و برتر نے تمہیں اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصطفیٰ

کی اُمت میں پیدا فرما کر تم پر احسانِ عظیم فرمایا، تم برسوں اسی کے وجود سے غافل رہیں۔ کیا اس کے پیدا کردہ ایک عام سے انسان کی محبت تمہیں دنیا و آخرت میں سرخروئی سے ہمکنار کر سکتی ہے؟ کیا اس شخص کا پیار تمہیں قبر کے عذابوں سے نجات دلا سکتا ہے؟ کیا اس کا ساتھ تمہیں پل صراط کی مشکل سے گزار سکتا ہے؟۔۔۔۔۔ نہیں یمنیٰ رحمٰن! جس شخص کی چاہ میں تم اپنا آپ بھلا بیٹھی ہو، اس کا پیار، اس کی محبت، اس کا ساتھ تمہارے کسی کام

نہیں آ سکتا۔ ہر انسان کو اگر کوئی چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے، جو قدم قدم پر روشنی بن کر اسے دنیا و آخرت میں سرخرو کرے گی۔

خدا کی تخلیق کردہ اس دنیا میں ہزاروں کم صورت انسان، چاہے جانے کی حسرت لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے، مگر ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ حُسن وہ نہیں جو ظاہری طور پر دکھائی دے۔ حقیقی حُسن وہ ہے جو اپنے محبوب کے لئے آنکھوں میں چھپ کر رہے۔ عون کی آنکھوں میں بھی دانیہ خان کا حُسن ہے یمنیٰ! تم چاہے کچھ بھی کر لو، اسے حسین دکھائی نہیں دے سکتیں۔ محبت تو اللہ کی دین ہے۔ وہ جب جسے چاہے سرخرو کر دے۔ اور جسے چاہے بھٹکا کر پستیوں میں گرا دے۔‘

اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں ساکت بیٹھی، وہ گویا ایک عکس کی مانند تحلیل ہو رہی تھی۔

آج ضمیر اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ دل کی گرفت سے چھڑا کر نفع و نقصان کے کٹہرے میں کھڑا کر رہا تھا۔ زندگی میں آگہی کا دکھ سب سے زیادہ تکلیف دہ

ہوتا ہے۔ انسان جب تک بے خبر رہتا ہے، خوش اور مطمئن رہتا ہے۔ مگر جیسے ہی اس پر حقیقتوں کے دروا ہوتے ہیں، وہ جیسے ہی اپنے اصل سے آگاہی حاصل کرتا ہے، بکھر کر رہ جاتا ہے۔ طبیعت میں اضطراب در آتا ہے۔ اسے رہ رہ کر اپنا ہر عمل تکلیف سے دوچار کرتا ہے۔ یمنی رحمن بھی اس وقت اسی تکلیف کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

پچھلے کتنے سالوں سے وہ تڑپ تڑپ کر عون احمر جعفری سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ مگر عون احمر جعفری نے اس کی صدا پر کان نہیں دھرے تھے۔ وہ ہر لمحے اسے دھتکارتا رہا تھا۔ جب کہ یہ بات وہ اگر اپنے اللہ سے کہتی تو کیا وہ اس کی پکار نہیں سنتا؟ اسے دھتکار دیتا؟

بات سوچنے کی تھی۔ مگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو وہ کھو چکی تھی۔ بمشکل اپنے وجود کو گھسیٹتی واش روم تک چلی آئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے تازہ پانی سے پیشانی کا زخم دھو کر وضو کیا تو ایک عجیب سا سرور روح میں اُتر آیا۔ جائے نماز پر نیت باندھ کر کھڑی ہوئی تو جانے کب سے جمع کئے ہوئے آنسو پھر سے رواں ہو گئے تھے۔

وہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کی ممانے اسے نماز سکھائی تھی۔ اب تو اسے نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

بہت زیادہ زیاں کر چکی تھی وہ اپنا۔۔۔۔۔ ایک انسان، ایک حقیر انسان جسے محض ”علم“ کی بدولت تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی، جب وہ انسان اسی ”علم“ سے لا تعلق ہو تو کیسی برتری، کیسی بڑائی؟۔۔۔۔۔ اس وقت یمنی رحمن کو اپنا وجود بھی گمندی میں لتھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ فیشن کرتے ہوئے، ٹی وی سے دل بہلاتے ہوئے، میوزک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اپنے اللہ سے، اس کے احکامات سے کتنی دور ہو رہی ہے۔

کسی بھی انسان سے محبت، محض رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں دیتی۔ جب کہ اللہ کی پاک و بے نیاز ذات سے محبت، اس کے بندے کو دنیا و آخرت میں سرخرو کر دیتی ہے۔ وہ خود سے محبت کرنے والے کو کبھی بے آسرا نہیں کرتا، مایوس نہیں لوٹاتا۔ کبھی غلط راستے پر بھٹکنے نہیں دیتا۔ اس کی دعا رد نہیں کرتا۔ تو پھر کیوں انسان، عشق مجازی کی گمراہی میں بھٹکتا رہے؟

اس روز اس نے جائے نماز پر بیٹھ کر خدا کے حضور گڑ گڑاتے ہوئے بہت دیر تک توبہ استغفار کی تھی۔ دل کا ہر درد جیسے آنسوؤں میں بہہ کر دامنِ دل کو خالی کر چکا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں پر نہایت عاجزی سے یہی دعا جاری و ساری تھی۔

”اے اللہ! اے میرے مالک! اے کل جہانوں کے پالنے والے! اے سب کی حاجتیں پوری فرمانے والے! اے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے والے! میں گنہگار، تیری عاجز بندی خالی ذہن، خالی ہاتھ، خالی دامن لئے تیرے حضور اپنے دل کی راحت کے لئے حاضر ہوں۔ میرے مالک! اپنی رحمت کے صدقے میرے گناہوں کو بخش دے۔ اے اللہ! بے شک تُو بے حساب نوازنے والا ہے۔ تیرے رحم و کرم کی کوئی حد نہیں۔ اپنی اسی رحمت کے صدقے، مجھے اپنے قرب سے سرفراز فرما۔ مستقل صبر کی دولت سے مالا مال فرما دے میرے مالک! وہ ایک شخص جو میرا نہیں ہے، تُو اپنی رحمت کے صدقے اسے میرا بنا دے۔ پروردگار! اگر وہ میرا نہیں ہو سکتا تو میرے دل کو اس سے پھیر دے۔ اے اللہ! مجھے آسانیوں سے ہمکنار فرما۔ در بدر بھٹکنے سے بچا

لے۔ گمراہ ہونے سے بچا لے۔ میرے پاپا کو، میران کو صبر و سکون کی دولت عطا فرما میرے مالک! میرے دُکھوں کا ازالہ کر دے۔“

با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے، دعا میں دونوں ہاتھ اٹھائے وہ اپنے اللہ سے اپنے دل کا حال کہہ رہی تھی۔ جواب میں اس کا تڑپتا، مچلتا دل جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اعصاب لمحوں میں پُرسکون ہو چکے تھے۔

☆...☆...☆

ایک ہفتے کے بعد عون احمر جعفری کی واپسی ہوئی تو اس کا سامنا ایک یکسر بدلی ہوئی یمنی رحمن سے ہوا تھا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، سر کو دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپے شفاف چہرے پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے وہ کہیں سے بھی پہلے والی یمنی رحمن دکھائی نہیں دے ہی تھی۔ وہ محض چونکا نہیں تھا۔ شاکد رہ گیا تھا۔ کہاں تو اُس کی اس قدر دیوانگی کہ رات میں ذرا سا لیٹ ہو جانے پر طوفان اُٹھا دیتی تھی۔ اور کہاں اب اُس کے اتنے دنوں کی جدائی پر اُن تک نہیں کی تھی۔ فارمل لہجے میں اس کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ نمازِ عصر کے لئے اُٹھ گئی تھی۔



اگلے پندرہ بیس دنوں میں بھی اس کا یہی معمول رہا تھا۔ اس کی شاندار پرسنالٹی کو یکسر نظر انداز کئے وہ اپنے ہی حال میں مست ہو کر رہ گئی تھی۔ گو اب بھی اس نے اپنے فرائض سے منہ نہیں موڑا تھا۔ ہر طرح سے اس کے ہر حکم کی تعمیل بجا لا رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ سر سے پیر تک بدل گئی تھی۔ اب اس نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا دھونا، گلہ شکوہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رات میں کسی ایمر جنسی کی وجہ سے اُسے دیر ہو جاتی تو وہ اسے آرام سے اپنے کمرے میں مقید ملتی تھی۔ کہیں کوئی اضطراب، کوئی تڑپ اس کی آنکھوں میں نہیں ہوتا تھا۔

دانیہ خان پر آج کل اس کے گھر والوں کی طرف سے شادی کے لئے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس سے شادی سے قبل عون، یمنی، رحمن کا فیصلہ کر دے۔ ان دونوں میں سے ایک کو ہم سفر رکھ لے۔ اور عون نے اس کی خواہش پر بنا ایک پل بھی سوچے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔ اس نے دانیہ خان کو یہ یقین تھما دیا تھا کہ وہ بہت جلد یمنی، رحمن سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔

آج کل وہ اسی کشمکش کا شکار تھا کہ کیسے یمنی سے علیحدگی کے موضوع پر بات کرے۔ اس نے تو جیسے نظروں کے حصار میں ایک منٹ سے زیادہ نہ رہنے کی قسم کھالی تھی۔ پہلے جو اس سے بات کرنے کے بہانے تلاشتی تھی، اب اس کے پکارنے پر بھی مشکل سے کوئی بات سننے پر تیار ہوتی تھی۔ بہت زیادہ بدل گئی تھی وہ۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف آ کر بہت زیادہ مپھور ہو گئی تھی۔ اُس روز نائٹ ڈیوٹی نہ ہونے کے باعث وہ ہسپتال سے جلد گھر چلا آیا تھا۔ تب ہی مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر سلیقے سے جائے نماز سمیٹتی وہ اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔“

بہت دنوں بعد اسے خود سے مخاطب ہوتے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا تھا۔ تبھی اس کے سامنے صوفے پر ٹکٹے ہوئے متانت سے بولا۔

”بات تو مجھے بھی بہت ضروری کرنی تھی تم سے۔ بہر حال تم کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں۔۔۔۔۔ پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔“

نظریں جھکا کر بہت دھیمے لہجے میں اس نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ جب وہ کچھ لمحوں کے لئے حیرانی سے اس کی طرف تکتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”ایزیو وِش۔ میں نے کبھی تمہارے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا۔ لیکن جانے سے پہلے، پلیز مجھ پر ایک احسان کرتی جاؤ۔“

”فرمائیے۔“ اس کے چہرے پر عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ لگ بھگ ایسا ہی ٹھہراؤ اس کی آنکھوں اور لبے میں بھی تھا۔

”میں دانیہ کو اپنا نا چاہتا ہوں یمنی! لہذا جانے سے پہلے پلیز ڈائورس پیپرز پر  
سائن ضرور کرتی جانا۔“

دھڑ، دھڑ دھڑ۔۔۔۔۔ ساتوں آسمان ایک ساتھ اس کے سر پر آگرے  
تھے۔ سماعتیں لمحوں میں بے جان ہوئی تھیں۔ رخسار جیسے تپ اُٹھے تھے۔ بہت  
ضبط کے باوجود بھی آنکھیں آنسو چھلکانے سے باز نہیں رہیں۔

## اتنے سالوں کی کڑی مسافت کا صلہ۔

”او کے“

جانے کس ضبط کے عالم میں کہنے کے ساتھ ہی وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عون احمر جعفری نے بہت غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، جہاں کرب کی اُبھری داستان، ان بھیگتی آنکھوں میں بخوبی پڑھی جاسکتی تھی۔ تبھی شاید وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھا، پلکیں موندے نہ جانے کیا سوچتا رہا تھا۔

☆ . . . ☆ . . . ☆

میران شاہ اور رحمن صاحب پاکستان واپس پلٹ آئے تھے۔ آج کل وہ پاکستان جانے کی تیاریوں میں مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ عون احمر جعفری نے ڈائورس پیپرز تیار کروائے تھے۔ ان کے مابین قائم تین سالہ رفاقت کا بندھن ٹوٹنے کے لئے محض چند جگہوں پر ان دونوں کے سائن کا محتاج تھا۔

زندگی یعنی رحمن کے اندر جیسے تھکنے لگی تھی۔

اس نے بہت خاموشی کے ساتھ محض چند لمحوں تک بھرائی آنکھوں سے چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے کے بعد، کپکپاتی انگلیوں میں پین تھام کر، بنا کوئی شکوہ، گلہ کئے مطلوبہ جگہوں پر تیزی کے ساتھ اپنے سائن کر دیئے تھے۔

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے

جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی

آج وہ نکلت آسودہ لٹا دی ہم نے

آج اس نے خود اپنے آپ کو، ڈائورس پیپرز کے ان کاغذوں میں دفن کر کے ہمیشہ کے لئے اپنی روح عون احمر جعفری کے سپرد کر دی تھی۔ ”محبت محبت ڈاٹ کام“ کے اس کھیل میں بالآخر شکست اس کا مقدر بن گئی تھی۔ جس محاذ پر نہ فتح کا امکان ہو، نہ ہار کی توقع وہاں انسان اندر سے تھک جاتا ہے۔ وہ بھی تھک گئی تھی۔ زبردستی اور یکطرفہ محبت کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کی لگن میں خود ٹوٹ گئی تھی۔ دل درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ مگر زندگی میں پہلی بار اس نے دل کے درد پر توجہ نہیں دی تھی۔ ضبط کا پہاڑ بنی، سرخ آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کے سمندر کو پیتے ہوئے وہ اس کے سامنے اعتماد سے کھڑی

تھی۔ جو اس کے سائن کئے ہوئے ڈائورس پیپرز کو ہاتھ میں لے کر کافی دیر تک سگنیچرز کو غور سے دیکھتا رہا۔

ضبط کی آخری سیڑھی پر کھڑی وہ دھان پان سی لڑکی اتنی آسانی سے اس کی محبت سے دستبردار ہو کر اسے مزید شاکڈ کر گئی تھی۔ بہت گہری نگاہوں سے کچھ پل بغور اس کی طرف دیکھنے کے بعد، وہ پیپرز کو مٹھی میں دبائے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ یمنی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی بربادی پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ یہ اعتراف کرے کہ دنیا میں محبت سے سب کچھ جیتا جاسکتا ہے۔ مگر کسی بے حس شخص کا دل نہیں۔ آج اسے خود اپنے آپ سے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ آج حقیقی معنوں میں اسے میران شاہ کا سامنا کرنے کے تصور سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ آج وہ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے دیس واپس جا رہی تھی۔ سلگتی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے قافلے کو روکنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔ تاہم اس

سے پہلے کہ پاکستان کے لئے فلاحی کرتی، عون احمر جعفری کے روڈ ایکسیڈنٹ کی خبر نے اس کا دل جیسے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔

گو وہ اس سے ہر نامتا توڑ کر نئے سفر پر گامزن ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے لئے تڑپ کر رہ گئی تھی۔ تبھی بد حواسی کے عالم میں مطلوبہ ہسپتال پہنچی تھی۔ مگر وہاں عون احمر جعفری کے قریب دانیہ خان کو دیکھ کر انہی قدموں پر واپس لوٹ آئی۔

مگر خدا کے حضور عون احمر جعفری کی لمبی عمر اور مکمل صحت مندی کی دعائیں ضرور مانگی تھیں۔

خدا کے حضور نہایت عاجزی سے گڑ گڑاتے ہوئے وہ عون احمر جعفری کا ہر ستم بھلا چکی تھی۔ جب کہ دوسری طرف دانیہ خان، جو عون کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی، وہ ڈاکٹرز سے اس کے سر پر لگنے والی گہری چوٹ کے متعلق سن کر از حد متفکر ہو گئی تھی۔ دل کے کسی کونے میں تھوڑی سی آس باقی تھی کہ شاید عون آنکھوں پر بندھی پٹی کے اُترنے کے بعد دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مگر اُس کی آس کا یہ چراغ بھی اس وقت گل ہو گیا، جب پٹی کھلنے

کے بعد عون نے اسے بتایا کہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں پا رہا ہے۔ تب بہت مجبور ہو کر، ٹپا ٹپ آنسو بہاتے ہوئے وہ سامنے پڑی اپنی اس ”اندھی محبت“ سے دامن چھڑانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ گو اس کا پیار مطلبی نہیں تھا۔ وہ واقعی عون احمر جعفری کے ساتھ اپنی زندگی بتانے کی خواہش مند تھی۔ مگر اس عون احمر جعفری کے ساتھ، جو مکمل صحت مند تھا۔ ایک اندھے شخص کا ہاتھ تھام کر محض محبت کے سہارے وہ اپنی پوری زندگی کو بے رنگ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”مجھے غلط مت سمجھنا عون! تمہارے ساتھ ہونے والے اس الم ناک سانحے کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر۔۔۔۔۔ کاش مشکل کے اس وقت میں، میں تمہارا ساتھ نبھا سکتی۔ میں نے واقعی تم سے محبت کی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ میں بہت مجبور ہوں۔ عون! پہلے کی بات اور تھی۔ مگر اب۔۔۔۔۔ اب میرے گھر والے کبھی ہمارے رشتے کے لئے نہیں مانیں گے۔ وہ ہرگز مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ میں ایک نابینا شخص سے شادی کروں۔ اس لئے ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔ سمجھ لینا کہ میں تمہارے مقدر میں ہی نہیں



تھی۔ وگرنہ تمہیں ضرور مل جاتی۔ یہ بھی شاید اللہ کا کرم ہی ہے کہ ہماری شادی سے پہلے ہی یہ حادثہ ہو گیا۔ وگرنہ بعد میں پتہ نہیں کتنی مشکلات پیش آتیں۔ بہر حال شاید اب زندگی میں دوبارہ ہم کبھی نہ ملیں۔ اس لئے ہو سکے تو اپنے دل کی کتاب سے میری محبت کا ورق پھاڑ دینا عون! پلیز۔“

عون اس کے بھاری لہجے میں آنسوؤں کی نمی محسوس کر سکتا تھا۔ تبھی شاید اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا چپ چاپ پلکیں موندے گھرے کرب کے احساس کو دل پر گزرتے ہوئے محسوس کرتا رہا تھا۔ آج اس نے اندھے ہو کر اپنی ٹولی لنگڑی، مجبور محبت کی گہرائی کو جانچا تھا۔ کیا واقعی محبت ”مجبور“ ہوتی ہے؟ بہت دیر تک وہ اس سوال میں الجھا رہا تھا۔

دانیہ خان وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ مگر اسے دیر تک، اپنے مان کے ٹوٹنے کے غم کو محسوس کرتے رہنا تھا۔ یہ لفظ جو ابھی دانیہ خان کی زبان سے ادا ہوئے تھے، یہ لفظ تو وہ یمنی رحمن کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ اس یمنی رحمن کی زبان سے جو پچھلے تین چار برسوں سے کرب کے گھونٹ پیتی ہی تھی۔ اس کی طرف سے ہونے والے ہر ظلم، ہر زیادتی کو چپ چاپ سہہ کر

اس سے دیوانہ وار محبت کرتی رہی تھی۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی رہی تھی۔ یلخت ہی اس کی آنسوؤں سے بھیگی سرخ نگاہیں، تصور میں آئیں تو وہ پہلو بدل گیا۔

’نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں نہیں سوچوں گا یمنی رحمان! پچھلے تین سالوں میں تم میرے مقام سے بہت اوپر چلی گئی ہو۔ اب یہی سزا ہے میری کہ میں زندگی بھر تمہارے قرب کو ترستا رہوں۔ تمہیں گنوا کر بھی تمہاری خوشبو کو محسوس کرتا رہوں۔ ہاں یمنی! اب میں خود تمہیں وہ خوشیاں دوں گا کہ جن پر تمہارا پورا حق ہے۔‘

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس وقت دانیہ خان کے لئے نہیں، یمنی رحمن کے لئے رو رہا تھا۔ اس یمنی رحمان کے لئے کہ جو پچھلے چند دنوں میں اسے اپنی طرف متوجہ کر گئی تھی۔ ابھی وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر تھکے تھکے سے قدم گھسیٹتی اس کے قریب آ بیٹھی۔ آنکھوں پر چشمہ پہننے کے باوجود وہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کا نظارہ بخوبی کر سکتا تھا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں پاکستان جا رہی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔“

انگلیاں چٹختے ہوئے، رُندھے ہوئے لہجے میں بمشکل وہ کہہ پائی تھی۔ جواب میں وہ محض اسے دیکھتا رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ اس وقت آپ کو سہارے کی ضرورت ہے۔ مم۔۔۔۔۔ مگر مجھ سے تو یہ اختیار آپ چھین چکے ہیں۔ دانیہ بتا رہی تھی کہ اب آپ کبھی دیکھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے پلیز آپ بھی میرے ساتھ پاکستان واپس چلئے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں اب پاکستان جانے کے قابل نہیں رہا۔ تم جاؤ یمنی! مجھے تم سے کوئی لگہ نہیں ہے۔“ جان بوجھ کر اس نے اپنا لہجہ رُوڈ کیا تھا۔ مگر یمنی رحمان نے اس کے لہجے کو محسوس نہیں کیا۔

”چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ آج ہی چلی جاؤں گی۔ مگر۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں آپ سے اب بھی پیار کرتی ہوں عون! بہت پیار کرتی ہوں آپ سے۔ مانتی ہوں کہ محبت کے اس کھیل میں ہار میری ہوئی ہے۔ مگر میرا پیار آپ کے لئے کبھی کم نہیں ہو گا۔“

یہ وہ الفاظ تھے جو سننے کی توقع وہ ہرگز نہیں کر رہا تھا، تب ہی حیران رہ گیا تھا۔

”کیوں پیار کرتی ہو مجھ سے، جب میں تم سے پیار نہیں کرتا، تمہاری پروا نہیں کرتا؟ اور اب تو تمہاری کیئر بھی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ کیوں؟“

”پتہ نہیں۔“ اس کے سخت لہجے کے جواب میں وہ پھر آہستہ سے رو پڑی تھی۔ تب ہی عون نے خاموشی سے پلکیں موند کر سر تکیے سے ٹکا دیا تھا۔

”تو آج تم سب کچھ چھوڑ کر پاکستان واپس چلی جاؤ گی؟“

”ہاں۔“

”سب کچھ چھوڑ کر؟“

”ہاں۔“ نظریں بدستور آنسو لٹاتے ہوئے جھکی ہوئی تھیں اور سر اثبات میں ہل رہا تھا۔

”اپنے عون۔۔۔۔۔ کو بھی چھوڑ کر۔۔۔۔۔؟“

اب کے یمنی نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔

”عون احمر جعفری تو میرا کبھی تھا ہی نہیں۔“

”لیکن پھر بھی، اسے تمہاری ضرورت ہے یمنی!“ وہ اب بھی بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں اپنا ہر اختیار کھو چکی ہوں عون! آپ نے خود مجھے خالی ہاتھ کر دیا ہے۔“ اب کے وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ تب ہی شاید عون احمر جعفری کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ پل میں اس کا ارادہ بدلا تھا۔ یمنی رحمان کے آنسو دیکھ کر دل پھر سے اپنی ضد پر اڑ گیا تھا۔ ہمک ہمک کر پوچھ رہا تھا۔

”کیا تم یمنی رحمان کو کھو کر خوش رہو گے عون؟۔۔۔۔۔ کیا تم اس کے بغیر اب خوش رہ سکتے ہو؟“ اس کے سوال پر بہت بے دردی سے اپنے لب کھلتے ہوئے اس نے پھر سے یمنی رحمان کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں کھو کر خوش نہیں رہ سکتا یمنی! کیونکہ تم نے مجھے اپنا عادی کر دیا ہے۔ اب اس ڈگر سے ہٹ کر کہاں چلوں میں؟ کوئی راستہ ہی

نہیں رہا۔ کہاں جاؤں اب تمہیں چھوڑ کر؟۔۔۔۔۔ کیسے کہوں کہ میں خود غرض نہیں ہوں؟ مگر۔۔۔۔۔ تمہارے بغیر زندہ رہ کر ہنسی خوشی زندگی بتانا بھی اب ممکن نہیں رہا ہے میرے لئے۔“ خود سے یہ اعتراف کرنے میں صرف ایک پل لگا تھا اسے۔ اور وہ جیسے محض ایک پل میں اس دیوانی سے ہار کر رہ گیا تھا۔

”تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اب معذور ہو گیا ہوں، تمہارے ان بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔“ ایک اور امتحان، ایک اور آزمائش تھی مگر اس کے

ہر پلان سے بے خبر یمنی رحمان نے اب بھی اس کے ہر شک کو باطل ثابت کر دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، یہ محبت اب میرے دل کا مکان خالی کرنے

والی نہیں ہے۔ میری وجہ سے آپ کی زندگی برباد ہوئی، مجھے اس کا بہت دکھ ہے عون! ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا۔“

اس کے گلوگیر لہجے میں وہ سچائی تھی جسے عون احمر جعفری نے دانیہ خان کے پیار میں تلاشنا چاہا تھا۔ مگر بازی اُلٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ تاہم کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس پر مضطرب نہیں تھا۔ دل کے اندر دُور تلک کسی کسک، کسی تڑپ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تب ہی ایک گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں سے بلیک چشمہ اُتار کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

”یمنی! ادھر میری آنکھوں میں دیکھو اور بتاؤ، کیا ان آنکھوں میں دانیہ خان کو کھو دینے کا کوئی درد تمہیں بکھرتا دکھائی دے رہا ہے؟“ گزشتہ چار سالوں میں اس نے پہلی بار یمنی رحمان کا ہاتھ تھاما تھا۔ جواب میں وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ الحمد للہ میں دیکھ سکتا ہوں۔ اور تمہیں یہ ڈائیورس پیپرز بھی دکھا سکتا ہوں کہ جن پر تم نے میرے سائن دیکھے بغیر بڑی تیزی سے

اپنے دستخط کر دیئے تھے۔ بتاؤ اب اس آدھی ادھوری طلاق سے کیا مطلب اخذ کروں میں؟“

ڈائیورس پیپرز نکال کر اسے دکھاتے ہوئے وہ قدرے مسرور لہجے میں بولا تو یمنی رحمان سے خود کو سنبھالنا خاصا دشوار ہو گیا۔ تب ہی عون احمر جعفری نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب بیڈ پر بٹھا لیا۔

”پلیز بے ہوش مت ہو جانا۔ کیونکہ ابھی میں چلنے پھرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ اس نے مختصراً تمام حقیقت یمنی رحمان پر کھول دی کہ کیسے اس کا بدلا ہوا سراپا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر یونہی اپنے لئے دانیہ خان اور اس کے پیار کی سچائی جاننے کی غرض سے ایکسیڈنٹ کے بعد بینائی کھو دینے کا ڈرامہ کیا۔ اسے زیاں کے درد سے بچانے کے لئے نابینا کا خیال محض ایکسیڈنٹ کے بعد اس کے ذہن میں آیا تھا تاکہ وہ دانیہ خان سے اس کی شادی کے بعد اکیلی پاکستان واپس جائے تو درد سے نڈھال نہ ہو۔ کم از کم یہ احساس تو ہمراہ ہو کہ جسے وہ کھو چکی ہے، وہ اب اس کے قابل بھی نہیں رہا۔ مگر سارا کھیل اُلٹا ہو گیا تھا۔ عون کو ڈائیورس پیپرز پر سائن کر کے اسے



اپنی زندگی سے دُور کر دینے کی نوبت ہی درپیش نہیں آئی تھی۔ جس کے لئے یہ سب کھیل رچایا تھا، وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جسے اس نے ہار جانے کے درد سے بچایا تھا، اس نے ایک مرتبہ پھر اس پر اپنا بے لوث پیار ثابت کر دیا تھا۔

”مجھے معاف کر دو یمنی! میں صرف تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتا تھا جو مجھے کھو دینے کے بعد تمہیں محسوس ہوتی۔ میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے جو سلوک میں نے تمہارے ساتھ روا رکھا تھا، اس کے بعد میں اس انعام کا مستحق نہیں تھا کہ تم میرے لئے مزید یہاں ٹھہرتیں، زندگی میں پہلی بار میں تمہیں خود سے دور کر دینے کے احساس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میں دانیہ خان کو حاصل کر کے خوش ہونا چاہ رہا ہوں یا تمہیں اپنی زندگی میں روک کر۔۔۔۔۔۔ پہلی بار میں تم سے دستبردار ہونا نہیں چاہ رہا تھا، یمنی! اور اپنی یہ کیفیت میں خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسی کشمکش میں ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ کروا بیٹھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد میں نے اپنے لئے تمہارے اور دانیہ خان کے پیار کو

جانچنے کا پلان سوچا تھا۔ دل میں تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو میں ان پیپرز پر اپنے سائن کر کے تمہیں اپنی خود ساختہ قید سے رہا کر دوں گا تاکہ تم اس کے بعد اپنی مرضی سے ہنسی خوشی زندگی گزار سکو۔ مگر ایسا نہیں ہوا یمنی! تمہاری دیوانگی پختہ رہی اور میں اپنی لولی لنگڑی محبت سے محروم ہو گیا۔ وہ جو ہر مشکل میں ساتھ نبھانے کی دعویدار تھی، پہلے ہی امتحان میں گھبرا کر ساتھ چھوڑ گئی۔ جانتی ہو کیوں؟۔۔۔۔۔۔ کیونکہ اسے جس عون احمر جعفری سے محبت کا دعویٰ تھا، وہ نابینا نہیں تھا۔ مگر تم نے۔۔۔۔۔۔ تم نے میرے نابینا پن کو بھی اہمیت نہیں دی۔ تم اپنی دیوانگی میں مجھ سے، میری بے نیازیوں سے، میرے اصولوں سے جیت گئیں یمنی! تم نے ثابت کر دیا کہ تمہارا پیار بے لوث ہے۔“

وہ ساکت بیٹھی ٹکڑ ٹکڑ اُس کی روشن نگاہوں کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کا سرد ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبائے پُرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔

”ہم پرسوں ہی پاکستان کے لئے روانہ ہو رہے ہیں یمنی! بابا مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ ابھی کل ہی ان سے میری بات ہوئی ہے۔ ”رحمن کاٹیج“ میں جلد ہی میران اور معطر کی شادی کے شادیاں بنجنے والے ہیں۔ تمہارے بعد معطر نے رحمن انکل اور میران کا بہت خیال رکھا ہے۔ بہت بے لوث خدمت کی ہے ان کی۔ میری طرح میران بھی معطر کی وفا شعاری سے ہار گیا ہے۔“

آخری درد کا کانٹا بھی نکل گیا تھا، تب ہی شاید وہ بے اختیار ہو کر اپنا سر عون احمر جعفری کے مضبوط شانے پر ٹکاتے ہوئے سسک پڑی۔

”آپ نے مجھے بہت دکھ دیا ہے عون! ایک مسیحا ہو کر مجھے پل پل کانٹوں پر گھسیٹا ہے آپ نے۔“ یہ پہلا گلہ تھا جو اس سے شادی کے بعد اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔ تب ہی وہ محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے مدہم لہجے میں بولا۔

”جو ہو گیا، اسے بھول جاؤ یمنی! کیونکہ جو درد میری وجہ سے تمہیں ملے ہیں، اب ان کا ازالہ بھی میں ہی کروں گا۔ مگر یہاں نہیں، پاکستان جا کر۔“

اس کے گمبھیر ذومعنی لہجے پر اودھم مچاتی دل کی بے قرار دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اس نے آہستہ سے پلکیں موند لی تھیں۔ جسم کا ایک ایک عضو اس وقت خدا کی پاک و بے نیاز ذات کا شکر ادا کر رہا تھا، جس نے اپنی رحمت سے بالآخر اس کے دل کا قرار عون احمر جعفری کی محبت کی صورت میں اسے واپس لوٹا دیا تھا۔ یقیناً آنے والے دنوں میں اب خوشیوں کی بہت سی بہاریں شدت سے اس کی منتظر تھیں۔

# ختم شد

پاکستان  
حکومت  
مقام